شری کانت

ناول

طارق اسمٰعیل ساگر

شری کانت

......ناول......

طارق اسمٰعیل ساگر

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز
غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور فون: 7223584

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	....	شری کانت
مصنف	....	طارق اسمٰعیل ساگر
ناشر	....	مسعود مفتی۔یاسر
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سنِ اشاعت	....	ستمبر2006ء
قیمت	....	-/200روپے

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی اشاعت، ترجمہ یا ذرائع ابلاغ کے لیے کسی بھی صورت میں استعمال کی سخت ممانعت ہے کتاب سے متعلق تبصرہ یا حوالہ کے لیے مصنف کی اجازت ضروری ہے۔ بصورت دیگر غیر قانونی حرکت کے مرتکب فرد یا ادارے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے۔

☆......ملنے کا پتہ......☆

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

علم وعرفان پبلشرز

34-اردو بازار، لاہور فون: 042-7352332-7232336

پیش لفظ

''شری کانت'' بنگالی ادب کا شاہکار ناول ہے۔ جسے معروف بنگالی ناول نگار، فلسفی، سیاح اور ماہر نفسیات شرت بابو نے لکھا تھا جس کا ترجمہ دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں ہو چکا ہے۔ آج سے شاید پچپن سال پہلے منی رام دیوانہ نے اس ناول کا ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا جس کے چند اوراق مجھے کہیں ملے اور ناول بڑھنے کی جستجو ہوئی تو میں نے اس کا انگریزی اور گورمکھی ترجمہ دیکھا۔ اس ناول کا بلاشبہ دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شاید اس نوعیت کا سفرنامہ بہت کم زبانوں میں لکھا گیا ہوگا۔ میں نے بیشتر ترجمہ منی رام دیوانہ کا ہی استعمال کیا ہے صرف وہ حصہ جو نایاب ہے اسے انگریزی اور گورمکھی سے اردو میں منتقل کر دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ترجمے کی زبان بھی وہی رہے جو عموماً ہندوستان میں تب بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

شری کانت، شرت بابو کی تمام تصانیف کی کنجی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ٹیگور کے ناولوں میں گورا۔ یہ دونوں ہی ناول اپنے اپنے خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ شرت بابو کے جذبات کا مکمل سلسلہ اور ان کے تمام کردار شری کانت میں ہیں۔ اور شاید کچھ قارئین کے لیے یہ بات تعجب خیز ہوگی کہ شرت نے جو کچھ بھی لکھا اور مختلف تصانیف میں جو خیالات دنیا کے سامنے پیش کیے یا اپنے ادب میں جن کرداروں کی تخلیق کی وہ کسی نہ کسی شکل میں شری کانت میں آپ کو ملیں گے شری کانت شرت بابو کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ شری کانت لکھتے وقت وہ خود اس ادبی دور میں کھڑے تھے جس میں سنسنی خیز واقعات کے بغیر ناول، ناول ہی نہیں سمجھے جاتے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ شری کانت کا آغاز انہوں نے نہایت سنسنی خیز کیا ہے۔ شروع سے ہی یکے بعد دیگرے دل دہلا دینے والے واقعات کا گھٹا ٹوپ ہے اور انہیں واقعات کے ساتھ یہ ناول آگے بڑھتا ہے۔

تاہم شرت بابو بلاشبہ اس خصوصیت کے علم بردار تسلیم کئے جا چکے ہیں کہ جاسوسی۔ طلسمی اور بے بنیاد سنسنی خیز ناولوں کی مقبولیت کے دور میں بھی انہوں نے انسانی زندگی کی حقیقی حیرت اور سنسنی کو پیش کر کے بامذاق حضرات کے ادبی ذوق کو ٹھوس بنایا۔

شری کانت ان تمام سیاسی اور مجلسی الجھنوں، ضروریات اور زاویہ ہے نظر کا مجموعہ ہے جو اس

میں دور میں جب یہ ناول لکھا گیا دکھائی پڑتے ہیں۔ گرم سدھار، اچھوت ادھار، ویشیاؤں کے متعلق ہمدردی، آزادی کی تڑپ، اپنی تہذیب کی حفاظت وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ سیاسی مسائل ہیں جنہیں سودیشی تحریک کی بیداری میں بنگال نے پایا تھا۔

شرتی کانت کا بنگالی نام ہے۔ (شرتی کانترے بھرمن کہانی) اس ایک نام سے ہی اس ناول کا نقشہ سا آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ سیر و سیاحت کی کہانی کی شکل میں یہ ایک غیر معمولی آہنی ارادہ کردار کی داستان حیات ہے۔ جس نے جوانی کی ابتدائی منزل میں ہی بیخوبی اور عزم بالجزم کا زرہ بکتر پہن کر زندگی کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔ رابنسن کروسو، جس اضطراب اور ذہنی کاوشوں کا شکار ہو کر سیلانی بن گیا تھا۔ وہی جذبہ شرتی کانت میں بھی کام کر رہا ہے۔ لیکن رابنسن کروسو کا عرصہ حیات شرتی کانت سے بالکل مختلف ہے۔ رابنسن کروسو نے جنگل میں منگل منایا اور اپنے دماغ کی غیر معمولی قابلیت اور ذہن رسا روشن طبع سے گھوم پھر کر پھر اسی سوسائٹی میں قیام پذیر ہوا جہاں سے وہ چلا تھا۔ وہ تو ایک سیلانی تھا۔ اس کے دل میں جغرافیائی تحقیق کی پیاس تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑوں نے، سمندروں نے، غاروں نے اس کی جرأت اور اس کے حوصلے کی آزمائشیں کی۔ لیکن ہمارا شرتی کانت سیلانی نہیں ہے۔ وہ تو ایک مسافر ہے۔ منزل حیات کا مسافر۔ جوش میں امڈتی ندی۔ خوفناک شمشان، گہری تاریکی، دکھ درد، غم و آلام۔ ظلم و ستم۔ آزار اور امراض یہ سب اس منزل حیات کے راہی کی سرنگ کی دیواریں اور چھت ہیں۔ ان کے سب کے اندر ہی وہ مجلسی سطح پر گھوم پھر رہا ہے۔ اس سفر میں اسے مختلف ساتھی ملتے جا رہے ہیں ہر ایک کے سکھ دکھ کی کہانیاں اس کی زندگی کی کڑیاں بن کر جڑتی جا رہی ہیں۔

ان ہی چھوٹی بڑی کہانیوں کا مجموعہ یہ شرتی کانت ہے۔ گویا ایک ایسا ہار ہے جس کے لیے جگہ جگہ سے پھول حاصل کئے گئے ہیں۔ مختلف انسانوں کے درد و غم سے اس ہار کو پرو دیا گیا ہے۔ اس ہار میں اتنا درد اور اتنی کسک ہے کہ دل لرز اٹھتا ہے روح چیخ اٹھتی ہے۔ یہ ناول آج کی فضول اور جھوٹی مجلسی تفریق اور اس کے پاؤں تلے روندے ہوئے نرم و نازک غنچوں، ان کی پامال آرزوؤں۔ کچلی اور ٹھکرائی ہوئی انسانیت کا ایک بہی کھاتا ہے۔ شرت بابو نے جس سیاہی سے اسے لکھا ہے اس میں کئی رنگوں کی آمیزش ہے۔ ہیبت۔ سنسنی۔ مزاح۔ طنز۔ رومان اور درد۔

شرت کی مضطرب روح نے دیکھا کہ ہماری مجلسی زندگی میں کم سنسنی نہیں۔ آئے دن جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں وہ صرف اخبارات کی وقتی کشش کا مضمون نہیں بلکہ ازل سے انسان کی ازلی ہمدردی اور توجہ کے مستحق ہیں۔ اسی مجلسی زندگی کے زیر اثر شرت ہندوستان کے اخلاق کو اور پریم چند...... ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کو اپنی تصانیف میں پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔ شرت کی مشکلات مجلسی خرابیوں سے پیدا ہوتی ہیں پریم چند کی اقتصادی بدحالیوں سے۔ اسی لیے شرت کا نقطہ نظر خالص

تمدنی ہے پریم چند کا عام طور پر سیاسی۔

شرت نے جس زمانہ میں اپنے ناولوں کا آغاز کیا اس وقت تک سماج کا سوال سیاسی بن کر نہیں آیا تھا۔ سیاسی پیمانے پر اس نے گاندھی دور میں ہی وسعت اختیار کی اس سے پیشتر مجلسی سوال ہی تھا۔ لیکن اب ایک بات ضرور تھی کہ برصغیر سیاسی اصلاحات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا مگر مجلسی اصلاحات کا کام خالص سماجی پیمانے پر ہو رہا تھا۔ دیانند (آریہ سماج) اور کیشپ چندر سین (برہمو سماج) کی کوششوں نے ایک بیداری پیدا کر دی تھی۔ منشی پریم چند بھی اسی نئی بیداری کی طرف بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بازار حسن میں ہم ان کی آریہ سماجی بیداری کا نمونہ دیکھتے ہیں۔ ان کی انہیں مجلسی سرگرمیوں نے آگے چل کر انہیں سیاسی مصنف بنا دیا اور ہندو سوسائٹی کی بجائے ہندوستانی سوسائٹی ان کے پیش نظر رہی۔ اور اس طرح اخلاق اور قوم کے لئے انہوں نے اپنے قلم کا تمام زور صرف کر دیا۔ پریم چند کے متعلق ایک بات ہمیں ہمیشہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان کا نقطہ نظر سیاسی تو بن گیا لیکن سماج کے اخلاق کے متعلق ان کا نظریہ وہی قدیم رہا۔ اس کے برعکس شرت کا منتہائے مقصود ہندو تہذیب و تمدن سے معمور و لبریز تو ہے لیکن ان کا اخلاقی نظریہ قدیم نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نئی الجھنوں کو نئے نظریہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ شرت لکیر کے فقیر نہیں تھے اور نہ ہی ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستانی گھرانوں کی پرانی تہذیب کے تمام نشانات مٹا کر کوئی ایسا راستہ قائم کیا جائے جس سے زندگی کی تمام خوبصورتی تباہ ہو جائے۔ شرت وسطی زمانہ کے اوسط ہندو گھرانوں کے ناولسٹ ہیں ان کا ذاتی تجربہ ہی ان کے جذبات کا محرک رہا۔ وہ اس سوسائٹی کے فرد تھے جس کے متعلق انہوں نے اپنی تمام زندگی ایمانداری سے صرف کی۔ ان کی تنقید کسی غیر کا طعنہ نہیں بلکہ اپنی قوم کا دکھڑا ہے۔ وہ اسی سطح پر آ کر ہی انہیں اوپر اٹھانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی امکان بھر کوشش کی ہے کہ سوسائٹی میں آج جو خرابی واقع ہو چکی ہے وہ ہماری تہذیب کی خرابی نہیں بلکہ محروم تمیز قدامت پسندی ہی اس کے لیے ذمہ دار ہے۔ لہٰذا ضرورت مجلسی اصلاح کی ہے نہ کہ تہذیب سے بیزاری کی۔ جو سماج قدامت پسندی اور اندھے اعتقاد سے موتیابند کا مریض بن چکا ہے اس میں انسانی فطرت کے جذبہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ تا کہ نہایت سرعت سے تبدیل ہوتی ہوئی اس دنیا میں پیش آنے والے حالات کے لیے وہ اتنے زیادہ وسیع پیمانہ پر تیار ہو سکے کہ پامال، مظلوم اور خارج شدہ افراد بھی اس سماج میں زندگی حاصل کر سکیں۔ شرتی کانت میں ابھیا کہتی ہے...... "دنیا کے تمام مرد و عورت ایک سانچے میں ڈھلے نہیں ہوتے ان کی کامیابی کی راہ بھی زندگی میں ایک نہیں ہوتی۔ ان کی تربیت، ان کی فطرت اور ان کے دل کی رفتار ایک ہی طرف چل کر انہیں کامیاب نہیں بنا سکتی۔ اس لیے سوسائٹی میں ان کا کوئی معقول انتظام ہونا چاہئے۔"

شرت یہی چاہتے تھے کہ غلطی سے جن لوگوں کو ہم نے ٹھکرا رکھا ہے ان کے رہنے کے لیے

سوسائٹی میں جگہ ہونی چاہئے اس کے بغیر ان پر کوری تنقید کرنا محض ایک مستقل آزار ہے۔اس لئے شرت ان پر طعن و تشنیع اور لعنت ملامت کی بوچھاڑ کرنے کی بجائے ان کے لئے ہمدردی پیدا کرنے میں مصروف تھے۔ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ نام نہاد بداخلاقوں کا مسئلہ صرف مجلسی نہیں روحانی بھی ہے۔سوسائٹی میں جگہ مل جانے پر بھی ان کی روح کو اطمینان نہیں ملتا۔کیونکہ وہ کوئی آہنی کل نہیں بلکہ انسان ہیں۔معیاری سماج ان کو دھتکار کر ٹھکرانے کی غلطی نہ کرے بلکہ اپنی ہمدردی اور دلی پیار سے ان میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرے۔یہی شرت کا نعرہ ہے۔شری کانت میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں:۔

''ایک انسان کے دل کی بات اگر دوسرا جان سکتا ہے تو صرف ہمدردی اور پیار سے۔عمر اور عقل سے نہیں۔دنیا میں جس نے جتنی زیادہ محبت کی ہے۔دوسرے کے دل کی بات اس کے سامنے اتنی ہی زیادہ صاف ہو اٹھی ہے۔یہ نہایت مشکل باریک بینی صرف محبت کے زور سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور کسی طرح نہیں۔''

یہی ایک پہلو ہے جو الجھنوں کو یکا یک سلجھا دیتا ہے اور پڑھنے والوں کے سمجھنے کے لیے ایک لطیف انڈر لائن چھوڑ جاتا ہے وہ چاہتے یہ ہیں کہ انسان کے اخلاق کو پرکھنے کے لیے انسانی فطرت کی کمزرویوں کا کنیسیشن ملنا چاہئے کیونکہ ان کی نگاہ میں انسان سنگ مرمر کا دیوتا نہیں گوشت پوست کا مجموعہ بھی ہے۔

شرت کے ناولوں میں عورت کے دل کے پیار، درد کسک ممتا اور ایثار کا غلبہ ہے اور اپنی اسی خصوصیت سے وہ ظالم اور جابر کرداروں تک کو اپنے پیار میں باآسانی باندھ لیتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں عورت کے دل کو ہی اپنا معراج تسلیم کر کے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ شرت کا اپنی رنج وراحت سے ملی جلی طویل زندگی میں نسوانی دل کے عظیم درد اور اس کی بے مثل ممتا کا احساس ہی زیادہ ہوا ہے۔ان ہی کی محبت کے آب حیات کو تقسیم کر کے وہ پامال انسانوں کی ٹھکرائی ہوئی جماعت کو خوب تندرست و توانا بنا گئے ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی تمام مجلسی الجھنوں کا سلجھاؤ نسوانی زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے میں ہے اور اس کے لیے ہی وہ سرگرم عمل رہے ہیں اس سلسلہ میں ایک جگہ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''میں نے اپنی حیات کا بیشتر حصہ Sociologiy کے مطالعہ میں ہی صرف کیا ہے۔ملک کی تمام قوموں کی نہایت قریب سے دیکھنے کا موقعہ بھی مجھے ملا ہے۔مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس حساب سے جس نے صنف نازک کا حق تباہ کیا ہے۔بالکل اسی حساب سے وہ مجلسی، اقتصادی اور اخلاقی طور پر تباہ ہوا ہے۔''

شرت نے جس طرح رسوا اور بدنام لوگوں کو خاص نظریہ سے دیکھا ہے اسی طرح عورت کے اخلاق کو بھی۔مرد ہو یا عورت کسی کے چال چلن کو وہ سوسائٹی کے قدیم اور مروجہ نظریہ سے نہیں دیکھتے وہ تو

دیکھتے ہیں انسان کے اصلی جوہر یعنی انسانیت کے ارتقاء کو جس کو ایک مکالمے میں عورت کے چال چلن کے متعلق یوں کہا ہے۔ستی پن کو میں حقیر نہیں سمجھتا لیکن صرف اسی کو عورت کی زندگی کا معراج اور نجات دہندہ فرض کر لینے کو بھی میں ایک غلط عقیدہ ہی سمجھتا ہوں۔کیونکہ انسانیت کو حاصل کرنا انسان کا قدرتی فرض اور پیدائشی حق ہے۔ان سب کو بالائے طاق رکھ کر جو بھی، صرف ایک پہلو کو بڑا بنانے کی کوشس کرے گا وہ خود بھی دھوکہ میں رہے گا اور دوسروں کو بھی ایک فریب میں مبتلا کرے گا۔وہ دوسرے انسان کو انسان بننے نہیں دیتا۔وہ خود بھی اپنی لاعلمی میں انسانیت کو ہیچ و پوچ بنا ڈالتا ہے۔''

شرت بابو نے زندگی کا سرچشمہ ہر زمانہ میں پامال اور روندی ہوئی عورت کے دل میں ہی بہتا ہوا دیکھا ہے۔ایک دن مرد نے پتھر کی اہلیا کی نجات کی تھی لیکن آج خود مرد ہی محروم حیات پتھر بن چکا ہے کیونکہ مرد نے اپنا تزکیہ کرنا چھوڑ دیا لیکن عورت دھرم (مذہب) کی پابند ہو کر اپنی ریاضت میں مصروف رہی۔وہ سماج کے بنیادی اصولوں کو اپنا ایمان سمجھ کر چلتی رہی۔اور مرد نے اس میں حیات تازہ لانے کی بجائے اپنے ظلم و ستم سے اسے ناکارہ اور بے جان بنا دیا۔شرت کی عورت زندگی کے عقائدہ کو پاکیزہ امانت سمجھ کر زندہ ہے۔ضرورت صرف اس بات کی ہے سماج اس کا جائز استعمال کرے۔صدیوں سے عورت سنگ دل مرد کے ذرے ذرے کو اپنی آنکھوں کے آنسوؤں سے سینچ رہی ہے کاش کبھی تو اس پتھر میں زندگی کے آثار پیدا ہوں کبھی تو اس میں جان آ جائے۔

شرت نے شری کانت میں عورت کی عالم گیر طاقت کو بالترتیب ان دا جیجی، راج لکشمی اور ابھیا کے اضطراب، پیار اور پریشانی میں روشن کیا ہے۔یہ تینوں اپنی انفرادی حیثیت میں سرسوتی لکشمی اور درگاہ ہیں۔اپنی زندگی کا نصب العین حاصل کرنے کے لیے ان تینوں کے راستے الگ الگ ہیں۔لیکن سماج میں جب ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو ابھیا کی مانند بے خوف ہو کر اس کے خلاف بغاوت کئے بغیر صنف نازک کی نجات نہیں۔اسی لیے شرت نے عورت کے آدرش کو کسی ایک مرکز میں تنگ نہ بنا کر حسب موقعہ اسے وسعت اختیار کرنے کا حق بھی دیا ہے۔

شرت کے ناولوں میں نفرت اور برائی کی کچھ شکلیں بھی ازواجی زندگی کے راحت و آرام اور اطمینان کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔لیکن نسائیت کی فضیلت اور بزرگی ہی ان سب پر فتح حاصل کرتی ہے۔شری کانت میں وہ خود کہتے ہیں۔''عقل کے بل بوتے پر میں کتنے ہی اعتراضات کیوں نہ کروں۔دنیا میں کیا بداخلاق عورتیں نہیں ہیں۔اگر نہیں تو راہ گھاٹ میں گناہ کی اتنی شکلیں کن کی نظر آتی ہیں؟ سب اندر ناتھ کی جیجی (ان دا جیجی) ہیں تو اتنی قسم کے دکھوں کے چشمے کون بہاتی رہتی ہیں۔پھر بھی نامعلوم دل میں کیوں آتا ہے کہ یہ سب ان کے بیرونی پردے ہیں جن کو وہ جب چاہیں دور پھینک کر بالکل انہیں (ان دا جیجی) کی مانند ہی باآسانی ستی کی مسند پر جلوہ افروز ہو سکتی ہیں۔'' ایک جگہ اور بھی کہتے ہیں۔

"عورت کے کلنک کی بات پر میں با آسانی یقین نہیں کر سکتا۔ مجھے جیجی (ان دا) یاد آ جاتی ہیں...... سوچتا ہوں کہ لاعلمی میں عورت کے کلنک کی بات پر انکار کر کے ٹھگا جانا بہتر ہے۔ لیکن یقین کر کے گناہ کا حقدار بننا اچھا نہیں۔"

شرت بابو کہتے ہیں:۔

"کسی طرح ٹکے رہنا۔ یا اپنی ہستی کو قائم رکھنا ہی کیا زندگی کا حقیقی معیار ہے۔ اس قسم کو تو بہت سی قومیں اپنی ہستی کو قائم رکھے ہوئے موجود ہیں۔ کور کو ہیں۔ کول بھیل سنتھال ہیں۔ جزائر غرب الہند میں بے شمار چھوٹی چھوٹی قومیں انسانی دنیا کے آغاز سے ابھی تک دیسی ہی بنی ہوئی ہیں۔ افریقہ میں ہیں۔ امریکہ میں ہیں۔ ان قوموں میں بھی اسی طرح کے تمام سخت آئین قانون موجود ہیں۔ جنہیں سن کر جسم کا خون پانی ہو جاتا ہے۔ قدامت کے لحاظ سے وہ قومیں یورپ کے کئی قوموں سے بھی قدیم ہیں۔ اور شاید ہم سے بھی قدیم۔ لیکن اس لیے وہ قومیں ہماری نسبت تہذیب وتمدن میں اخلاق اور چال چلن میں ہم سے زیادہ افضل ہیں۔ ایسا عجیب وغریب وہم میں سمجھتا ہوں کہ کسی کے دل میں بھی نہ اٹھتا ہوگا۔"

میری یہ کتاب ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز سے شائع ہو رہی ہے جس کے بعد اُمید ہے کہ آپ کی وہ شکایات جو آپ میری کتابوں کے لئے استعمال ہونے والے کاغذ، جز بندی اور پروف ریڈنگ سے متعلق کیا کرتے ہیں، جس طرح یہ قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب معنوی ہی نہیں، صوری طور پر بھی خوبصورت دکھائی دے۔ مصنف بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق جب پیکر میں ڈھلے تو اتنی ہی خوبصورت دکھائی دے جیسا کہ اس نے سوچا اور لکھا۔

ہمارے ہاں بد قسمتی سے حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ قاری اور کتاب کا رشتہ ختم ہو جائے اس کے لئے بہترین ہتھیار کاغذ کی گرانی ہے جسے ہر حکومت نے کلہاڑے کی طرح استعمال کیا ہے۔ دنیا کے جاہل ترین معاشروں میں بھی کتاب کے لئے استعمال ہونے والے کاغذ پر حکومتیں رعایت دیتی ہیں ہمارے ہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے اور زمانے بھر کے ٹیکس کاغذ پر تھوپ کر اُسے اتنا مہنگا اور نایاب کر دیا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ان حالات میں جو پبلشرز کتاب خوبصورت انداز میں آپ تک پہنچاتے ہیں بلاشبہ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز بھی ان میں شامل ہے میری تمام پرانی کتابیں اسی ادارے سے ملیں گی اور جلد ہی انشاء اللہ نئی کتابیں بھی۔

آپ سے درخواست ہے کہ میری کتابیں طلب کرتے ہوئے ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز کا نام ضرور دیکھ لیا کریں تا کہ آپ تک معیاری کتاب پہنچے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

میری تمام زندگی گھومنے میں ہی کٹی ہے۔ اس سیلانی زندگی کے دو پہر ختم کر چکنے کے بعد تیسرے پہر میں کھڑے ہو کر اس کے ایک باب کو سناتے ہوئے آج مجھے نامعلوم کتنی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

یوں تو گھومتے پھرتے ہی میں بچے سے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے اپنے متعلق محض "چھی، چھی" سنتے سنتے میں اپنی زندگی کو ایک بڑی بھاری چھی چھی، کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ تاہم بہت طویل عرصہ بعد آج جب میں اس کچھ یاد اور کچھ بھولی بسری کہانی کس سلسلہ جوڑنے کے لئے تیار ہوا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ زندگی کی اس صبح میں ہی "چھی، چھی" کی وہ تمہید کس لیے باندھی گئی تھی۔ تو یکا یک مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی "چھی، چھی" کو اپنی نظر کے دھوکہ سے جتنا بڑا کر کے دیکھتے تھے۔ اتنی بڑی یہ شاید ہرگز نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید بھگوان، جسے اپنی دنیا میں جبراً دھکیل دیتے ہیں۔ اس کو ہونہار لڑکا کہلا کر امتحان پاس کرنے کی سہولت عطا نہیں فرماتے اور نہ اسے گاڑی گھوڑے، پالکی پر لاؤ لشکر کے ساتھ سیر کرنے کی داستان شائع کرنے کا مادہ اس میں ودیعت کرتے ہیں۔ اس کو عقل وتمیز تو شاید وہ کچھ دیتے ہیں لیکن دنیا دار لوگ اسے عقلمند نہیں کہتے۔ اس لیے اس کی طبیعت ایسی لا ابالی اور ایسی نرالی ہوتی ہے اور اس میں مشاہدہ کی چیزیں اور ان کی ماہیت معلوم کرنے کا چاؤ عموماً ایسا لاثانی ہوتا ہے کہ اگر اس کا ذکر کیا جائے تو شاید اپنے آپ عقلمند کہلانے والے لوگ ہنستے ہنستے مر جائیں۔ اس کے بعد وہ لڑکا، نامعلوم کس طرح لاپرواہی، بے توجہی اور بے عزتی کی وجہ سے بروں کی صحبت میں اور بھی برا ہو کر، دھکے اور ٹھوکریں کھاتا ہوا، در پردہ آخر کار کسی دن بدنامی کی جھولی کندھے پر ڈال کر کہیں چل دیتا ہے اور، بہت مدت تک اس کا کوئی پتہ ہی نہیں چلتا۔

اس لیے آج ان سب باتوں کو رہنے دوں تو اچھا ہے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہی عرض کروں گا۔ مگر کہنے سے تو کہنے کی غرض وغایت پوری نہیں ہوتی۔ گھومنا ایک بات ہے اور اس کا ذکر کرنا دوسری بات۔ جس کسی کے بھی دو پاؤں ہیں وہ گھوم پھر سکتا ہے۔ لیکن دو ہاتھ ہونے سے ہی تو ہر ایک سے لکھا

نہیں جا سکتا۔ لکھنا تو بڑا مشکل ہے اور اس کے علاوہ ایک بڑی بھاری مشکل یہ ہے کہ بھگوان نے میرے دل میں شاعرانہ تخیل کی ایک بوند بھی نہیں ڈالی۔ ان بدقسمت آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہوں، بالکل وہی دیکھتا ہوں۔ درختوں کو بالکل درخت ہی دیکھتا ہوں۔ اور پہاڑ پربتوں کو پہاڑ پربت۔ پانی کی طرف دیکھنے سے وہ پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح بھگوان نے ہی جس کا مزاج ایسا بنا دیا ہو۔ اس سے شاعرانہ تخیل کی دنیا کس طرح آباد ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی ہے تو یہی کہ وہ سچ سچ بات سیدھی طرح سے کہہ دے۔ اسی لئے میں بھی یہی کروں گا۔

مگر وہ گھمکو (سیلانی) کیوں بن گیا؟ یہ بتانے سے پیشتر اس ہستی کا کچھ تعارف کرا دینا نہایت ضروری ہے۔ جس نے میری زندگی کی صبح میں ہی مجھے اس نشہ میں مخمور کر دیا تھا۔ اس کا نام تھا اندرناتھ۔ ہم دونوں کی پہلی ملاقات ایک فٹ بال میچ میں ہوئی۔ میرے لیے یہ کہہ دینا کہ وہ آج بھی زندہ ہے ممکن نہیں۔ کیونکہ سالہا سال پیشتر ایک دن علی الصبح اٹھ کر گھر والوں کو چھوڑ کر صرف ایک دھوتی لے کر وہ چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ اوہ، وہ دن آج کس طرح یاد ہے۔

سکول کے احاطہ میں بنگالی اور مسلمان طالب علموں میں فٹ بال میچ تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ محو ہو کر میں دیکھ رہا تھا۔ مسرت کی انتہا نہ تھی۔ معاً...... ارے یہ کیا۔ تڑا تڑ، تڑ تڑ اور مارو سالے کو، پکڑو سالے کو، کا شور مچ گیا۔ میں بے چین ہو گیا۔ دو تین منٹ...... بس اتنے ہی میں کون کہاں غائب ہو گیا۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ پتہ چلا تب جب میری پیٹھ پر آ کر چھتری کا پورا ہنڈل تڑاک سے ٹوٹ گیا اور بھی دو تین ہنڈل سر اور پیٹھ پر چلنے کو کمربستہ دیکھے۔ دیکھا پانچ سات بنگالی چھوکروں نے میرے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے اور بھاگ نکلنے کے لئے ذرا سا راستہ بھی نہیں چھوڑا۔

اور بھی ایک ہنڈل...... اور بھی ایک، عین اسی وقت جو انسان برق کی سی رفتار سے اس گھیرے کو توڑ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا وہی تھا اندرناتھ۔

اس کا رنگ کالا تھا۔ ناک بانسری کی طرح پیشانی کشادہ اور سڈول، چہرے پر چیچک کے دو چار داغ۔ قد میرے برابر ہی تھا۔ لیکن عمر مجھ سے کچھ زیادہ تھی۔ کہنے لگا۔ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے تم میرے پیچھے پیچھے نکل آؤ۔

اس لڑکے کے دل میں جو جرأت استقلال اور دلیری تھی وہ کمیاب ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی نہ تھی۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اس کے دونوں ہاتھ غیر معمولی تھے۔ یہی نہیں کہ وہ بہت طاقتور تھے۔ بلکہ لمبائی میں بھی گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی سہولت تھی کہ جو اسے جانتا نہ ہو۔ اس کے دل میں یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کسی جھگڑے کے وقت یہ حضرت اچانک اپنا تین

ہاتھ لمبا ہاتھ باہر نکال کر میری ناک پر یکا یک اس انداز کا گھونسہ مار سکے گا۔ وہ گھونسہ کیا تھا اسے شیر کا پنجہ ہی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

دو ہی منٹ میں میں اس کی پشت سے لگا ہوا باہر آ گیا اور پھر اندر نے بغیر کسی بناوٹ اور تصنع کے کہا۔ ''بھاگو بھاگنا شروع کر کے میں نے پوچھا......

''اور تم......؟

اس نے روکھائی سے کہا...... ''ارے تو تو بھاگ۔ گدھے کہیں کے۔''

گدھا ہوں...... یا جو کچھ بھی ہوں۔ مجھے خود یاد ہے۔ میں نے فوراً ڈٹ کر اور کھڑے ہو کر کہا۔ ''نہیں میں نہیں بھاگوں گا۔'' بچپن میں مار پیٹ کس نے نہ کی ہو گی؟ لیکن میں تھا گاؤں کا لڑکا۔ دو تین مہینے پیشتر ہی لکھنے پڑھنے کے لیے شہر میں ابو جی کے یہاں آیا تھا...... اس سے پہلے گروہ بنا کر یا پارٹی بنا کر نہ تو میں نے مار پیٹ ہی کی تھی اور نہ کسی دن اس طرح چھتری کے دو ہینڈل ہی میری پیٹھ پر ٹوٹے تھے۔ پھر بھی میں اکیلا بھاگ نہ سکا۔ اندر نے ایک بار میرے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''نہیں بھاگے گا تو کیا کھڑے کھڑے مار کھائیگا؟ دیکھ اس طرف سے وہ لوگ آ رہے ہیں۔ اچھا تو چل خوب کس کر دوڑیں۔''

یہ کام تو میں خوب کر سکتا تھا۔ دوڑتے دوڑتے جب ہم بڑی سڑک پر پہنچ گئے تو شام ہو گئی تھی۔ دکانوں میں روشنی تھی اور رستے پر میونسپل کے کیروسین کے لیمپ، لوہے کے کھمبوں پر ایک یہاں اور دوسرا وہاں جل رہے تھے۔ آنکھوں میں زور ہونے پر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے پاس کھڑے ہو کر دوسرا دکھائی نہ دے۔ ان بدمعاشوں کا اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ اندر اپنے حسب معمول قدرتی لہجہ میں بات کر رہا تھا۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اندر ہانپ نہیں رہا تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا نہ مارا نہ مار کھائی ہوا اور نہ دوڑا ہی ہو...... جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اس ڈھنگ سے اس نے پوچھا...... ''تیرا نام کیا ہے رے؟''

''شری کانت؟ اچھا'' کہہ کر اس نے اپنے جیب سے مٹھی بھر خشک پتی نکالی اس میں سے کچھ تو اس نے کھا لی اور کچھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ''آج خوب خبر لی ان سالوں کی۔ لے کھا۔''

''کیا ہے یہ؟''

''بوٹی۔''

میں نے حیران ہو کر کہا...... ''بھنگ، یہ میں نہیں کھاتا۔''

اس نے مجھ سے زیادہ حیران ہو کر کہا...... ''کھاتا نہیں، کہاں کا گدھا ہے رے۔ خوب نشہ ہو

گا۔ کھا چبا کر نگل جا۔''

نشے کی شئے کا لطف اس وقت تک معلوم نہ تھا اس لیے سر ہلا کر میں نے اسے واپس کر دیا۔ وہ اسے بھی چبا کر نگل گیا۔

''اچھا تو پھر سگریٹ پی۔'' یہ کہہ اس نے جیب سے دو سگریٹ اور دیا سلائی باہر نکالی۔ ایک تو اس نے میرے ہاتھ میں دے دی اور دوسری اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس کے بعد وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ایک عجیب طرح سے ملا کر اس سگرٹ کو چلم بنا کر زور سے کھینچنے لگا۔ باپ رے، کیسے زور سے اس نے دم کھینچا کہ ایک ہی دم سگرٹ کی آگ سرے سے چل کر نیچے اتر گئی۔ لوگ چاروں طرف کھڑے تھے۔ میں بہت ہی ڈر گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔'' پیتے ہوئے اگر کوئی دیکھ لو تو؟''

''دیکھ لے تو کیا؟ سبھی جانتے ہیں۔'' یہ کہہ کر آزادی سے سگرٹ پیتا ہوا وہ چوراہے پر مڑا اور میرے دل پر ایک گہرا نقش قائم کر کے ایک طرف چل دیا۔

آج اس دن کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ صرف اتنا ہی یاد نہیں آتا کہ اس عجیب وغریب لڑکے کے متعلق میرے دل میں محبت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ یا یوں کھلے عام بھنگے اور تمباکو کو پینے کی وجہ سے دل ہی دل میں نفرت۔

اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن رات جتنی گرم تھی اتنی ہی تاریک تھی۔ کہیں بھی ایک پتہ ہلتا نہ تھا۔ سب لوگ چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ بارہ بج چکے تھے۔ لیکن کسی کی بھی آنکھوں میں نیند کا نام نہ تھا۔ دفعتہ بانسری کی نہایت دلکش تان کونوں میں آنے لگی۔ عام ''رام پر سادی'' تان بھی۔ کتنی ہی مرتبہ تو سن چکا تھا۔ مگر بانسری اس طرح محو کر سکتی ہے یہ میں نہیں جانتا تھا۔ ہمارے مکان کے جنوب مشرق میں آم اور کٹہل کا ایک بڑا بھاری باغ تھا۔ کئی حصے داروں کی ملکیت ہونے کے باعث کوئی اس کی پراہ نہیں کرتا تھا اس لیے تمام باغ ویران ہو کر جنگل بنتا گیا۔ گائے بیلوں کی آمد ورفت سے اس باغ کے بیچوں بیچ ایک پتلی سی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسی جنگلی راستہ سے بانسری کا لہجہ رفتہ رفتہ قریب سے قریب تر ہوا آ رہا ہے۔ بوا اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے بڑے لڑکے کو مخاطب کر کے بولی۔ ''ہاں رے نوین، یہ بانسری رائے خاندان کا اندر ہی بجا رہا ہے نا؟'' تو میں نے سمجھا کہ اس بانسری والے کو سب جانتے ہیں۔ بڑے بھیا نے کہا۔ ''اس بدنصیب کو چھوڑ کر ایسی بانسری کون بجائے گا اور اس جنگل میں اور کون ہے جو گھومے گا۔''

''کیا کہتا ہے رے؟ وہ کیا گوسائیں کے باغیچہ میں آ رہا ہے؟''

بڑے بھیا بولے...... ''ہاں؟''

ایسی مہیب تاریکی میں اس خوفناک جنگل کا تصور کر کے بوا دل میں لرا اٹھیں اور خوفزدہ لہجہ میں انہوں نے دریافت کیا۔ ''اس کی ماں بھی کیا اسے نہیں روکتی؟ گوسائیں کے باغ میں تو نہ جانے کتنے لوگ سانپ کے کاٹنے سے مر گئے ہیں۔ اس جنگل میں اتنی رات کو وہ لڑکا آیا ہی کیوں؟''

بڑے بھیا کچھ ہنس کر بولے...... ''اس لئے کہ اس محلے سے اس محلے تک آنے کا وہی سیدھا راستہ ہے۔ جسے ڈر نہیں ہے۔ جان کی کچھ پرواہ نہیں وہ کیوں بڑے راستے سے چکر کاٹ کر آئے گا ماں، اسے تو جلدی آنے سے سروکار ہے؟ پھر خواہ اس راستے میں ندی نالے ہوں۔ خواہ سانپ بچھو اور شیر بھالو ہوں!''

''سلام ہے رے لڑکے تجھے۔'' کہہ کر بوا ایک آہ بھر کر چپ ہو رہیں۔ بانسری کا لہجہ صاف ہوتا گیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہلکا ہوتا ہوا دور جا کر ناپید ہو گیا۔''

یہی تھا وہ اندر ناتھ، اس دن تو میں یہ سوچتا رہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اتنی زیادہ طاقت مجھ میں بھی ہوتی اور میں بھی اسی طرح مار پیٹ کر سکتا اور آج رات جب تک سو نہ گیا تو یہ آرزو کرتا رہا کہ اگر کسی طرح ایسی بانسی بجا سکتا۔

لیکن اس سے راہ ورسم کس طرح پیدا کروں۔ وہ تو مجھ سے بہت بلندی پر ہے۔ اس وقت وہ سکول میں بھی نہ پڑھتا تھا۔ سنا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ظلم کر کے جونہی اس کے سر پر گدھے کی ٹوپی لگانے کا انتظام کیا تو وہ متاثر ہو کر فوراً ہیڈ ماسٹر کی پیٹھ پر ایک تھپڑ جما کر اور نفرت کا اظہار کر کے سکول کی ریلنگ پھاندتا ہوا گھر بھاگ آیا اور پھر گیا ہی نہیں۔ بہت دنوں بعد اسی کے منہ سے سنا تھا کہ وہ ایک جرم تھا۔ ہندوستانی پنڈت جی کو جماعت کے وقت ہی نیند آنے لگتی تھی۔ ایک بار جب وہ نیند لے رہے تھے تو ان کی گانٹھ بندھی چوٹی کو اس نے قینچی سے کاٹ کر ذرا سا چھوٹا کر دیا تھا اور اس سے ان کا کچھ خاص نقصان بھی نہ ہوا تھا۔ کیونکہ پنڈت جی جب گھر پہنچے تو ان کو اپنی چوٹی اپنی اچکن کی جیب میں ہی پڑی ہوئی مل گئی۔ وہ کہیں کھوئی نہیں تھی۔ پھر بھی پنڈت جی کا غصہ فرد کیوں نہ ہو سکا۔ اور کیوں وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کرنے گئے۔ یہ بات آج تک بھی اندر کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پھر بھی یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ سکول سے ریلنگ پھاند کر گھر آنے کا راستہ تیار ہو جانے پر پھر پھاٹک میں سے واپس جانے کا راستہ تقریباً کھلا نہیں رہ جاتا۔ اور پھاٹک کا راستہ کھلا رہا یا نہیں رہا۔ یہ دیکھنے کی پرواہ بھی اسے بالکل نہ رہی۔ حتیٰ کہ سر پر دس بیس سرپرستوں کا بوجھ ہونے پر بھی ان میں سے کوئی بھی اس کا منہ کسی طرح بھی پھر سکول کی طرف پھیر نہ سکا۔ اندر نے قلم پھینک کر ناؤ کا ڈانڈ ہاتھ میں لیا۔ اب یہی اس کا شغل تھا۔

ایک دن اسی طرح جب وہ بغیر کسی مقصد کے اپنی کشتی بہائے جا رہا تھا تو اس کے ساتھ ملاپ کی گانٹھ کو مضبوط بنانے کا مجھے موقعہ ملا۔ اس وقت میری صرف یہی ایک تمنا تھی کہ اس سے کسی نہ کسی طرح دوستانہ تعلقات استوار کئے جائیں اور یہی بتانے کے لیے میں نے یہ سب کچھ عرض کیا ہے۔

لیکن جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ تو کہیں گے کہ یہ تو تمہیں اچھا نہیں لگتا بھیا! تم ٹھہرے غریب کے لڑکے اور پھر پڑھنا لکھنا سیکھنے کے لیے اپنا گاؤں چھوڑ کر پرائے گھر آ کر رہے ہو۔ پھر تم اس سے ملے ہی کیوں؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تم۔

ٹھہرو، ٹھہرو زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات ہزاروں لوگوں نے لاکھوں بار مجھ سے کہی ہے۔ خود میں نے بھی یہ سوال اپنے آپ سے کروڑوں مرتبہ پوچھا ہے۔ لیکن سب بیکار ہے۔ فضول ہے وہ کون تھا؟ اس کا جواب تم میں سے کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ اور پھر اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تم میں کیا ہو جاتا۔ اس سوال کا حل بھی تم میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔ جو سب کچھ جانتے ہیں صرف وہ (بھگوان) ہی بتا سکتے ہیں کہ کیوں اتنے انسانوں کو چھوڑ کر صرف اسی بدنصیب کی طرف میرا دل کشش کرنے لگا۔ اور کیوں اس سے ملنے کے لیے میرے جسم کا ہر ذرہ بے قرار ہوا تھا۔

وہ دن مجھے خوب یاد ہے۔ تمام دن بارش ہوتے رہنے کے باوجود بھی بادل ابھی تک برس رہے تھے۔ ساون کا آسمان گھنے بادلوں سے محیط تھا۔ شام ہوتے ہوتے چہار طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ جلدی جلدی کھا کر ہم کئی بھائی حسب معمول باہر بیٹھک میں بچھے ہوئے بستر پر ارنڈی کے تیل کا چراغ جلا کر کتاب کھول کر بیٹھ گئے۔ باہر کے برآمدے میں ایک طرف پھوپھا جی کینوس کی کھاٹ پر لیٹے ہوئے شام کی نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور دوسری طرف بوڑھے رام کمل بھٹاچاریہ افیون کھا کر اندھیرے میں آنکھیں بند کئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ڈیوڑھی پر ہندوستانی دربان کا ''تلسی داسی'' لہجہ سنائی دے رہا تھا۔ اور اندر ہم تینوں بھائی منجھلے بھیا کر کڑی نگرانی میں چپ چاپ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چھوٹے بھیا جیتن اور میں تیسری اور چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اور سنجیدہ مزاج منجھلے بھیا دو مرتبہ انٹرنس فیل ہو کر تیسری بار تیاری کر رہے تھے۔ ان کے سخت گیرانہ نظام میں کسی کو ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ ہم لوگوں کے پڑھنے کا وقت ساڑھے سات سے نو بجے تک تھا۔ اس وقت میں ہم بات چیت کر کے ان کے ''پاس ہونے'' کے مطالعہ میں خلل انداز نہ ہوں۔ اس لیے وہ ہر روز قینچی سے کاٹ کر کاغذ کے پچیس تیس ٹکٹ کی مانند ٹکڑے رکھ چھوڑتے۔ ان میں سے کسی میں لکھا ہوتا ''باہر جانا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ جیتن بھیا نے ایک ناک صاف کرنے کا ٹکٹ، منجھلے بھیا کے سامنے پیش کیا۔ منجھلے بھیا نے اس پر اپنے ہاتھ سے لکھ دیا آٹھ بج کر تیس منٹ سے لے کر آٹھ بج کر ساڑھے تینتیس

منٹ تک یعنی اتنے وقت کے لئے وہ ناک صاف کرنے کے لئے جا سکتے تھے۔ اجازت حاصل کر کے ٹکٹ ہاتھ میں لے کر وہ گئے ہی تھے کہ چھوڑے بھیا نے تھوکنے جانے کا ٹکٹ پیش کر دیا۔ منجھلے بھیا نے اس پر ''نہیں'' لکھ دیا۔ دو منٹ تک چھوٹے بھیا منہ پھلائے بیٹھے رہے اور اس کے بعد انہوں نے ''پانی پینے'' کی عرضی داخل کر دی۔ اس بار وہ منظور ہو گئی۔ منجھلے بھیا نے اس کے لیے لکھ دیا ہاں آٹھ بج کر اکیالیس منٹ لے کر آٹھ بج کر سنتالیس منٹ تک'' پروانہ لے کر چھوٹے بھائی جونہی ہنستے ہوئے باہر گئے جیتن بھیا نے لوٹ کر ہاتھ کا ٹکٹ واپس دے دیا منجھلے بھیا نے گھڑی دیکھ کر اور وقت ملا کر ایک رجسٹر باہر نکالا۔ اور اس میں وہ ٹکٹ گوند سے چپکا دیا۔ یہ سب سامان اس کے ہاتھ کی رسائی تک ہی رکھا جاتا تھا۔ ہفتہ ختم ہونے پر ان سب ٹکٹوں کو سامنے رکھ کر کیفیت دریافت کی جاتی۔ کہ فلاں دن تم نے اجازت سے زیادہ وقت کیوں لگا دیا تھا۔

اس طرح منجھلے بھیا کی نہایت محتاط اور باقاعدہ نگرانی میں اور ہمارا اور خود ان کا کسی کا بھی وقت ضائع نہ ہوتا تھا۔ اور ہر روز ڈیڑھ گھنٹہ خوب پڑھ لینے کے بعد جب ہم لوگ رات کے نو بجے گھر میں سونے کے لیے جاتے تھے۔ تو یقیناً ہی سرسوتی ماتا (علم کی دیوی) ہمیں گھر کی چوکھٹ تک پہنچا جاتی تھی اور دوسرے دن سکول کی جماعت میں جو قدر اور خوش قسمتی حاصل کر کے ہم گھر لوٹتے تھے۔ وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ لیکن منجھلے بھیا کی بدبختی کہ ان کے بیوقوف ممتحن انہیں کبھی پہچان نہ سکے۔

وہ اپنی اور دوسروں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اتنا زبردست خیال اور وقت کی قدر و قیمت کے متعلق اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ انہیں متواتر فیل ہی کرتے گئے۔ اسی کو تو کہتے ہیں غیب کا اندھا انصاف۔ خیر جانے دو...... اب اس کے لیے افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟

اس رات کو بھی گھر کے باہر گہری تاریکی، برآمدے میں محو خواب وہی دونوں بوڑھے اور اندر چراغ کی مدھم سی روشنی میں سنجیدہ مطالعہ میں مہنمک ہم چاروں بھائی تھے۔

چھوٹے بھیا کے لوٹ آتے ہی پیاس کے مارے میری چھاتی یک بارگی پھٹنے لگی۔ اس لئے ٹکٹ پیش کر کے میں اجازت کی راہ دیکھنے لگا۔ منجھلے بھیا اس ٹکٹ والے رجسٹر پر جھک اندازہ کرنے لگے کہ میرا پانی پینے کے لئے جانا قواعد کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ یعنی کل پرسوں میں نے کسی وقت پانی پیا تھا۔

دفعتہً میرے عین پیچھے سے ایک ہوم، آواز ساتھ ہی چھوٹے بھیا اور جتین بھیا کی چیخ نکلی۔ ''ارے باپ رے! مار ڈالا رے، کا فلک شگاف شور و غل سنائی پڑا۔ انہیں کس نے مار ڈالا۔ گردن گھما کر یہ دیکھنے کے پیشتر ہی منجھلے بھیا نے منہ اٹھا کر عجیب آواز نکالی اور بجلی کی سی رفتار سے سامنے پاؤں پھیلا

دیئے۔جس سے دیوٹ الٹ گیا۔تو اس تاریکی میں دھما چوکڑی مچ گئی منجھلے بھیا کو مرگی کا عارضہ تھا۔اس لیے وہ 'اوں اوں' کر کے دیوٹ الٹا کر جو چت گرے تو پھر نہ اٹھے۔

دھکم پیل کر کے میں باہر نکلا تو دیکھا کہ پھوپھا جی اپنے دونوں لڑکوں کو بغل میں دبائے ہوئے ان سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلا کر چھپر پھاڑے ڈال رہے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان تینوں باپ بیٹوں میں اس بات کی ضد لگی ہوئی ہے۔کہ کون زیادہ گلا پھاڑ سکتا ہے۔

اسی وقت ایک چور جی چھوڑ کر بھاگا جا رہا تھا اور ڈیوڑھی کے سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔

پھوپھا جی خوفناک چیخ مار کر حکم دے رہے تھے۔''ارے مارو، سالے کو مار ڈالو، وغیرہ وغیرہ۔

دم بھر میں روشنی ہوگئی۔نوکر چاکروں اور پاس پڑوسیوں سے صحن کھچا کھچ بھر گیا۔درباریوں نے چور کو مارتے مارتے نیم بسمل کر دیا اور روشنی کے سامنے دھکا دے کر گرا دیا۔چور کی شکل دیکھتے ہی سب لوگوں کے چہرے خشک ہوگئے ارے یہ تو بھٹا چاریہ جی ہیں!

پھر تو کوئی پانی لے آیا، کوئی پنکھے سے ہوا کرنے لگا اور کوئی ان کی آنکھوں اور منہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ادھر گھر کے اندر منجھلے بھیا کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

پنکھے کی ہوا اور پانی کے چھینٹے کھا کر رام کمل ہوش میں آ کر سسک سسک کر رونے لگے۔

سب لوگ پوچھنے لگے۔''آپ اس طرح بھاگے کیوں جا رہے تھے۔بھٹا چاریہ مہاشہ روتے روتے بولے۔بابا، ریچھ نہیں وہ تو ایک بڑا بھالو تھا۔چھلانگ مار کر بیٹھک خانہ سے باہر آ گیا۔''

چھوٹے بھیا اور جتین بھیا بار بار کہنے لگے۔''بھالو نہیں بابا ایک بھیڑیا تھا۔دم سمیٹے پا انداز پر بیٹھا غرا رہا تھا۔''

منجھلے بھیا ہوش میں آتے ہی نیم وا آنکھوں سے، طویل آہ بھر کر صرف اتنا ہی بولے۔''دی رائل بنگال ٹائیگر''لیکن ہے کہاں؟ خواہ منجھلے بھیا کا''دری رائل بنگال ٹائیگر''ہو۔رام کمل کا بڑا بھائی ہو مگر وہ یہاں آیا ہی کس طرح؟ اور چلا ہی کہاں گیا؟ جب اتنے لوگوں نے اسے دیکھا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔

کسی نے یقین کیا اور کسی نے نہ کیا۔مگر سب لوگ خوف سے حیرت زدہ آنکھوں سے لالٹین لے کر چاروں طرف تلاش کرنے لگے۔

اچانک پہلوان کشور سنگھ''وہ بیٹھا ہے''کہہ کر ایک چھلانگ میں برآمدے اوپر چڑھ گیا۔اس کے بعد وہاں بھی دھکم پیل مچ گئی۔اتنے سب لوگ اکٹھے برآمدے پر چڑھنا چاہتے تھے۔کسی سے بھی ایک لمحہ کی تاخیر برداشت نہ ہو سکتی تھی۔صحن میں ایک انار کا درخت تھا۔معلوم ہوا کہ اس کی گھنی ٹہنیوں

میں ایک بڑا جانور بیٹھا ہے۔وہ بھیڑیئے کی طرح ہی معلوم ہوتا تھا۔چشم زدن میں تمام برآمدہ خالی ہوگیا اور بیٹھک کھچا کھچ بھر گئی۔برآمدے میں ایک بھی انسان نہ رہا۔گھر کے اس ہجوم میں سے پھوپھا جی کا پر جوش لہجہ سنائی دینے لگا......''برچھی لاؤ......بندوق لاؤ''ہمارے مکان کے پڑوس میں گگن بابو کے ہاں ایک مونگیری بندوق تھی۔ان کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

لاؤ تو بجا لیکن لائے کو؟ انار کا درخت دروازے کے نزدیک ہی تھا۔پھر اس پر بیٹھا تھا بھیڑیا۔ہندوستانی سٹپٹاتے تک نہیں اور جو لوگ تماشہ دیکھنے آئے تھے وہ بھی سن ہو کر رہ گئے۔

اس مصیبت کے وقت نا معلوم کہاں سے اندر آ حاضر ہوا۔شاید وہ مقابل کے راستہ سے کہیں جا رہا تھا۔اور شور غل سن کر اندر گھس آیا تھا۔پل بھر میں سینکڑوں گلے ایک ساتھ پکار اٹھے۔''ارے رے، بھیڑیا ہے بھیڑیا۔بھاگ جا رہے لڑکے بھاگ جا۔''

پہلے تو وہ ہڑبڑا کر اندر دوڑ آیا۔لیکن پھر دم بعد ہی سب حال سن کر اور بے خوف ہو صحن میں اتر کر لالٹین اٹھا کر دیکھنے لگا۔

دو منزلے کی کھڑکیوں میں سے عورتیں دم روک کر اس جرأت مند لڑکے کی طرف دیکھ دیکھ کر ''درگا'' نام جپنے لگیں۔نیچے بھیڑ میں کھڑے ہندوستانی سپاہی اس کی ہمت بندھانے لگے۔اور اسے حوصلہ دینے لگے کہ ایک آدھ ہتھیار ملنے پر وہ بھی آنے کو تیار ہیں۔

اچھی طرح دیکھ کر اندر نے کہا......''دوار کا بابو! یہ تو بھیڑیا معلوم نہیں ہوتا''......اس کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہی وہ''رائل بنگال ٹائیگر''دونوں ہاتھ باندھ کر انسانی لہجہ میں رو پڑا اور بولا......''نہیں بابو جی، نہیں میں ریچھ بھیڑیا نہیں ہوں۔شری ناتھ بہروپیا ہوں۔''اندر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔بھٹا چاریہ مہاشہ کھڑاؤں ہاتھ میں لئے سب سے آگے دوڑ پڑے......''حرامزادے تجھے ڈرانے کے لیے اور کوئی جگہ نہ ملی؟''پھوپھا جی نے نہایت غصہ کے عالم میں حکم دیا۔''سالے کو کان سے پکڑ کر لاؤ۔''

کشور سنگھ نے اسے سب سے پہلے دیکھا تھا۔اس لیے اس کا دعویٰ سب سے مضبوط تھا۔وہ گیا اور اس کے کان پکڑ کر گھسیٹا ہوا لے آیا۔بھٹا چاریہ اس کی پیٹھ پر زور زور سے کھڑاؤں مارنے لگے۔اور غصے کے جوش میں دنا دن ہندی بولنے لگے۔

''اسی حرامزادے، بدذات کی وجہ سے میری ہڈی پسلی چور ہوگئی ہے سالے پوربیوں نے گھونسے مار مار کر میرا کچومر نکال دیا۔''

شری ناتھ کا گھر باراست میں تھا۔وہ ہر سال انہیں دنوں ایک مرتبہ اپنا کاروبار کرنے کیلئے آیا کرتا تھا۔کل بھی وہ اس گھر میں نارو بنکو گانا سنا گیا تھا۔

وہ کبھی بٹا چاریہ کے اور کبھی پھوپھا جی کے پاؤں پڑنے لگا بولا ..... لڑکوں نے اتنا زیادہ شور و غل مچا دیا کہ میں خود بھی ڈر کے مارے اس درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ سوچا تھا کہ کچھ سکون ہونے پر باہر آ کر اپنا سوانگ دکھا کر چلا جاؤں گا مگر معاملہ اس قدر پیچیدہ ہوتا گیا کہ میری پھر ہمت ہی نہ ہوئی۔"

شری ناتھ منت سماجت کرنے لگا، لیکن پھوپھا جی کا غصہ کم ہوا ہی نہیں بوا جی خود اوپر سے بولیں۔ "تمہاری قسمت اچھی تھی جو سچ مچ کا بھیڑیا نہیں نکلا۔ ورنہ جیسے بہادر تم اور تمہارے دربان ہیں ..... چھوڑ دو بیچارے کو، اور دور کر دو ڈیوڑھی کے ان پوربی دربانوں کو ..... ایک ذرا سے لڑکے میں جو ہمت ہے وہ گھر بھر کے تمام آدمیوں میں مل کر بھی نہیں ہے۔"

پھوپھا جی نے کوئی بات نہ سنی بلکہ انہوں نے بوا جی کے اس الزام پر آنکھیں گھما کر ایسا ظاہر کیا گویا خواہش کرتے ہی وہ ان سب باتوں کا کافی اور صحیح صحیح جواب دے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ عورتوں کی باتوں کا جواب دینے کی کوشش کرنا بھی مردوں کی توہین ہے اس لیے اور بھی گرم ہو کر حکم دیا ..... "اس کی دم کاٹ ڈالو۔" پھر اس کی رنگین کپڑے سے لپٹی ہوئی اور گھاس کی بنی ہوئی لمبی دم کاٹ ڈالی گئی اور اس کو بھگا دیا گیا۔ بوا جی اوپر سے غصہ سے بولیں۔ "دم کو رکھ چھوڑو کسی وقت کام آئیگی۔"

اندر نے میری طرف دیکھ کر کہا ..... "معلوم ہوتا ہے تم اسی مکان میں رہتے ہو شری کانت!"

میں نے کہا ..... ہاں، تم اتنی رات کو کہاں جا رہے تھے؟"

اندر ہنس کر بولا ..... "رات کہاں ہے رے، ابھی تو شام ہوئی ہے۔ میں جاتا ہوں اپنی کشتی پر مچھلی پکڑنے چلنا ہے؟"

میں نے ڈر کر پوچھا ..... "اتنی زبردست تاریکی میں ناؤ پر چڑھو گے؟"

وہ پھر ہنسا ..... بولا ..... "ڈر کیا ہے رے۔ اسی میں تو لطف ہے۔ اس کے علاوہ اندھیرا ہوتے بغیر مچھلیاں ملتی کہاں ہیں؟ تیرنا جانتا ہے تو؟"

"خوب جانتا ہوں۔"

"تو پھر چل بھائی!" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ..... "میں تنہا اتنے بہاؤ میں اس طرف کو ناؤ نہیں لے جا سکتا ..... ایسے ہی کسی تلاش میں تھا جو ڈرے نہ۔"

میں نے پھر کچھ نہ کہا ..... اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے چپ چاپ راستے پر آ پہنچا۔ پہلے تو مجھ خود اپنے آپ پر ہی یقین نہ ہوا کہ سچ مچ ہی اس رات میں ناؤ چلانے جا رہا ہوں۔ کیونکہ جس دعوت کی کشش سے اس سنسان اور ڈراؤنی رات میں گھر کے تمام انتظامات اور نگرانی کو ہیچ سمجھ کر تنہا باہر چلا آیا۔ وہ کتنی زبردست کشش تھی۔ اس بات پر غور کرنا اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ کچھ زیادہ وقت صرف کیے بغیر گوسائیں باغ کے اس مہیب جنگلی راستہ کے سامنے آ نکلا اور اندر کا پیچھا کرتا ہوا سحر خوردہ کی مانند اس کو طے کر کے گنگا کے ساحل پر جا پہنچا۔

کنکر پتھروں کا کھڑا کنارہ تھا۔ سر کے اوپر ایک نہایت ہی قدیم برگد کا درخت مجسم تاریکی بن کر سامنے کھڑا تھا۔ اور اسی کے قریب تیس ہاتھ نیچے انتہائی تاریک سطح میں برسات کا جوشیلا بہاؤ چٹانوں سے ٹکرا کر بھنور بناتا ہوا کافی تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دیکھا کہ اس جگہ پر اندر کی چھوٹی سی ناؤ بندھی ہوئی ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوا گویا اس خوب تیز بہاؤ کے منبع پر کیلے کے پھول کا ایک چھوٹا سا چھلکا لگاتار ٹکرا ٹکرا کر اپنی ہستی کھو رہا ہے۔

میں خود بھی ڈرپوک نہ تھا مگر اندر نے جب اوپر نیچے تک لٹکتا ہوا ایک رسہ دکھا کر کہا ......

"ناؤ کے اس رسہ کو پکڑ کر چپ چاپ نیچے اتر جا۔ ذرا احتیاط سے اترنا۔ پھسل گیا تو پھر ڈھونڈنے پر بھی تیرا نشان نہ ملے گا۔" تو فی الحقیقت میری چھاتی دھڑک اٹھی۔ معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے پھر بھی میرے لئے تو رسے کا سہارا ہے۔ "لیکن تم کیا کرو گے؟"

اس نے کہا۔ "تیرے نیچے اترتے ہی میں رسہ کھول دوں گا اور پھر نیچے اتر دوں گا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ میرے اترنے کے لیے بہت گھاس اور جڑیں موجود ہیں۔"

اور کچھ نہ کہہ کر میں رسے کے سہارے نہایت احتیاط کے ساتھ بمشکل تمام نیچے اتر کر کشتی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے رسہ کھول دیا اور جھول گیا۔ وہ کسی شے کے سہارے نیچے اترنے لگا۔ اس بات کو میں آج تک بھی نہیں جانتا۔ ڈر کے مارے میرے چھاتی اتنے زور سے دھڑکنے لگی تھی کہ اس کی طرف میں دیکھ بھی نہ سکا۔ دو تین منٹ تک کافی تیز بہاؤ کی پرشور گرج کے سوا کوئی بھی آواز سنائی نہ دی۔ یکا یک ایک ہلکی سی ہنسی کی آواز سے منہ گھمایا تو دیکھتا ہوں کہ اندر نے دونوں ہاتھوں سے ناؤ کو زور سے دھکا دے کر ٹھیل دیا ہے اور خود کود کر اس پر چڑھ بیٹھا۔ بیچاری ناؤ ایک چکر سا کھا کر تیزی سے بہنے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد گرد و پیش گہری تاریکی سے محیط ہو کر اس میں چاروں اطراف غائب ہو گئیں۔ رہ گئی دائیں یا بائیں طرف دونوں ساحلوں تک پھیلی ہوئی بے پایاں پانی کی پرجوش دھار اور اس کے اوپر خوب تیزی سے چلنے والی وہ چھوٹی سی ناؤ اور اس پر دونو جوان لڑکے۔ اگرچہ قدرت کے اس منظر کو اچھی طرح سمجھنے کی وہ عمر نہ تھی۔ تاہم میں اسے آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ سنسان، خاموش اور تاریک رات کی ایک عظیم شکل تھی۔ اس کے گھناؤنے سیاہ بالوں سے زمین و آسمان ڈھک چکے تھے۔ اور اس مہیب تاریکی کا پردہ پھاڑ کر خونخوار داڑھوں کی قطار کی مانند اس بے پایاں پانی کے تیز بہاؤ سے گویا ایک قسم کی عجیب و غریب کرن بے رمانہ دبی ہوئی ہنسی کی طرح بکھری رہی تھی۔ آس پاس اور سامنے کہیں تو پانی کا بے خود بہاؤ سطح میں جا کر اور اوپر کی طرف جا کر پھٹ پڑتا تھا۔ اور کہیں کہیں باہمی مخالف سمتوں میں ٹکر کھا کر چکر کھا رہا تھا اور کہیں دیوانہ وار دوڑا جا رہا تھا۔

ہماری کشتی ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف جا رہی تھی۔ فقط اتنا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اس پار کی لامحدود تاریکی میں کونسی جگہ مقرر کر کے اندر چپو پکڑے بیٹھا ہے۔ یہ میں بالکل ہی نہ جانتا تھا۔ اس عمر میں وہ کتنا کامیاب ملاح بن گیا ہے۔ اس کا میں اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک وہ بولا۔

''کیوں رے شری کانت، ڈر لگتا ہے کیا؟''

میں بولا...... ''نہیں''

اندر خوش ہو کر بولا...... ''یہی تو چاہئے۔ جب تیرنا آتا ہے تو پھر ڈر کس بات کا؟'' جواب میں، میں نے ایک مختصر سی آہ کو دبا کر کہ وہ سن نہ لے مگر ایسی گہری تاریک رات میں، اتنے پانی اور اس قدر بے پناہ بہاؤ میں تیرنا جاننے اور نہ جاننے میں کیا فرق ہے؟ یہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ اس نے بھی اور کوئی بات نہ کہی۔ بہت دیر تک اسی طرح چلتے رہتے کے بعد کہیں سے کچھ آواز سی آئی۔ جو کہ مبہم اور

مدھم سی تھی۔ لیکن جوں جوں ناؤ بڑھنے لگی وہ آواز صاف اور زیادہ زوردار ہونے لگی۔ گویا لوگوں کا بہت دور سے آتا ہوا بلاوا ہو۔ گویا کتنی ہی مشکلات اور تکالیف کو پار کر کے، ہٹا کر وہ ہمارے کانوں تک پہنچا ہو۔ وہ بلاوا تھکا ماندہ تھا۔ پھر بھی اسی میں وقفہ تھا نہ اختلاف ہی، گویا ان کا غصہ نہ تو کم ہوتا تھا اور نہ زیادہ ہی اور نہ تھمنا ہی چاہتا تھا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ دفعہ جھپ جھپ آواز بھی ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا...... ''اندر یہ کس چیز کی آواز سنائی دیتی ہے؟'' اس نے ناؤ کا رخ کچھ اور سیدھا کر کے کہا......

''پانی کے بہاؤ کے زور سے اس طرف کے کنارے ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ یہ اسی کی آواز ہے۔''

میں نے پوچھا...... ''کتنے بڑے کنارے ہیں اور کیا بہاؤ ہے؟''

''بڑا خطرناک بہاؤ ہے اوہ! اسی لئے تو...... کل بارش ہوئی تھی۔ آج اس کے نیچے نہ جایا جائیگا۔ کہیں ایک بھی کنارہ گر پڑا تو کشتی اور ہم دونوں پس جائیں گے۔ اچھا تو ڈنڈا چلا سکتا ہے نا؟''

''چلا سکتا ہوں''

''تو چلا''

میں نے ڈانڈ چلانا شروع کیا۔ اندر نے کہا...... ''وہی...... وہی تو، جو بائیں طرف کالا کالا نظر آتا ہے۔ وہ چڑا[1] ہے۔ اس کے درمیان میں سے ہو کر ایک نہر گئی ہے۔ اسی میں سے نکل کر جانا ہوگا۔ لیکن بہت آہستہ، اگر کہیں ملاحوں کو اس بات کا ذرا سا بھی علم ہو گیا تو پھر زندہ واپس نہ لوٹ سکیں گے۔ وہ بانس کی مار سے سر پھوڑ کر اسی کیچڑ میں گاڑ دینگے۔''

''یہ کیا؟'' میں نے ڈرتے ہوئے کہا...... ''تو پھر اس نہر میں سے ہو کر مت چلو۔'' اندر نے شاید کچھ ہنس کر کہا...... ''اور تو کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اس کے اندر ہو کر تو جانا ہی ہوگا جزیرہ کی بائیں طرف کی مٹی کو دھکیل کر تو جہاز بھی نہیں جا سکتا۔ پھر ہم کیسے جائیں گے؟ لوٹتے وقت واپس آ سکتے ہیں لیکن جا نہیں سکتے۔''

''تو پھر مچھلیوں کے چرانے کی ضرورت نہیں ہے بھیا۔'' کہہ کر میں نے ڈانڈ اوپر اٹھا لیا۔ چشم زدن میں ناؤ چکر کھا کر لوٹ چلی۔ اندر جھنجھلا اٹھا۔ اس نے آہستہ سے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر آیا کیوں چل تجھے واپس پہنچا آؤں، بزدل کہیں کا، اس وقت میں نے چودہ سال پورے کر کے پندرھویں میں قدم رکھا تھا...... میں بزدل؟ فوراً ڈانڈ کو پانی میں پھینک کر جی جان سے کھیلنے لگا۔ اندر خوش ہو کر بولا...... ''یہی تو چاہئے مگر بھائی، آہستہ آہستہ چلاؤ۔ سالے بہت پاجی ہیں۔ میں جھاؤ کے جنگل کے قریب مکئی کے کھیتوں میں سے ہو کر اس طرح بچا کر لے چلوں گا کہ سالوں کو ذرا بھی خبر نہ ہوگی۔'' پھر کچھ

1. دریا میں میلے پانی کی مٹی جم کر جو جزیرے سے بن جاتے ہیں۔ انہیں چڑا کہتے ہیں۔

ہنس کر بولا...... ''ارے اگر سالوں کو پتہ لگ بھی گیا تو کیا؟ پکڑ لینا کیا اتنا آسان ہے؟ دیکھ شری کانت کچھ بھی ڈر نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ان لوگوں کی چار کشتیاں ہیں لیکن اگر یہ دیکھا کہ گھر ہی گئے ہیں اور بھاگ جانے کا کوئی چارہ نہیں ہے تو فوراً کود کر ڈبکی لگا جانا اور جتنی دور تک ممکن ہو جا کر نکلنا۔ بس کام بن جائیگا۔ اس تاریکی میں دیکھ سکنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد مزے سے ستویا کے ٹیلے پر چڑھ کر صبح کے وقت تیر کر اس پار آ جائیں گے۔ اور گنگا کے کنارے کنارے گھر پہنچ جائیں گے۔ بس پھر کیا کر سکیں گے سالے ہمارا۔''

یہ نام میں نے سنا تھا کہا...... ''ستویا کا ٹیلہ تو بالکل نالے کے مقابل ہے وہ تو بہت دور ہے۔''

اندر نے بے اعتنائی سے کہا...... ''کہاں بہت دور ہے؟ چھ سات کوس بھی تو نہ ہوگا۔ تیرتے تیرے ہاتھ تھک جائیں تو چت ہو کر ستا لینا۔ اس کے علاوہ مردے جلانے کے کام آئے ہوئے بہت سے بڑے بڑے لکڑ بھی تو بہتے مل جائیں گے۔''

جان بچانے کا جو آسان طریقہ تھا وہ اس نے بتا دیا۔ اس میں اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ایسی تاریک رات، جس میں اطراف کا نام ونشان تک نظر نہ آتا تھا۔ اور اس تیز بہاؤ میں جس میں جا بجا گرداب پڑ رہے تھے۔ سات کوس تک تیرتے جانا اور پھر صبح ہونے کا انتظار کرنا۔ صبح سے پیشتر اس طرف کنارے پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں۔ دس پندرہ ہاتھ سیدھا ریت کا کنارہ ہے جو ٹوٹ کر سر پر آ سکتا ہے۔ اور اسی طرف گنگا کا بہاؤ نہایت تیزی سے بہہ رہا ہے۔

حالات کی نزاکت کا احساس کر کے میرے وسیع اور بہادر دل سکڑ کر بوند جیسا ہو گیا۔ کچھ دیر تک ڈانڈ چلا کر میں بولا...... ''لیکن ہماری ناؤ کا کیا ہوگا؟''

''اس دن بھی میں بالکل اسی طرح بھاگا تھا۔ اور اس کے دوسرے ہی دن آ کر ناؤ نکال لے گیا۔ کہہ دیا تھا کہ گھاٹ پر سے کشتی چرا کر اور کوئی لے گیا ہوگا میں نہیں لایا۔''

تو یہ سب اس کا خیال ہی نہیں ہے۔ بالکل آزمودہ نسخہ ہے۔ رفتہ رفتہ کشتی خلیج کے سامنے آ پہنچی۔ معلوم ہوا کہ ملاحوں کی کشتیاں قطار باندھ کر خلیج کے منبع پر کھڑی ہیں اور ان میں چراغ بھی ٹمٹما رہے ہیں۔ دو ٹیلوں کے درمیان کا یہ بہاؤ نہر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ہم لوگ گھوم کر نہر کے دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔ اس جگہ پانی کے بہاؤ کے بے شمار منبع بن گئے تھے۔ اور جنگلی جھاؤ کے پودوں نے باہم ایک دوسرے کو اوٹ میں کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک کے اندر سے ہو کر کچھ ہی دور جانے کے بعد ہم نہر میں داخل ہو گئے ملاحوں کی کشتیاں وہاں سے بہت دور کھڑی ہوئی کالی جھاڑیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اور بھی کچھ دور جانے پر ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

ملاحوں نے یہ سمجھ کر کہ نہر کا بڑا دروازہ محفوظ ہے اس جگہ پر پہرہ نہیں رکھا تھا۔ اسے ''مایا جال'' کہتے ہیں۔ نہر میں جن دنوں پانی رہتا ہے۔ تو اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک اونچے اونچے لٹھ مضبوطی سے گاڑ دیئے جاتے ہیں اور ان کے باہر کی طرف جال لٹکا دیا جاتا ہے۔ بعد میں برسات کے دنوں میں جب پانی کے بہاؤ میں بڑے بڑے روہو، کاتلا وغیرہ مچھ بہ کر آتے ہیں تو ان لٹھوں سے رک کر وہ کود کر دوسری طرف آ جانا چاہتے ہیں اور رسی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

دس پندرہ بیس سیر کے پانچ چھ روہو، کاتلا مچھ دم بھر میں پکڑ کر اندر نے ناؤ پر رکھ دیئے۔ جسیم مچھ راج اپنی دم کی پھنکار سے ہماری اس چھوٹی سی ناؤ کو تہ و بالا کرنے لگے۔ اور ان کے اوچھل کود کی آواز بھی کچھ کم نہ تھی۔

''اتنی مچھلیوں کو کیا کرو گے بھائی؟''

''ضرورت ہے۔ بس اب اور نہیں۔ چلو بھاگ چلیں۔'' کہہ کر اس نے جال چھوڑ دیا۔ اب ڈانڈ چلانے کی ضرورت نہ رہی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اسی طرح چوری چھپے اسی راستہ سے باہر ہونا تھا۔ مطابق بہاؤ میں دو تین منٹ تیز رفتار سے بہنے کے بعد اچانک ایک جگہ پر دھکا کھا کر ہمارے وہ چھوٹی سی ناؤ مکئی کے ایک کھیت میں داخل ہو گئی۔ اس کے اس بے موقعہ راستہ تبدیل کر لینے سے میں نے حیران ہو کر پوچھا...... ''کیوں؟ کیا ہوا؟''

اندر نے ایک دھکا دے کر اسے کچھ اور بھی اندر لے جاتے ہوئے کہا...... ''خاموش! سالوں کو علم ہو گیا ہے...... چار کشتیاں کھول کر سالے یہیں آ رہے ہیں۔ وہ دیکھو۔'' اندر سچ ہی کہہ رہا تھا۔ زور کے ساتھ پانی کو کاٹتی اور چھپ چھپ آواز کرتی ہوئی تین کشتیاں ہمیں نگل جانے کے لیے سیاہ فام بھوتوں کی طرح دوڑی آ رہی ہیں۔ اس طرف تو جال سے راستہ بند تھا۔ اور اس طرف سے یہ لوگ آ رہے تھے۔ بھاگ کر چھٹکارہ پانے کی ذرا سی بھی فرصت نہ تھی۔ مکئی کے اس کھیت میں اپنے آپ کو چھپایا جا سکے گا؟ یہ بھی مجھے ممکن معلوم نہ ہوا۔

''اب کیا ہوگا بھائی''...... کہتے کہتے میرا گلا رندھ گیا۔ ''اس تاریکی میں، اس پنجرے کے اندر یہ لوگ اگر ہمارا خون کر کے بھی اس کھیت میں دبا دیں۔ تو نہیں کون روکے گا۔''

''اس سے پیشتر پانچ چھ مرتبہ ''چوری کا فن بڑا فن ہے'' اس بات کو باثبوت ثابت کر کے صاف نکل گیا تھا۔ اتنے دن تعاقب کیا جانے پر بھی ہاتھ نہیں آیا تھا مگر آج......''

اس نے زبان سے تو کہا کہ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' لیکن گویا اس کا لہجہ لرز اٹھا۔ پھر بھی وہ رکا نہیں۔ پوری طاقت سے چپو دھکیل کر آہستہ آہستہ اندر چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ تمام کا تمام

پانی ہو رہا تھا۔ اس کے اوپر آٹھ آٹھ دس دس ہاتھ لمبے مکئی اور جوار کے پودے تھے اور اندر ہم دونوں ہور۔ کسی جگہ تو پانی چھاتی تک تھا اور کہیں کمر تک اور کہیں گھٹنوں سے زیادہ نہیں۔ سر پر لامحدود تاریکی اور گے پیچھے دائیں بائیں گھنا جنگل۔ ڈانڈ کیچڑ میں دھنسنے لگی۔ اور ناؤ اب ایک ہاتھ بھی آگے بڑھنے سے نکار کرنے لگی۔ پیچھے کی طرف سے ملاحوں کی بات چیت کی مبہم سی آواز کانوں میں آنے لگی۔ اس بات میں اب رتی بھر شک وشبہ نہ تھا کہ ضرور کسی شبہ کی بنا پر ہی وہ لوگ چلے آئے ہیں اور اب بھی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

دفعتہً ناؤ ایک طرف کچھ جھک کر سیدھی ہو گئی ہے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ میں اکیلا ہی رہ گیا ہوں۔ دوسرا ساتھی نہیں ہے۔ ڈرتے ہوئے میں نے آواز دی...... ''اندر'' پانچ چھ ہاتھ دور جنگل میں سے آواز آئی...... ''میں نیچے ہوں۔''

''نیچے کیوں؟''

ناؤ کو کھینچ کر نکالنا ہوگا میری کمر سے رسی بندھی ہے۔''

''کھینچ کر کہاں۔ لے جاؤ گے؟''

''اس گنگا میں تھوڑی ہی دور لے جانے پر بڑا بہاؤ مل جائیگا۔''

سن کر میں خاموش ہو گیا۔ ناؤ آگے بڑھنے لگی۔ اچانک کچھ دور جنگل میں سے کنستر پیٹنے اور پھٹنے بانس کی پھٹا پھٹ آواز سے میں چونکا۔ ڈرتے ہوئے میں نے پوچھا'' وہ کیا ہے بھائی؟''

''رکھوالے مچان پر بیٹھے ہوئے جنگلی سؤروں کو بھگا رہے ہیں۔''

''جنگلی سؤر! کہاں ہیں وہ؟'' اندر ناؤ کھینچتے ہوئے لاپرواہی سے بولا...... ''مجھے کیا نظر آتا ہے جو تمہیں بتاؤں۔ ہونگے یہیں کہیں'' جواب سن کر میں چپ ہو رہا۔ سوچا کس کا منہ دیکھا تھا آج صبح۔ شام ہی تو آج گھر کے اندر بھیڑیئے کے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اب اگر اس جنگل میں جنگلی سؤروں کے ہاتھ جاؤں تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ پھر سوچا میں تو کشتی میں بیٹھا ہوا ہوں مگر یہ انسانی چھاتی تک کیچڑ اور نی میں اس جنگل میں کھڑا ہے۔ ایک قدم ہلنے جلنے کا راستہ بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ اسی طرح سوچتے سوچتے گزر گئے۔ اور بھی ایک بات پر میری نگاہ تھی۔ اکثر دیکھا تھا کہ قریب ہی کسی نہ کسی جوار یا مکئی کے پودے کا بالائی حصہ یکا یک ہلنے لگتا تھا۔ اور چھپ چھپ آواز ہوتی تھی۔ ایک دفعہ تو میرے ہاتھ کے پاس ہی حرکت ہوئی۔ مشکوک ہو کر اس طرف میں نے اندر کی توجہ کشش کی کہ ''بڑا سؤر تو نہ سہی کوئی بچہ سؤر تو نہیں ہے؟''

اندر نے نہایت ہی آہستہ آواز میں جواب دیا...... ''وہ کچھ نہیں سانپ لپٹے ہیں۔ آہٹ پا کر پانی میں کود پڑے ہیں۔''

''کچھ نہیں۔ سانپ''! کانپ کر میں کشتی میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور حیران ہو کر پوچھا...... ''کیسے سانپ ہیں بھائی!''

اندر نے کہا...... ''سب قسم کے سانپ ہیں۔ ٹونڈا۔ بونڈا۔ کوڑیال کالے دغیرہ۔ پانی میں بہتے بہتے آئے اور جھاڑیوں میں لپٹے رہے۔ کہیں بھی تو انچ بھر خشک زمین نہیں ہے دیکھتے نہیں ہو؟''

''یہ تو دیکھتا ہوں۔'' خوف کے مارے میرے پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس بھلے مانس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اپنا کام کرتے کرتے ہی وہ کہنے لگا۔ ''دو تین تو میرے ہی جسم کو چھوتے ہوئے بھاگ گئے ہیں۔ کئی ایک تو خوب موٹے ہیں۔ مگر یہ کاٹتے نہیں۔ یہ خود ہی ڈر کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹونڈا بونڈا ہونگے اور اگر بفرض محال کاٹ بھی جائیں تو کیا کیا جا سکتا ہے مرنا تو ایک دن ہوگا بھائی۔'' اسی طرح وہ اور بھی کچھ اپنے قدرتی اور شیریں گلے سے کہتا رہا۔ میرے کانوں تک کچھ تو پہنچا اور کچھ نہ پہنچا۔ میں خاموش اور بے حس وحرکت کاٹھ کی پتلی کی طرح ایک ہی جگہ پر ایک ہی جذبہ سے متاثر ہوئے بیٹھا رہا۔ سانس لینے میں بھی ڈر معلوم ہوتا تھا...... ''چھپ'' سے کہیں کوئی میری کشتی میں ہی نہ آ گرے!

اور خواہ جو ہو لیکن وہ کیسا آدمی ہے؟ انسان، دیوتا، بھوت وہ کیا ہے؟ کس کے ساتھ میں اس جنگل میں گھوم رہا ہوں۔ اگر انسان ہے تو کیا وہ نہیں جانتا کہ اتنی عظیم کائنات میں خوف نام کی بھی کوئی شئے ہوتی ہے؟ اس کا دل کیا پتھر کا بنا ہوا ہے؟ کیا وہ ہماری ہی طرح سکڑتا پھیلتا بھی ہے؟ تو پھر اس دن کھیل کے میدان میں، سب کے بھاگ جانے پر، بالکل اجنبی ہوتے ہوئے بھی، مجھ اکیلے کو صحیح وسالم باہر نکال دینے کے لیے دشمنوں کے درمیان وہ جو گھس آیا تھا۔ رحم دلی اور ہمدردی کا وہ جذبہ بھی کیا اس پتھر دل میں پنہاں ہے؟ اور آج مصیبت کا تمام حال رائی رائی، تل تل جانتے ہوئے بھی، سنتے ہوئے بھی، چپ چاپ لاپرواہی سے وہ اس موت کے منہ میں کھڑا ہے۔ ایک مرتبہ منہ سے یہ بھی نہیں کہا کہ شری کانت بھائی ایک بار تو بھی نیچے اتر آ، وہ تو مجھے جبراً نیچے اتروا کر کشتی کھنچوا سکتا تھا۔ یہ محض کھیل ہی تو نہیں ہے۔ زندگی اور موت کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر اس عمر میں اتنا ایثار کتنے انسانوں نے کیا ہے؟ کسی نمائش کے بغیر اس نے کتنے قدرتی لہجہ میں کہہ دیا کہ ''مرنا تو ایک دن ہوگا ہی بھائی۔'' ایسی صداقت کہتے ہوئے کتنے لوگ دکھائی دیتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ اس مصیبت میں وہی مجھے کھینچ لایا تھا۔ تاہم اس کے اتنے بڑے ایثار کو میں انسان ہو کر بھی کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں؟ کس طرح فراموش کر دوں اسے۔ جس کے دل سے اتنا عظیم جذبہ اتنی آسانی سے امڈ پڑا۔ اس دل کو کس نے کس شے سے

بنایا ہوگا؟ اس کے بعد کتنی مدت، کتنے آرام اور مصیبتوں سے گزر کر میں آج بوڑھا ہوا ہوں۔ کتنے ملک، کتنے صوبے، کتنے ندی نالے، پہاڑ پربت، بن جنگل گھوما پھرا ہوں۔ قسم قسم کے انسان ان دو آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے ہیں لیکن اتنا عظیم انسان تو بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن وہ اب نہیں رہا۔ گویا وہ پانی کے ایک بلبلے کی طرح لامحدود میں مل گیا۔ آج اس کی یاد آتے ہی دونوں آنکھیں بھر آتی ہیں۔ محض ایک فضول سا فخر دل کی سطح پر جھاگ کی طرح تیرتا نظر آتا ہے۔ اے پروردگار، تو نے اس عجیب و غریب اور لاثانی مخلوق کو کس لیے پیدا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ اور اس طرح بیکار کر کے اسے واپس کیوں بلا لیا میرا درد آشنا دل آج بیتاب ہو کر بار بار یہی سوال کرتا ہے۔ بھگوان! روپیہ پیسہ، دھن دولت، علم و عقل، تو اپنے انمول خزانہ سے انبار کے انبار تقسیم کرتے ہوئے تمہیں دیکھتا ہوں۔ لیکن ایسی عظیم شخصیتیں آج تک تم کتنی عطا کر سکے ہو؟ خیر جانے دو اس بات کو۔ گہرے پانی کا زوردار بہاؤ ہر لحظہ قریب سے قریب تر آتا رہا تھا۔ اس بات کو میں اچھی طرح جان رہا تھا۔ اس لیے مزید سوال کیے بغیر میں نے سمجھ لیا کہ اس خوفناک جنگل میں، ہی وہ زوردار بہاؤ بہہ رہا ہے۔ جس کو سٹیمر بھی پار نہیں کر سکتے۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ پانی کا زور بڑھ رہا ہے اور زرد رنگ کی جھاگ پر ریت کے ٹیلوں کا گمان ہو رہا ہے۔ اندر ناؤ پر چڑھ گیا اور ڈانڈ کو ہاتھ میں لے کر سامنے کے دیوانہ وار بہاؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ وہ بولا...... ''اب کوئی تشویش نہیں ہے۔ ہم بڑی گنگا میں آ پہنچے ہیں۔'' دل ہی دل میں کہا...... ''اب ڈر نہیں ہے تو اچھا ہی ہے مگر تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟ یہ تو میں سمجھا ہی نہیں۔'' لمحہ بھر بعد ہی ناؤ ایک بار گویا سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اور چشم زدن میں، میں نے دیکھا کہ وہ بڑی گنگا کے بہاؤ میں بجلی کی سی رفتار سے دوڑی جا رہی ہے۔ اس وقت اڑتے ہوئے بادلوں کی اوٹ میں ایسا معلوم ہوا۔ گویا چاند طلوع ہو رہا ہو۔ کیونکہ جس اندھیرے میں ہم اب تک سفر کرتے آ رہے تھے۔ وہ اندھیرا اب نہ رہا تھا۔ اب بہت دور تک اگرچہ صاف طور پر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے دیکھا جنگلی جھاؤ اور مکئی جوار کا ٹیلا دائیں طرف چھوڑ کر ہماری ناؤ سیدھی جا رہی تھی۔

❁......❁

''بڑے زور سے نیند آ رہی ہے اندر! اب گھر لوٹ چلو بھائی۔''

اندر نے کچھ ہنس کر بالکل نسوانی پیار کی طرح شیریں لہجہ میں کہا۔

''نیند آنے کی تو بات ہی ہے بھیا! لیکن کیا کیا جائے شری کانت! آج تو کچھ دیر ہو گی ہے۔ ابھی بہت کام بقایا پڑا ہے۔ اچھا ایسا کرو اسی جگہ تھوڑا سا لیٹ لو۔''

دوبارہ اصرار کی ضرورت ہی نہ رہی۔ میں سمٹ سمٹا کر اسی جگہ لیٹ گیا مگر نیند نہ آئی۔ نیم وا آنکھوں سے میں چپ چاپ آسمان میں بادلوں اور چاند کی آنکھ مچولی دیکھنے لگا۔ یہ ڈوبا وہ نکلا۔ پھر ڈوبا پھر ہنسا۔ اور کانوں میں پانی کے بہاؤ کا وہی شور سنائی دینے لگا۔ یہ ایک ہی بات اکثر میرے دل میں آیا کرتی ہے کہ اس دن میں سب کچھ بھول کر میں اس طرح بادل اور چاند کے درمیان کیسے ڈوب گیا تھا...... بالکل محو ہو کر چاند دیکھنے کی عمر تو اس وقت میری نہ تھی۔ مگر بڑے بڑے لوگ زمین کی گردش وغیرہ سے کئی نتیجے اخذ کیا کرتے ہیں کہ یہ ظاہر چاند کچھ بھی نہیں ہے۔ بادل بھی کچھ نہیں ہے۔ سب دھوکہ ہے سب وہم ہے فی الحقیقت اگر کوئی شئے ہے تو وہ ہے صرف اپنا دل۔ وہ جب جس کو جو کچھ دکھاتا ہے محو ہو کر وہ صرف وہی دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ میری بھی یہی حالت ہے۔ اتنے زبردست حادثات سے اس طرح صحیح و سالم بچ کر باہر نکل آنے کے بعد میرا مردہ سا دل اس وقت شاید ایسی ہی کسی ایک سکون پرور تصویر میں چین حاصل کرنا چاہتا تھا۔

گھنٹہ دو گھنٹے نکل گئے اور مجھے ان کی کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔ یکا یک مجھے معلوم ہوا کہ چاند بادلوں میں ایک طویل ڈبکی لگا گیا ہے۔ اور دائیں طرف سے جا کر بائیں طرف اپنا سر نکال رہا ہے۔ گردن ذرا اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ناؤ اب اس طرف جانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ کچھ پوچھنے یا کہنے کا اس وقت مجھے ذرا سا خیال باقی نہ تھا۔ اس لیے میں پھر بدستور لیٹ رہا۔ پھر وہی آنکھ بھر کر چاند دیکھنے کا کھیل اور کان بھر کر بہاؤ کی گرج سننے لگا۔ شاید اسی طرح ایک گھنٹہ اور بھی گزر گیا۔

کھس کھس ریت کے ٹیلے پر ناؤ ٹکرائی۔ چونک کر میں اٹھ بیٹھا ارے، یہ تو اس پار آ پہنچے۔ مگر یہ جگہ کون سی ہے؟ میرا گھر کتنی دور ہے؟ ریت کے انبار کے سوا تو اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ سوال کرنے سے پیشتر ہی یکا یک کہیں پاس سے ہی کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر میں اور بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یقیناً قریب ہی کہیں کوئی بستی ہے۔

اندر بولا...... ''ذرا ٹھہر شری کانت! میں تھوڑا سا گھوم کر ابھی آ جاؤں گا۔ تجھے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کنارے کے اس پار ہی ملاحوں کے مکان ہیں۔''

حوصلہ کی اتنی زیادہ آزمائشیں پاس کرنے کے بعد آخر کار یہاں پہنچ کر فیل ہو جانے کی میری بالکل ہی خواہش نہ ہوئی اور خصوصاً انسان کی اس جواں سالی میں جس کی مانند عظیم حیرت افزا شئے دنیا بھر میں شاید اور کوئی نہیں ہے ایک تو یونہی انسان کی ظاہرہ نقل و حرکت نا قابل تسخیر ہوتی ہے اور پھر جواں لڑکے اور لڑکی کے دل کا جذبہ تو میں سمجھتا ہوں بالکل ہی نا قابلِ تسخیر ہے۔ اسی لیے شاید برندابن کے ان جواں دیوانوں کی جواں فکر داستان مدتوں سے دلوں میں کیف برسا رہی ہے۔ عقل کے ذریعہ تسلیم نہ کر سکنے کی وجہ سے کسی نے اسے کہا...... ''اچھی'' کسی نے کہا...... ''بری'' کسی نے اسے پالیٹکس کہا۔ کسی نے کچھ اور...... کسی نے کوئی بات بھی نہ سنی وہ بحث و تمحیص کی حدود سے پار ہو گئے جو پار ہو گئے وہ غرق ہو گئے۔ پاگل بن گئے اور ناچ کر، رو کر، گا کر سب کچھ یکساں کر کے دنیا کو گویا انہوں نے ایک اچھا خاصا پاگل خانہ بنا چھوڑا۔ تو جن لوگوں نے ''بری'' کہہ کر گالیاں دی تھیں انہوں نے بھی کہا کہ اور خواہ کچھ بھی ہو مگر اس کیف کا سرچشمہ دوسری جگہ کہیں نہیں ہے۔ جن کی طبیعت کے ساتھ اس داستان کا میلان نہیں ہوتا تھا انہوں نے بھی قبول کیا کہ ان پاگلوں کے گروہ کو چھوڑ کر ہم نے ایسا گانا اور کہیں نہیں سنا۔ مگر یہ واقعہ جس بنیاد پر قائم ہوا جو ازلی اور ابدی ہے اور ساتھ ہی ہمیشہ نئی بھی...... برندابن کے بن بن میں ہونے والی جوانی کی اس حسین داستان کا خاتمہ آج تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ جن کے نزدیک دیانت ہیچ و پوچ ہے اور مکتی کی خواہش جن کی نگاہ میں قلزم کے مقابلہ میں ایک حقیر بوند کی مانند ہے نہ کسی نے کبھی حاصل کیا ہے اور نہ کبھی کوئی تلاش کر سکے گا۔ اس لئے تو میں نے کہا تھا کہ اس وقت میں وہی جواں سال تھا۔ گو اس وقت جوانی کی پختگی اور اس کا نور نہ آیا تھا۔ تاہم اس پر ناز کرنا تو سیکھ گیا تھا۔ خودستائی کا جذبہ تو دل میں بیدار ہوا تھا۔ اس وقت اپنے دوست کے نزدیک اپنے آپ کو بزدل ثابت کرنا کون برداشت کر سکے گا۔ اس لئے میں نے اسی دم جواب دیا۔ ''میں ڈروں گا کیوں؟ جاؤ'' اندر نے اور دوسرا لفظ ضائع نہ کیا اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا غائب ہو گیا۔

سر پر نور اور تاریکی میں وہ آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ پشت کی طرف بہت دور تک لہروں کی گرج سنائی دے رہی تھی اور سامنے وہی ریت کا کنارہ تھا۔ یہ کون سا مقام ہے سوچ ہی رہا تھا کہ اندر دوڑتا ہوا آ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا...... ''تجھ سے ایک بات کہنے کے لئے واپس آیا ہوں'' اگر کوئی مچھلی مانگنے کے لئے آئے تو خبردار دینا نہیں۔ کہے دیتا ہوں خبردار، ہرگز نہ دینا، کہنا تیرے منہ پر خاک، مرضی ہو تو خود ہی اٹھا لے جا خبردار ہاتھ سے کسی کو اٹھا کر نہ دینا۔ خواہ میں بھی کیوں نہ ہوں۔ خبردار۔''

''یہ کیوں بھائی؟''

''واپس آنے پر بتاؤں گا۔ لیکن خبردار......'' یہ کہتے کہتے وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح دوڑتا ہوا چلا گیا۔

اس مرتبہ سر سے پاؤں تک میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ جسم کی تمام شریانوں میں برف کا پانی بہہ رہا ہے۔ میں بالکل بچہ ہی بچہ تو تھا نہیں جو اس کے اشارے کا مطلب بالکل ہی سمجھ نہ سکتا۔ میری زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں جن کے مقابلہ میں یہ واقعہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح بحر ناپیدا کنار کے مقابلہ میں گائے کے کھر کے گڑھے میں بھرا ہوا پانی۔ مگر پھر بھی اس رات کے سفر میں جو خوف اور ڈر میں نے محسوس کیا اسے الفاظ کے ذریعہ ادا کرنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہوش و حواس گم کرنے کے آخری زینہ پر آ کر ہی میں نے قدم رکھ دیا ہے۔ اور ہر لحہ یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ کنارے کے اس طرف سے گویا کوئی بار بار جھانک کر دیکھ رہا ہے۔ جونہی میں ترچھی نظر سے دیکھتا ہوں وہ سر نیچا کر کے چھپ جاتا ہے۔

وقت کتنا نہیں تھا ایسا معلوم ہوتا تھا صدیاں گزر چکی ہیں اور اندر واپس لوٹ کر نہیں آیا۔

ایسا معلوم ہوا کہ کسی انسان کی آواز سنی ہو۔ جنیؤ کو انگوٹھی میں سینکڑوں بار لپیٹ کر، منہ نیچا اور کان کھڑے کر کے سننے لگا۔ گلے کی آواز رفتہ رفتہ صاف ہونے لگی۔ اچھی طرح معلوم ہونے لگا کہ دو تین شخص بات چیت کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اندر ہے اور باقی دو ہندوستانی وہ خواہ کوئی بھی ہوں مگر ان کے چہرے دیکھنے سے پہلے میں نے یہ اچھی طرح دیکھ لیا کہ چاندنی میں ان کا سایہ زمین پر پڑتا ہے یا نہیں کیونکہ اس حقیقت کو میں بچپن سے ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں (بھوتوں) کا سایہ نہیں ہوتا۔

آہ یہ تو سایہ ہے۔ گو صاف نہیں مگر پھر بھی سایہ تو ہے۔ اس دن دنیا بھر میں کسی بھی انسان نے کسی بھی شے کو دیکھ کر مجھ سا سکون حاصل کیا تھا؟ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ بات تو میں شرط باندھ کر کہہ سکتا ہوں کہ نگاہ کی انتہائی مسرت جسے کہتے ہیں۔ وہ یہی ہے۔ جو لوگ آئے انہوں نے نہایت تیزی سے ان بڑے بڑے مچھروں کو کشتی سے اٹھا کر جال کی قسم کے کپڑے کے ایک ٹکڑے میں باندھ لیا اور

اس کے عوض میں انہوں نے اندر کی مٹھی میں جو کچھ تھما دیا۔ اس کے کھن کی ایک آواز کے دلکش لفظ سے اپنا تعارف بھی میرے سامنے پوری طرح پوشیدہ نہ رہنے دیا۔

اندر نے ناؤ کھول دی۔ لیکن بہاؤ میں نہ چھوڑی۔ بہاؤ کے قریب بہاؤ کے خلاف بانس چلاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

میں نے کوئی بات نہ کہی۔ کیونکہ میرا دل اس وقت اس کے خلاف نفرت اور بے اعتنائی کے جذبہ سے لبالب بھر گیا تھا۔ مگر یہ کیا؟ ابھی ابھی تو اسے چاند کی روشنی میں سایہ ڈال کر لوٹتے ہوئے دیکھ کر بیتابانہ محبت سے دوڑ کر سینے سے لگا لینے کے لئے بے قرار ہو اٹھا تھا۔

ہاں تو انسان کی فطرت ہی اس قسم کی ہے۔ ذرا سا عیب دیکھتے ہی لمحہ بھر پیشتر کی تمام باتیں بھول جاتی ہیں اور اس میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ رام! رام! اس نے اس طرح روپے حاصل کئے۔ اب تک مچھلی چرانے کا یہ بیوپار میرے دل میں بہت نمایاں طور پر چوری کی شکل میں شاید جگہ نہ پا سکا تھا کیونکہ لڑکپن سے ہی روپے پیسوں کی چوری ہی حقیقی چوری تھی۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو کھن کی آواز کے کان میں داخل ہوتے ہی اتنی دیر کی بہادری، دیدہ دلیری سب کچھ چشم زدن میں ہی خشک تنکے کی طرح ہوا نہ ہو جاتی۔ اگر ان مچھووں کو گنگا میں پھینک دیا جاتا...... یا کچھ اور کیا جاتا صرف روپوؤں کے ساتھ ہی ان کا کوئی تعلق پیدا نہ ہوتا تو اگر ہماری اس تفریح کو کوئی چوری کہہ کر پکارتا تو شاید غصّے میں آ کر اس کا سر پھوڑ ڈالتا اور سمجھتا کہ اس کو حقیقت میں جو سزا ملنی چاہئے وہی اسے ملی ہے...... مگر رام! رام! یہ کام۔ یہ کام تو جیل خانے کے قیدی کیا کرتے ہیں۔

اندر نے بات شروع کی...... پوچھا...... ''تمہیں کچھ بھی ڈر محسوس نہیں ہوا کیوں رے شری کانت!''

میں نے مختصر جواب دیا...... ''نہیں۔''

اندر بولا...... ''مگر تیرے سوائے وہاں اور کوئی بیٹھا نہ رہ سکتا یہ جانتا ہے تو۔ تجھے میں خوب پیار کرتا ہوں...... میرا ایسا دوست اور کوئی نہیں ہے جب کبھی بھی میں آؤں گا۔ صرف تجھے ہی ساتھ لاؤں گا، کیوں؟''

میں نے جواب نہ دیا۔ مگر اسی وقت اس کے چہرے پر بادلوں کی زد سے حال ہی میں آزاد ہوئے چاند کی جو کرن پڑی اور اس سے اس کے چہرے پر جو کچھ نظر آیا۔ اس سے متاثر ہو کر یکا یک میں اپنا اتنی دیر کا سب غم و غصہ بھول گیا۔ میں نے پوچھا۔

''اچھا اندر تم نے کبھی ان سب کو دیکھا ہے؟''

''کن سب کو؟''

''وہی جو کچھ مانگنے آتے ہیں۔''

''نہیں بھائی دیکھا تو نہیں۔ لیکن لوگ جو کہتے ہیں وہ سنا ہے۔''

''اچھا تم یہاں اکیلے آ سکتے ہو؟''

''خوف معلوم نہیں ہوتا؟''

''نہیں، رام کا نام لیتا ہوں پھر وہ کسی طرح نہیں آ سکتے۔''

کچھ دیر رک کر پھر کہنا شروع کیا۔ ''رام نام کیا کوئی معمولی شے ہے اگر تو رام کا نام لیتے ہوئے سانپ کے منہ میں بھی چلا جائے تو تیرا کچھ نہ بگڑے گا۔ دیکھے گا کہ مارے ڈر کے سبھی راستہ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ مگر ڈرنے سے کام نہیں چلتا۔ پھر تو وہ جان جاتے ہیں کہ یہ صرف چالاکی کر رہا ہے۔ وہ سب غیب کا علم جو جانتے ہیں۔''

ریت کا کنارہ ختم ہوتے ہی کنکروں کا کنارہ شروع ہو گیا۔ اس طرف کی نسبت اس طرف پانی کی رفتار کم تھی۔ بلکہ یہاں تو ایسا معلوم ہوا گویا بہاؤ برعکس سمت جا رہا ہے۔ اندر نے بانس اٹھا کر چتوار ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا...... ''وہ جو سامنے جنگل سا نظر آ رہا ہے۔ اسی میں سے ہو کر ہمیں جانا ہے۔ یہاں ذرا میں اتروں گا۔ جاؤں گا اور آ جاؤں گا۔ دیر نہ لگے گی کیا خیال ہے اتر جاؤں؟''

خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے کہا...... ''اچھا'' کیونکہ نہ کہنے کا راستہ تو ایک طرح سے میں خود ہی بند کر چکا تھا اور اب اندر بھی شاید میری بے خوفی کا قائل ہو چکا تھا۔ لیکن یہ بات مجھے معلوم نہ ہوئی۔ یہاں سے وہ جگہ جنگل کی مانند ایسی تاریک نظر آ رہی تھی کہ ابھی ابھی رام نام کی غیر معمولی فضیلت سننے پر بھی اس تاریک رات میں برگد کے اس پرانے درخت نے نیچے کشتی پر تنہا بیٹھ کر اتنی رات گزرے رام نام کی طاقت کی آزمائش کرنے کی میری ذرا سی بھی خواہش نہ ہوئی۔ اور جسم میں کپکپی سی ہونے لگی۔ یہ درست ہے کہ مچھلیاں اب اور نہیں تھیں۔ اس لئے مچھلیاں مانگنے والوں کا نشان دگمان بھی نہ ہو سکے گا۔ لیکن ان سب کا لالچ صرف مچھلیوں کے لئے ہی ہے یہ بھی کون کہہ سکتا ہے۔ انسان کی گردن مروڑ کر تازہ تازہ خون پینے اور گوشت کھانے کی داستان بھی کئی مرتبہ سن چکا ہوں۔''

بہاؤ کی مطابقت اور ڈانڈ کے زور سے ناؤ آگے بڑھنے لگی اور بھی کچھ دور جاتے ہی، داہنی طرف گردن تک ڈوبا ہوا جنگلی جھاؤ اور کانس کا جنگل سر اٹھا کر ہم دو بہادر بچوں کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھتا رہا۔ اور اس میں سے کوئی کوئی جھاڑ تو سر ہلا کر گویا ''اندر آنے کی اجازت نہیں'' کا حکم دینے لگا۔ بائیں طرف بھی ان ہی کے بھائی بند خوب اونچے پتھریلے کناروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بھی اسی

طرح دیکھتے رہے اور اسی طرح منع کرنے لگے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ان کا حکم کبھی نہ ٹالتا لیکن میرا رہنما بھی تو موجود تھا۔ اس کے نزدیک تو ہر قسم کی اجازت اور ممانعت صرف ایک رام نام کے زور سے ہی بیکار ہو جاتی۔ اس نے کسی کی طرف اپنی بھوں تک نہ پھرائی۔ دائیں طرف کے ٹیلے کے زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے یہ جگہ ایک جھیل سی بن گئی تھی۔ صرف مشرق کی طرف کا منہ کھلا ہوا تھا میں نے پوچھا...... ''اچھا کشتی کو باندھ کر اوپر جانے کے لئے گھاٹ تو ہے ہی نہیں۔ تم کس طرح جاؤ گے؟''

اندر بولا...... ''یہ جو بڑ کا درخت ہے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گھاٹ ہے۔''

کچھ دیر سے گاہے گاہے ہوا کے ساتھ کسی قسم کی نامعلوم بدبو ناک تک آ رہی تھی۔ یکا یک ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ وہ بدبو اتنی قریب ہو کر ناک میں گھسی کہ اس کا برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ جتنا ہی آگے بڑھتے تھے۔ اتنی ہی وہ بھی بڑھتی تھی۔ ناک پر کپڑا دبائے ہوئے میں نے کہا...... ''یقیناً ہی کچھ سڑ گیا ہے اندر!''

اندر بولا...... ''مردے سڑ رہے ہیں۔ آج کل مہلک ملیریا پھیل رہا ہے۔ اسی لئے تو لاشوں کو جلایا نہیں جا سکتا۔ منہ پر تھوڑی سی آگ لگا کر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ گیدڑ اور کتے کھاتے ہیں اور وہ پڑی پڑی سڑتی رہتی ہیں۔ انہیں کی تو اتنی سخت بدبو ہے۔''

''لاشوں کو کس جگہ پھینک جاتے ہیں بھیا؟''

''وہاں سے لے کر یہاں تک...... سب ہی تو شمشان ہے۔ جہاں چاہے پھینک دیتے ہیں اور اس بڑ کے نیچے گھاٹ پر نہا کر واپس گھر چلے جاتے ہیں...... ارے ڈر، ڈر کیا ہے رہے۔ وہ گیدڑ گیدڑ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اچھا آ میرے پاس بیٹھ۔''

میرے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ کسی طرح میں گھسٹ کر اس کی گود کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا۔ دم بھر کے لئے مجھے چھو کر اور ہنس کر بولا...... ''ڈر کیا ہے شری کانت! کتنی ہی مرتبہ رات کو میں اسی راستے سے آیا گیا ہوں۔ تین دفعہ رام کا نام لینے سے پھر کس کی طاقت ہے جو پاس تک بھی بھٹکے؟''

اسے چھو کر گویا میرے جسم میں بھی جان آ گئی۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا...... ''نہیں بھائی! تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ یہاں کہیں بھی مت اترو...... سیدھے ہی چلو۔''

اس نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا...... ''نہیں شری کانت! ایک دفعہ جانا ہی پڑے گا۔ یہ روپے دیئے بغیر کام نہ چلے گا...... وہ بیٹھے راہ دیکھ رہے ہوں گے...... میں تین دن سے نہیں جا سکا۔''

''روپے کل نہ دے سکو گے بھائی؟''

''نہیں بھائی، ایسی بات نہ کہو، میرے ساتھ تو بھی چل۔ لیکن کسی کو یہ بات ہرگز نہ بتانا۔''

میں آہستہ سے ''نہ'' کہہ کر بدستور اسے چھوئے ہوئے پتھر کی مانند بیٹھا رہا۔ گلا خشک ہو کر لکڑی ہو گیا تھا۔ لیکن ہاتھ بڑھا کر پانی پی لوں یا ہلنے جلنے کی کوئی کوشش کروں یہ طاقت مجھ میں باقی نہ رہی۔

درختوں کے سایہ کے درمیان آ جانے سے قریب ہی وہ گھاٹ نظر آنے لگا۔ جس مقام پر ہمیں نیچے اترنا تھا وہ جگہ اوپر درخت وغیرہ نہ ہونے سے دھندلی چاندنی کی روشنی میں خوب چمک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اتنی پریشانی میں بھی مجھے ایک مسرت کا احساس ہوا۔ گھاٹ کے کنکروں کے ساتھ کشتی ٹکرا نہ جائے۔ اس لئے اندر پیشتر ہی اترنے کے لئے تیار ہو کر کشتی کے کنارے تک کھسک آیا تھا۔ کنارے لگتے ہی وہ اوپر سے کود پڑا۔ مگر کودتے ہی وہ خوفزدہ آواز میں ''اف'' کہہ اٹھا۔ میں اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس لئے دونوں کی نگاہ اس شے پر تقریباً ایک ہی ساتھ پڑی۔ اس وقت وہ نیچے تھا اور میں کشتی کے اوپر۔

میری زندگی میں بے وقت اور ناگہانی موت، کبھی اس قدر دردناک شکل میں نظر نہ آئی تھی۔ وہ کس قدر سوہان روح ہوا کرتی ہے۔ یہ بات اس طرح نہ دیکھی جائے تو شاید اور کسی طرح سمجھی ہی نہیں جا سکتی۔ سنجیدہ رات میں ہر چہار اطراف خاموشی سے معمور تھیں۔ محض شمشان میں رہنے والے گیدڑوں کا بھوک سے بے تاب ہو کر چلانا اور درختوں پر سوئے ہوئے بڑے بڑے پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ یا بہت دور تیز پانی کے بہاؤ کی ''ہو ہو'' آواز اس سناٹے کو گاہے گاہے توڑتی تھی۔ ان سب کے درمیان بے حس و حرکت اور خاموش ہم کھڑے رہے۔ ایک چھ سات سال کی عمر کا گورا اور خوبصورت موٹا تازہ بچہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ جس کا تمام جسم پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور صرف سر ہی گھاٹ کے اوپر تھا۔ شاید گیدڑ ابھی بھی اسے پانی سے نکال رہے تھے۔ اور اب صرف ہماری غیر متوقع آمد سے کہیں پاس ہی کھڑے ہوئے ہمارے جانے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اس کو مرے ہوئے زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے ہوئے ہوں گے۔ گویا وہ بیچارہ مہلک ہیضہ کی سخت اذیت برداشت کر کے ماں گنگا کی گود میں ہی سو رہا تھا۔ اور ماں بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے نرم اور خوبصورت جسم کو اپنی گود سے اتار کر بچھونے پر سلا رہی تھی۔ اس طرح کچھ پانی اور کچھ خشکی پر پڑے ہوئے اس سوتے ہوئے بچے کے جسم پر ہماری نظر پڑی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ اندر کی دونوں آنکھوں سے سیل اشک جاری ہے۔ وہ بولا...... ''تو ذرا ہٹ کے کھڑا ہو جا شری کانت! اس بیچارے کو ناؤ میں رکھ کر ٹیلے کے اس پار کے جنگل میں رکھ آتا ہوں۔''

یہ سچ ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مگر اس چھونے اور اٹھانے وغیرہ کی تجویز سے میں یکبارگی مضمحل ہو اٹھا۔ اس بات کو میں نامنظور نہیں کرتا کہ

دوسروں کے دکھ سے دکھی ہو کر آنکھوں سے آنسو بہانا آسان کام نہیں ہے لیکن اسی وجہ سے اس کی مصیبت میں دونوں ہاتھ بڑھا کر شامل ہو جانا بہت مشکل امر ہے۔ اس وقت چھوٹی بڑی نامعلوم کتنی جگہوں پر دباؤ پڑتا ہے۔ اول تو میں روئے زمین کی سب سے افضل قوم ہندو گھرانے میں وشٹ وغیرہ کے مقدس خون کا وارث ہو کر پیدا ہوا۔ اس لئے پیدائشی رواجوں کے مطابق میں نے سیکھ رکھا تھا کہ مردہ اجسام کو چھونا بھی ایک بہت بڑا خطرناک کاروبار ہے۔ دوسرے ہمارے شاستروں نے اس کے لئے کتنی زبردست ممانعت کر رکھی ہے اور کتنی قسم کے کرم کانڈوں کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ یہ کس بیماری سے مرا ہے؟ کس کا لڑکا ہے؟ کس قوم کا ہے؟ وغیرہ کچھ بھی نہ جانتے ہوئے اور مرنے کے بعد یہ ٹھیک طور سے باقاعدہ طور سے باقاعدہ آخری رسم ادا کر کے گھر سے باہر ہوا تھا یا نہیں۔ اس بات کا پتہ لئے بغیر ہی اسے کس طرح چھوا جا سکتا ہے؟

اداس ہو کر جونہی میں نے پوچھا...... "کس قوم کا مردہ ہے اور کیا تم اسے چھوؤ گے؟" کہ آگے بڑھ کر اندر نے ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے اور دوسرا ہاتھ گھٹنوں کے نیچے دے کر اسے خشک تنکے کی مانند اٹھا لیا اور کہا...... "ورنہ بیچارے کو گیدڑ نوچ نوچ کر کھا جائیں۔"

اس کے منہ سے تو ابھی تک دوائیوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ کہتے کہتے اس نے ناؤ
جس پر پہلے میں سویا ہوا تھا۔ اسے لٹا دیا اور ناؤ کو دھکیل کر خود بھی چڑھ گیا۔ بولا......
مردے کی بھی کوئی قوم ہوتی ہے۔"
میں نے اعتراض کیا...... "کیوں نہیں ہوتی؟"

اندر نے جواب دیا...... "ارے تو یہ مردہ ہے۔ مرے ہوئے کی ذات کیا؟ یہ تو ویسے ہی ہے جیسے ہماری یہ کشتی...... اس کی بھلا کیا ذات ہے؟ آم یا جامن جس کسی بھی لکڑی کی یہ بنی ہو...... اب تو اسے کشتی کے علاوہ کوئی بھی نہیں کہے گا کہ آم ہے یا جامن؟ سمجھا کہ نہیں؟ یہ بھی اسی طرح ہے۔"

اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیل محض بچوں کی سی نہیں تھی۔ لیکن دل میں یہ بھی تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہیں کہیں اس میں ایک تلخ حقیقت بھی پنہاں ہے۔ گاہے گاہے وہ ایسی ہی کھری کھری کہہ جایا کرتا تھا اس لئے میں نے کئی مرتبہ سوچا ہے کہ اس عمر میں کسی سے بھی علم حاصل کئے بغیر بلکہ مروجہ تعلیم کو بھی ترک کر کے، ان سب رموز کو اس نے کہاں سے سیکھا؟ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میں نے اس کا جواب بھی حال کر لیا ہے۔ مکر و فریب تو گویا اندر میں تھا ہی نہیں۔ مقصد کو درپردہ رکھ کر تو وہ کوئی کام کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں۔ اس کے دل کا وہ انفرادی حقیقت پسند جذبہ کسی غیبی اصول کے ماتحت عالمگیر سچائی کو مجسم بنا کر خود بخود بآسانی اسے اپنی طرف کشش کر کے

روح میں جذب کر لیتا تھا۔ اس کی پاکیزہ اور سلیم عقل کامل استاد کی امیدواری کئے بغیر ہی تمام معاملہ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لیتی تھی۔ درحقیقت بے ریا اور سلیم عقل ہی تو دنیا میں افضل و اکمل عقل ہے اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں۔ اچھی طرح دیکھنے سے وہم (باطل) نام کی کسی بھی شے کا وجود اس لامحدود کائنات میں نظر نہیں آتا۔ باطل تو صرف انسان کے ماننے اور منانے کا انجام محض ہے۔ سونے کو پیتل تسلیم کر لینا بھی باطل ہے اور تسلیم کرانا بھی ...... یہ میرا ایمان ہے۔ لیکن اس سے سونے یا پیتل کا کچھ بگڑتا بنتا نہیں۔ تمہاری جو مرضی ہو اسے مانتے پھر۔ وہ تو جو کچھ ہے وہی رہے گا۔ سونا سمجھ کر اسے صندوق میں بند کر کے رکھنے سے اس کی حقیقی قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اور پیتل کہہ کر باہر پھینک دینے سے اس کی قیمت کم نہیں ہو جاتی۔ اس دن بھی وہ پیتل تھا اور آج بھی پیتل ہے۔ تمہارے باطل کے لئے تمہیں چھوڑ کرنہ اور کوئی جوابدہ ہے اور اس پر کوئی اعتراض ہی کرتا ہے۔ اس لامحدود کائنات کی ہر ایک شے حقیقت ہے۔ باطل کا وجود اگر کہیں ہے تو وہ انسان کے دل کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ اس لئے اندر نے اس باطل کو اپنے دل میں دیدہ دانستہ یا نادانستہ کسی دن بھی جب جگہ نہیں دی۔ تو اگر اس کی سلیم عقل نیکی اور حقیقت کو ہی حال کرتی ہے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے؟

لیکن یہ بات اس کے لئے حیرت افزا نہ ہونے پر بھی میرا یہ دعوی نہیں کہ کسی کے لئے بھی حیرت افزا نہیں ہے۔ اسی بہانہ میں نے اپنی زندگی میں ہی اس کا جو ثبوت حاصل کیا ہے۔ اس کا بیان کر دینے کی خواہش کو ترک کر دینا میرے لئے ناممکن ہے۔

مندرجہ بالا واقعہ کے دس بارہ سال بعد اچانک شام کے وقت یہ طلاع ملی کہ بوڑھی برہمنی اس محلے میں صبح سے مری پڑی ہے...... کسی طرح بھی لوگ اس کے کریا کرم کے لئے اکٹھے نہیں ہوتے۔ لوگوں کے جمع نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کاشی کی یاترا سے لوٹتے وقت راہ میں بیمار ہو گئی اور اس شہر میں گاڑی سے اترنے کے بعد بالکل معمولی تعارف ہونے کے باعث جن کے گھر میں وہ ٹھہری تھی اور دو رات وہاں ٹھہر کر جان بحق ہوئی وہ حضرت ولایت سے لوٹے ہوئے تھے۔ اور برادری سے الگ تھے۔ بڑھیا کا یہی جرم تھا کہ اسے بالکل بے سروسامانی اور کسمپرسی کی حالت میں بھی، برادری سے خاج، اس گھر میں مرنا پڑا۔

خیر نذر آتش کر کے دوسرے دن صبح آ کر میں نے دیکھا کہ ہر ایک گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ سننے میں آیا کہ گزشتہ رات گیارہ بجے تک ہری کین لالٹین ہاتھ میں لئے پنچ لوگوں نے گھر گھر گھوم کر فیصلہ دے دیا۔ کہ شاستر کے بالکل برعکس کام کرنے کی وجہ سے ان کو سر منڈانا ہوگا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا ہوگا اور ایک ایسی شے (گوبر) کھانی ہوگی جو پاکیزہ ہوتے ہوئے بھی انسانی خوراک نہیں

ہے۔ انہوں نے گھر گھر جا کر صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دھرم شاستر کے خلاف کوئی بھی فعل نہ ہونے دیں گے۔ ہم لوگ اور کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گئے۔ وہ ہی اس شہر میں قابل ترین معالج تھے اور بلا فیس ہی بنگالیوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ ہماری کہانی سن کر ڈاکٹر صاحب غصے سے سلگ اٹھے اور کہنے لگے...... ''جو لوگ اوروں کو اس طرح ستاتے ہیں ان کے گھروں میں اگر کوئی میری آنکھوں کے سامنے بغیر علاج کے مرتا بھی ہوگا۔ تو میں اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔''

نامعلوم کس نے یہ بات پنچوں کے کانوں تک پہنچا دی۔ بس شام ہونے سے پیشتر ہی میں نے سنا کے سر منڈانے کی ضرورت نہیں رہی۔ صرف قصور تسلیم کر کے اس شے کو کھا لینے محض کام چل جائے گا۔ اس بات کو نامنظور کرنے پر دوسرے دن صبح یہ سنا گیا کہ صرف قصور تسلیم کر لینا ہی کافی ہوگا۔ اس شے کو کھانے کی ضرورت نہیں۔ اور جب اس بات کو بھی نامنظور کیا گیا۔ تو یہ سننے میں آیا کہ چونکہ ہم لوگوں کا یہ پہلا قصور ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے یوں ہی معاف کر دیا ہے۔ کفارہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر دو دن تک انہیں جو تکلیف دی گئی ہے۔ اس کے لئے اگر ہر ایک شخص آ کر معافی نہ مانگے گا تو پھر وہ جیسا پہلا کہہ چکے ہیں ویسا ہی کریں گے۔ یعنی کسی کے بھی گھر نہ جائیں گے۔'' اس کے بعد اسی دن سر شام سے ہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ایک ایک کر کے تمام بوڑھے پنچوں کی آمد شروع ہوگئی۔ آشیر واد دے کر انہوں نے کیا کہا اسے تو میں سن نہ سکا۔ لیکن دوسرے دن دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا غصہ فرو ہو چکا ہے اور ہم لوگوں کے کفارہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

خیر جانے دو۔ کیا عرض کر رہا تھا۔ اور کیا بات درمیان میں آ پڑی۔ لیکن خواہ جو کچھ بھی ہو۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ سمجھدار ناظرین اس نام اور مکان سے محروم تذکرہ سے پوری پوری سچائی حاصل کر سکیں گے۔ میرے عرض کرنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اندر نے اس کم سنی میں ہی اپنی اندرونی ضمیر میں جس حقیقت کو مجسم کر لیا تھا اتنے بڑے بڑے پنچ سردار اتنی بڑی عمر تک بھی اس کا کوئی راز نہ سمجھ سکے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب اس دن ان کے شاستر گیان کا اسی طرح علاج نہ کر دیتے تو ان کی اس مرضی کا علاج کبھی ہو سکتا یا نہ ہو سکتا۔ یہ بھگوان ہی جانیں۔

ٹیلے پر آ کر آدھے ڈوبے ہوئے جنگلی جھاؤ کے اندھیرے میں پانی کے اوپر اس اجنبی بچے کے جسم کو اندر نے جب ایک عجیب پیار کے ساتھ رکھ دیا۔ تو رات زیادہ نہ تھی۔ کچھ دیر تک وہ اس لاش کی طرف سر جھکائے رہا اور جب بالآخر اس نے منہ اٹھا کر دیکھا۔ تو دھندلی چاندنی میں اس کے چہرے کا جتنا بھی حصہ نظر آیا۔ وہ نہایت اداس تھا اور اس کے خشک منہ پر بالکل ویسا ہی جذبہ نمودار ہو رہا تھا جیسے کوئی کان اٹھا کر کسی کی راہ میں دیکھ رہا ہو۔

میں بولا...... ''اندر اب چلو۔''

اندر محو حیرت ہو کر بولا...... ''کہاں؟''

''ابھی جہاں چلنے کے لئے تم نے کہا تھا۔''

''رہنے دو آج نہیں جاؤں گا۔''

میں خوش ہو کر بولا...... ''ٹھیک یہی بہتر ہے بھائی! چلو گھر چلیں۔''

جواب میں اندر میرے منہ کی طرف دیکھ کر بولا...... ''ہاں رے شری کانت! مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے؟''

میں نے فی الفور جواب دیا...... ''نہیں بھائی میں کیا جانوں کیا ہوتا ہے۔ اب تو تم گھر چلو...... وہ سو سورگ چلے جاتے ہیں بھیا۔ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ تم مجھے......''

اندر نے گویا سنا ہی نہ ہو اور کہا...... ''سب لوگ تو سورگ جا نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ وقت تک تو ہر ایک کو یہاں رہنا پڑتا ہے دیکھو میں نے اس کو پانی کے اوپر سلا دیا تھا تو اس نے آہستہ سے صاف صاف کہا تھا بھیا۔'' میں کانپتے ہوئے لہجہ میں روتے ہوئے بول اٹھا...... ''مجھے خواہ مخواہ ڈرا رہے ہو تم! بھائی میں بیہوش ہو جاؤں گا۔'' اندر نے نہ تو کچھ کہا اور نہ ہی مجھے کسی طرح کی تسلی دی۔ آہستہ سے ڈانڈ کو ہاتھ میں لے کر اس نے کشتی کو جھاؤ کے جنگل سے باہر کر لیا۔ اور پھر سیدھا چلانے لگا۔ منٹ یا دو منٹ خاموش رہ کر اس نے سنجیدہ اور شیریں لہجہ میں کہا...... ''شری کانت! دل ہی دل میں رام کا نام لے، وہ کشتی چھوڑ کر نہیں گیا ہے...... ہمارے پیچھے ہی بیٹھا ہے۔''

اس کے بعد میں اسی جگہ منہ ڈھانپ کر اوندھا ہو گیا تھا۔ پھر مجھے خبر نہیں رہی جب آنکھ کھلی تو اندھیرا نہیں تھا۔ کشتی کنارے پر لگی ہوئی تھی۔ اندر میرے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا تھا بولا...... ''اب قدرے چلنا ہوگا شری کانت اٹھ بیٹھ۔''

❀......❀

پاؤں تو کسی طرح اٹھتے ہی نہ تھے تاہم کسی طرح گنگا کے ساحل کے ساتھ چلتے چلتے صبح کے وقت گلنار آنکھیں اور نہایت خشک اور اداس چہرہ لے کر گھر پہنچا گھر میں ایک جوش وخروش امڈ پڑا۔ ''یہ آیا یہ آیا'' کہہ کر سب یک زبان ہو کر اس طرح چلا اٹھے کہ میری روح قبض ہونے کی تیاری کرنے لگی۔

جتین تقریباً تقریباً میرا ہم عصر تھا۔ اس لئے اس کی مسرت کی انتہا بھی نہ تھی۔ کہیں سے دوڑتا ہوا وہ آیا اور آ گیا شری کانت! یہ آ گیا منجھلے بھیا۔ اس قسم کی والہانہ بے خودی سے چلاتا ہوا گھر کی چھت کو پھاڑتا ہوا میری آمد کا اعلان کرنے لگا۔ اور چشم زدن کی بھی تاخیر کئے بغیر اس نے کمال احترام سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے بیٹھک کے پا انداز پر لا کھڑا کیا۔ وہاں منجھلے بھیا نہایت یکسوئی سے امتحان پاس کرنے کی تیاریوں میں محو تھے۔ سر اٹھا کر تھوڑی سی دیر میری طرف دیکھ کر انہوں نے پھر پڑھنے میں دل لگا لیا یعنی شیر شکار کو اپنے قبضہ میں کر لینے کے بعد کسی تنہا اور محفوظ مقام میں بیٹھا ہو۔ مجھے سزا دینے کا ایک اچھا اور سنہری موقعہ ان کی قسمت میں پہلے بھی کبھی ملا تھا یا نہیں اس میں شک ہے۔

منٹ بھر تک وہ خاموش رہے۔ تمام رات باہر بسر کرنے کی وجہ سے دونوں کانوں اور گالوں پر جو حادثہ رونما ہوگا اسے بخوبی جانتا تھا۔ لیکن اب اور زیادہ دیر کھڑا بھی نہ رہ سکتا تھا اور ادھر ''فاعل'' صاحب کو بھی تو فرصت نہ تھی۔ وہ بھی تو امتحان پاس کرنے کی تیاریوں میں منہمک تھے۔

ہمارے ان منجھلے بھیا کو شاید قارئین اتنی جلدی بھولے نہ ہوں گے۔ یہ وہی حضرت ہیں جن کی کڑی نگرانی میں کل شام کو ہم سب مطالعہ کر رہے تھے۔ اور لمحہ بھر بعد ہی نہایت سنجیدگی سے ''اوں اوں'' آواز اور چراغ دان الٹا دینے کی چوٹ گزشتہ رات اس ''دی رائل بنگال'' کو بھی حواس باختہ ہو کر ایک مرتبہ انار کے درخت پر پناہ لینی پڑی تھی۔

''پہنچا تک (پتری) تو دیکھ رہے شیش آج اس وقت بینگن کھانا اچھا ہے یا نہیں'' کہتی ہوئی عقب کے دروازہ کو کھول کر بوا جی نے جوں ہی گھر میں قدم رکھا ویسے ہی مجھے دیکھتے ہی دم بخود رہ گئیں۔

''کب آیا رے؟ کہاں چلا گیا؟ آفرین ہے لڑکے تجھ پر...... تمام رات نیند نہیں آئی...... سوچ سوچ کر مر گئی...... اس اندر کے ساتھ چپکے سے جو باہر گیا تو پھر دکھائی ہی نہ دیا۔ نہ کھانا نہ پینا۔ کہاں تھا بول تو ارے کمبخت، چہرہ سیاہ پڑ گیا ہے؟ آنکھیں لال چھلچھلا رہی ہیں۔ کہتی ہوں بخار تو نہیں چڑھ آیا ہے۔ ذرا پاس تو آ۔ دیکھوں تو تیری نبض'' ایک ساتھ سوالات کی ایک جھڑی لگا کر بوا خود ہی آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بول اٹھیں...... ''جو سوچا تا آخر وہی ہوا نا۔ نبض خوب گرم ہے۔ ایسے لڑکوں کے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر جل بچھوا (کاٹھ) لگا دیا جائے تو تبھی کچھ چین ہو۔ پہلے تجھے گھر سے بالکل ہی نکال کر پھر کوئی دوسرا کام کروں گی۔ چل اندر جا کر سو جا۔ پاجی۔'' وہ بینگن کھانے کے سوال کو بالکل ہی بھول گئیں۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی گود میں کھینچ لیا۔

منجھلے بھیا نے بادل کی طرح سنجیدہ لہجہ میں صرف اتنا ہی کہا...... ''ابھی یہ جا نہ سکے گا۔''

''کیوں یہاں کیا کرے گا؟ نہیں نہیں اس وقت اب اس کا پڑھنا لکھنا نہ ہوگا۔ پہلے دو لقمے کھا کر کچھ سو لے...... آ میرے ساتھ۔'' کہہ کر بوا جی مجھے لے کر چلنے لگیں۔

لیکن شکار تو ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ منجھے بھیا وقت اور مقام کا خیال بھول گئے زور سے چلا اٹھے اور دھمکا کر بولے۔ ''خبردار کہتا ہوں یہاں سے مت جا شری کانت! بوا تب کچھ چونک اٹھیں اس کے بعد منہ پھیر کر منجھلے بھیا کی طرف دیکھ کر محض اتنا ہی کہا...... شیش!''

بوا جی سنجیدہ مزاج عورت تھیں۔ تمام گھر ان سے ڈرتا تھا۔ منجھلے بھیا تو اس ایک تیکھی نظر سے ہی ڈر کے مارے سٹپٹا گئے اور پھر پاس ہی کے کمرے میں بڑے بھیا بھی بیٹھے تھے۔ بات کہیں ان کے کان تک جا پہنچی تو پھر خیر نہ تھی۔

بوا جی کے مزاج میں ایک بات اور بھی ہم دیکھتے آ رہے تھے۔ کبھی کسی بھی وجہ سے وہ شور وغل مچا کر لوگوں کو جمع کر لینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ہزار غصہ ہونے پر بھی وہ کبھی زور سے نہیں بولتی تھیں وہ بولیں...... ''معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ہی ڈر سے یہ یہاں کھڑا ہے۔ دیکھ شیش وقتاً فوقتاً سنا کرتی ہوں کہ تو بچوں کو مارتا پیٹتا ہے۔ آج سے اگر کبھی کسی کو ہاتھ بھی لگایا اور مجھے اس کا علم ہو گیا تو یاد رکھ اسی کھمبے سے بندھوا کر نوکر کے ہاتھ سے تجھے بید لگواؤں گی۔ کوئی پڑھے خواہ نہ پڑھے۔ آئندہ تو کسی سے بھی باز پرس نہ کر سکے گا۔''

اتنا کہہ کر جس راستے پر آئی تھیں اسی راستے مجھے لے کر وہ چلی گئیں۔ منجھلے بھیا اپنا سا منہ لئے بیٹھے رہے۔ اس بات کو منجھلے بھیا اچھی طرح جانتے تھے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔

مجھے اپنے ساتھ لئے بوا اپنے کمرے میں آئیں۔ میرے کپڑے تبدیل کروائے۔ پھر پیٹ بھر گرم گرم جلیبیاں کھلائیں۔ بستر پر سلا دیا اور یہ بات اچھی طرح واضح کر کے باہر سے کنڈی لگا کر چلی گئیں کہ میں مر جاؤں تو ان کے عضو ناکارہ ہو جائیں۔

پانچ منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ کنڈی کھول کر چھوٹا بھائی ہانپتا ہوا آیا اور میرے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ مسرت کے انتہائی جوش میں پہلے تو وہ کوئی بات ہی نہ کر سکا پھر قدرے دم لے کر پھنس پھسا کر بولا...... ''منجھلے بھیا کو ماں نے حکم دیا ہے جانتے ہو؟ ہم لوگوں کے کسی بھی کام میں دخل دینے کی اب انہیں ضرورت نہیں ہے۔ اب تم اور میں دونوں ایک کمرے میں پڑھا کریں گے......اور منجھلے بھیا کی ہم ذرا سی بھی کیئر (پرواہ) نہیں کریں گے۔''

جیتن بھی پیچھے پیچھے آ حاضر ہوا۔ وہ اپنی کارگزاری سنانے کے اضطراب میں یکبارگی ہو رہا تھا۔ اور چھوٹے بھائی کو یہ اطلاع دے کر کھینچ لایا تھا۔ پہلے تو کچھ دیر تک وہ خوب ہنستا رہا۔ پھر ہنسنا بند کر کے اپنی چھاتی کو بار بار ٹھونک کر بولا...... ''میں، میں میرے ہی باعث یہ سب ہوا ہے۔ اس بات کو کیا تم نہیں جانتے۔ میں اگر اسے یعنی مجھے منجھلے بھیا کے روبرو نہ لے گیا ہوتا تو کیا ماں ایسا حکم دیتیں؟''

''لیکن چھوٹے بھیا تمہیں اپنا کلدار لٹو مجھے دینا ہی ہوا۔ یہ بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں...... اچھا دیا۔ لے آ، جا میرے ڈیسک میں سے۔'' چھوٹے بھائی نے اسی لمحہ حکم دے ڈالا۔ لیکن اسی لٹو کو گھنٹہ بھر پہلے شاید وہ تمام روئے زمین کی دولت کے عوض بھی نہ دے سکتا تھا۔

ایسی ہی قیمت ہوا کرتی ہے انسان کی آزادی کی، انفرادی حقوق کو حاصل کرنے میں ایسی ہی مسرت ہوا کرتی ہے۔ آج مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ بچوں کے نزدیک بھی اس کی قدر و قیمت رتی بھر بھی کم نہیں ہے۔

منجھلے بھیا بڑے ہونے کے باعث اپنی خود مختاری سے چھوٹوں کے جن تمام حقوق کو غصب کر بیٹھے تھے۔ انہیں پھر سے حاصل کرنے کی خوش نصیبی کے لالچ سے چھوٹے بھیا نے عزیز از جان شے بھی بلا پس و پیش دے ڈالی۔ دراصل منجھلے بھیا کے ظلم و ستم کی انتہا نہ تھی۔ اتوار کے دن کڑی دوپہر میں ایک میل کا راستہ ناپ کر ان کے تاش کھیلنے والے دوستوں کو بلانے جانا پڑتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں دن میں جب تک وہ سوتے رہتے تب تک پنکھا جھلنا پڑتا تھا۔ سردی کے دنوں میں جب وہ لحاف کے اندر ہاتھ پاؤں چھپا کر بچھوے کی طرح بیٹھے کتاب پڑھتے تھے۔ تب ہمیں بیٹھے بیٹھے ان کی کتاب کے ورق الٹ دینے پڑتے تھے۔ اس قسم کے ان کے مظالم تھے اور پھر نہ کہنے کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کسی کے پاس شکایت کرنے کی بھی تاب نہ تھی۔ ان کو اگر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو وہ فوراً حکم دے بیٹھتے...... ''کیشو جا تو ذرا اپنا جغرافیہ لے آ دیکھوں تجھے پرانا سبق یاد بھی ہے یا نہیں۔ جیتن جا تو جھاؤ کی ایک اچھی سی چھڑی توڑ لا۔'' یعنی ہر حالت میں پیٹنا ضروری تھا۔ اس لئے خوشی اور مسرت کی مقدار میں بھی ان لوگوں نے حد اعتدال سے تجاوز کر دیا ہو تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔

لیکن خوشی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو بالآخر اسے ملتوی رکھنا ضروری ہو گیا۔ کیونکہ سکول کا وقت ہو رہا تھا۔ مجھے تو بخار تھا اس لئے مجھے تو کہیں آنا جانا نہ تھا۔

خیال آتا ہے اس رات بخار تیز ہو گیا تھا۔ اور پھر سات آٹھ دن تک بستر پر ہی پڑے رہنا پڑا۔

☆☆☆

اس کے کتنے دنوں بعد سکول گیا اور پھر کتنے دنوں بعد اندر سے ملاقات ہوئی۔ یہ تو یاد نہیں لیکن ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ بہت دنوں بعد ہوئی سنیچر کا دن تھا۔ ان دنوں گنگا میں پانی اترنا شروع ہو گیا تھا اور گنگا کے ایک معاون نالے کے کنارے میں بنسی (مچھلیاں پکڑنے کی کنڈی) ڈال کر مچھلی پکڑنے بیٹھا تھا۔ اور بھی بہت سے آدمی مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ یکا یک میں نے دیکھا کہ کوئی پاس ہی بیٹھا سر کی کے جھنڈ کی آڑ میں بیٹھ کر پٹاپٹ مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ آڑ میں ہونے کی وجہ سے وہ تو اچھی طرح دکھائی نہ دیتا تھا۔ بہت دیر سے مجھے اپنی جگہ پسند نہیں آ رہی تھی۔ دل میں سوچا چلوں میں بھی اسی کے قریب جا بیٹھوں۔ بنسی ہاتھ میں لے کر میرے ایک بار گھوم کر کھڑے ہوتے ہی وہ بولا...... ''میرے دائیں طرف آ کر بیٹھ جا۔ اچھا تو ہے شری کانت؟ چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ اگرچہ میں ابھی تک اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا تھا تو بھی پہچان گیا کہ اندر ہے۔ جسم کے اندر برقی رو دوڑ جانے سے جو جہاں ہوتا ہے وہیں چشم زدن میں جس طرح چونک اٹھتا ہے۔ اس کے لہجہ کے بعد میری بھی وہی حالت ہوئی۔ جسم کا ہر ذرہ چنچل ہو اٹھا۔ اور خون کی رفتار میں تیزی بڑھ گئی اور بے صبر ہو کر جسم کا خون سینے پر پچھاڑ کرنے لگا۔ بدقت بسیار بھی منہ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس بات کو میں لکھ تو ضرور گیا ہوں لیکن اس کو الفاظ میں ادا کرنے کی بات درکنار اسے سمجھنا بھی میرے لئے نہایت مشکل نہیں شاید ناممکن تھا کیونکہ کہنے کے لئے تو عام طور پر استعمال ہونے والے معمولی الفاظ کا سلسلہ گویا دل کی حرکت بند ہونے کو تھی۔ خون کا جوش بے انتہا تھا۔ برقی رو کی طرح بہہ رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ اصطلاحات کے علاوہ اور تو کوئی راستہ نہیں لیکن اس سے کتنی سی بات ظاہر ہوئی ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں ایک دن کے لئے بھی یہ محسوس نہیں کیا میں ہی اس کو یہ کس طرح احساس کراؤں اور وہ بھی اس کو کس طرح جان سکتا ہے؟ تمنا کیا کرتا تھا اور اس کے باوجود بھی کہیں اس سے کسی شکل ملاقات نہ ہو جائے۔ اس خوف سے دن بدن سوکھ کر کانٹا ہوا جاتا تھا۔ اس نے اس

طرح اچانک غیر متوقع عجیب شکل میں میری آنکھوں کے روبرو مجھے اپنے قریب آ کر بیٹھنے کا اصرار کیا۔ اس کے قریب جا کر بیٹھ بھی گیا۔ تاہم ہمہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اندر بلوا...... ''اس دن واپس آ کر تو نے بڑی مار کھائی۔ کیوں نہ شری کانت! تجھے لے جا کر میں نے اچھا کام نہیں کیا۔ اس کے لئے اتنے دنوں تک مجھے افسوس ہوتا رہا ہے۔ میں نے سر ہلا کر کہا...... ''مار نہیں کھائی۔'' اندر خوش ہو کر بولا...... ''نہیں کھائی، سن رے شری کانت! تیرے جانے کے بعد میں نے کالی ماتا کو کئی مرتبہ پکارا تھا تا کہ کوئی تجھے مار نہ سکے۔ کالی ماتا بڑی ظاہرہ دیوی ہیں۔ انہیں یکسوئی سے پکارنے سے کبھی کوئی مار نہیں سکتا۔ ماتا آ کر اس طرح سب کچھ بھلا دیتی ہیں کہ کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔'' یوں کہہ کر اس نے بنسی کو رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی سے لگا لئے۔ گویا انہیں دل ہی دل میں پرنام کیا ہو۔ پھر بنستی میں چارہ لگا کر اسے پانی میں ڈالتے ہوئے بولا...... ''مجھے تو خیال نہ تھا کہ تجھے بخار آ جائے گا۔ اگر ہوتا تو میں وہ بھی نہ ہونے دیتا۔''

میں نے آہستہ سے دریافت کیا...... ''کیا کرتے ہو تم؟'' اندر نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں صرف جوا پھول (گڑ پر) لا کر ماتا کے قدموں پر چڑھا دیتا۔ انہیں جو پھول بہت پیارے ہیں جو جس ارادہ سے انہیں یہ پھول نذر کرتا ہے اس کا ویسا ہی پھل ملتا ہے۔ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کیا تو نہیں جانتا؟'' میں نے پوچھا۔ تمہاری طبیعت تو خراب نہیں ہوئی تھی؟ اندر نے حیرت کے ساتھ جواب دیا۔'' میری؟...... میری طبیعت تو خراب نہیں ہوتی۔ کبھی کچھ نہیں ہوتا؟ وہ یکا یک سنجیدہ ہو کر بولا۔'' ''دیکھ شری کانت! میں تجھے ایک چیز دکھائے دیتا ہوں۔ اگر تو صبح و شام خوب یکسوئی سے دیوی کا نام لیا کرے لگا تو وہ سامنے آ کر کھڑی ہو جائیں گی...... تو انہیں صاف طور پر دیکھ سکے گا اور پھر وہ تیرا کبھی برا نہ ہونے دیں گی کوئی تیرا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ تو خود بخود سمجھ جائے گا اور پھر میری طرح جہاں بھی خواہش ہو جانا جو دل میں آئے کرنا۔ پھر کوئی فکر نہیں، سمجھے؟''

میں نے سر ہلا کر کہا...... ''ٹھیک ہے۔'' پھر بنسی میں چارہ لگا کر اور اسے پانی میں ڈال کر دل آویز لہجہ میں پوچھا...... ''اب تم کس کو ساتھ لے کر وہاں جاتے ہو؟''

''کہاں؟''

''اس پار، مچھلی پکڑنے۔''

اندر بنسی کو اٹھا کر اور احتیاط سے اپنے قریب رکھ کر بولا...... ''اب نہیں جاتا۔'' اس کی بات سن کر مجھے کمال حیرت ہوئی پوچھا ...... ''اس کے بعد کیا تم ایک دن بھی نہیں گئے؟''

''نہیں، ایک دن بھی نہیں۔ مجھے سر کی قسم دے کر۔'' بات کو مکمل کئے بغیر ہی کچھ سٹپٹا کر اندر

خاموش ہو گیا۔

اس کے متعلق یہ بات مجھے رہ رہ کر کانٹے کی مانند چبھتی رہی۔ کسی طرح بھی اس دن کی وہ مچھلی بیچنے کی بات بھول نہ سکا تھا۔ اس لئے اگرچہ وہ خاموش رہا۔ لیکن میں نہ رہ سکا۔ پوچھا۔ کس نے تمہیں سر کی قسم دی ہے؟'' تمہاری ماں نے؟''

''نہیں، ماں نے نہیں۔ کہہ کر اندر خاموش ہو رہا۔ پھر بنسی میں آہستہ آہستہ چارہ لپیٹتے ہوئے بولا...... ''شری کانت اپنی اس رات کی بات گھر میں تو نے کسی سے کہی تو نہیں؟''

''نہیں، لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ چلا گیا تھا۔''

اندر نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اب وہ اٹھے گا لیکن وہ نہ اٹھا چپ بیٹھا رہا۔ اس کے چہرہ پر ہمیشہ ہنسی کا ایک جذبہ نمودار رہتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اور کسی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکتا ہو اور بغیر کہے رہا بھی نہ جاتا ہو۔ بیٹھے بیٹھے بھی وہ گویا بے چینی سی محسوس کر رہا ہو۔ آپ لوگ شاید یہ کہہ اٹھیں گے کہ ''بابو! یہ تو تمہارا سفید جھوٹ ہے اتنی زبردست قیافہ شناسی کی وہ تمہاری عمر تو نہ تھی۔''

میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس بات کو بھی آپ لوگ بھول جاتے ہیں کہ مجھے اندر سے محبت تھی۔ ایک انسان دوسرے کے دل کی بات تو جان سکتا ہے تو محض ہمدردی اور محبت سے۔ عمر اور عقل سے نہیں۔ دنیا میں جس نے جتنی محبت کی ہے دوسرے کے دل کی بات اس کے سامنے اتنی ہی زیادہ ظاہر ہو اٹھتی ہے۔ اور کسی طرح نہیں۔ اس کا ایک ثبوت دیتا ہوں۔

اندر نے سر اٹھا کر گویا کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکنے کی وجہ سے اس کا چہرہ بلاوجہ ہی رنگین ہو اٹھا۔ فوراً ہی سر کی کا ایک سونٹا اس نے توڑ لیا اور وہ اسے سر جھکائے پانی پر ٹپکنے لگا۔ پھر بولا۔

''شری کانت!''

''کیا ہے بھیا؟''

''تیرے...... تیرے پاس روپے ہیں؟''

''کتنے روپے؟''

''کتنے!...... ارے یہی چار پانچ روپے ہیں؟''

''ہیں! کیا تم لو گے؟'' کہہ کر میں نے نہایت ہی خوشی کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ تھوڑے سے روپے ہی میرے پاس تھے۔ اندر کے کام آنے کی نسبت اور زیادہ بہتر مصرف کا میں تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن کہاں؟ اندر کو تو بالکل کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کا چہرہ تو اور بھی زیادہ شرم و حیا

کی وجہ سے کچھ عجیب قسم کا ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا...... ''مگر ان روپوؤں کو میں تمہیں واپس ادا نہ کر سکوں گا۔''

''میں انہیں واپس لینا بھی نہیں چاہتا۔'' یہ کہہ کر فخر کے ساتھ میں اس کی طرف دیکھنے لگا اور تھوڑی دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد وہ آہستہ سے کہنے لگا۔ ''روپے میں خود اپنے لئے نہیں چاہتا۔ کسی اور کو دینے ہوں گے۔ اسی لئے تم سے مانگ رہا ہوں۔ وہ لوگ بیچارے بڑے مصیبت زدہ ہیں۔ انہیں کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ کیا تو وہاں چلے گا؟ معاً مجھے اس رات کی یاد آ گئی۔ کہا...... ''وہی نا جن کو روپیہ دینے کے لئے اس دن تم کشتی پر سے اترے جا رہے تھے۔'' اندر نے محویت کے عالم میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''ہاں وہی، روپے تو میں خود ہی بہت سے دے سکتا تھا۔ لیکن جیجی تو کسی طرح لینا ہی نہیں چاہتیں۔ تجھے بھی ساتھ چلنا ہوگا...... شری کانت! ورنہ ان روپوں کو وہ ہرگز نہ لے گی۔ سوچے گی کہ میں ماں کے صندوق سے چوری کر کے لایا ہوں۔ چلے گا شری کانت!''

''معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہاری جیجی ہوتی ہیں؟''

اندر نے قدرے ہنس کر کہا...... ''نہیں جیجی ہوتی نہیں ہیں۔ بلکہ جیجی کہتا ہوں۔ تو بھی چلے گا نا؟'' مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا...... ''دن کے وقت جانے میں وہاں کوئی خوف نہیں ہے۔ کل اتوار ہے۔ کھا پی کر یہاں آ جانا۔ میں تجھے لے جاؤں گا اور جلد ہی واپس لوٹ آئیں گے۔ چلے گا نا بھائی؟'' اتنا کہہ کر وہ جس طرح میرا ہاتھ پکڑ کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس سے مجھے انکار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ میں دوبارہ اس کی ناؤ میں جانے کا وعدہ دے کر گھر لوٹ آیا۔

وعدہ تو سچ مچ ہی میں دے آیا۔ لیکن وہاں جانا کتنی بڑی جرأت کا کام ہے۔ یہ تو مجھ سے زیادہ کوئی نہ جانتا تھا۔ اسی وقت سے میرا جی بھاری ہو گیا۔ اور نیند کے وقت بھی بے پایاں اضطراب سے میرا دل بے چین رہا۔ صبح اٹھتے ہی پہلے دل میں یہی آیا کہ آج جس جگہ جانے کے لئے وعدہ کر چکا ہوں۔ اس جگہ جانے سے میری کسی طرح بھی بہتری نہ ہو گی۔ کسی ذریعہ سے اگر کوئی جان جائے گا تو واپس لوٹ آنے پر جو سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس کی خواہش تو شاید منجھلے بھیا کے لئے بھی چھوٹے بھیا نہ کر سکیں گے۔ بالآخر کھا پی کر پانچ روپے چھپا کر جب میں گھر سے باہر نکلا۔ تو یہ بات بھی کئی دفعہ دل میں آئی کہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلا سے نہ ہوا وعدہ پورا۔ اور اس سے میرا نقصان کیا ہوگا۔

موقع پر پہنچ کر دیکھا کہ سرکے جھنڈ کے نیچے اس چھوٹی سی کشتی کے اوپر اندر سر اٹھائے میری راہ دیکھ رہا ہے۔ آنکھ سے آنکھ ملتے ہی اس نے اس طرح مسکرا کر مجھے بلایا کہ نہ جانے کی بات میں اپنی زبان سے نکال ہی نہ سکا۔ با احتیاط آہستہ آہستہ اتر کر چاپ چاپ میں کشتی پر چڑھ گیا۔ اندر نے ناؤ

کھول دی۔

آج میں سوچتا ہوں کہ بہت سے گزشتہ جنموں کی نیکیوں کا ثمرہ تھا جو اس دن میں کسی ڈر کی وجہ سے لوٹ نہ آیا۔ اس دن جو شے میں دیکھ آیا۔ اسے دیکھنا زندگی بھر تک تمام روئے زمین چھان ڈالنے پر بھی بہت کم انسانوں کی قسمت میں ہوتا ہے۔ خود میں نے بھی ویسی شے اور کہیں نہ دیکھی۔ زندگی میں ایسا موقعہ بار بار نہیں آتا۔ اور اگر کبھی آتا بھی ہے تو ایک ایسا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے کہ بقایا تمام زندگی گویا اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محض اسی لئے میں نسائیت کو شکل میں نہیں دیکھ سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ عقل کے بل بوتے پر کتنے ہی اعتراضات کیوں نہ کروں کہ دنیا میں کیا عصمت فروش عورتیں نہیں ہیں۔ اگر نہیں تو راہ گھاٹ میں گناہ کی اتنی شکلیں کن کی نظر آتی ہیں۔ تمام کی تمام اگر اندر ناتھ کی جیجی ہیں تو اتنی قسم کی مصیبتوں اور دکھوں کے چشمے کون بہاتی ہیں؟...... تو بھی نامعلوم کیوں دل میں خیال آیا ہے کہ یہ سب ان کے ظاہری پردے ہیں۔ جنہیں وہ جب چاہیں با آسانی دور پھینک کر بالکل ان ہی (جیجی) کی طرح بلند مسند پر جلوہ افروز ہو سکتی ہیں۔ دوست احباب کہتے ہیں کہ یہ میرا وہم ہے۔ میں اس کی تردید نہیں کرتا۔ صرف اتنا ہی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ میری دلیل نہیں بلکہ میرا اعتقاد ہے۔ اس اعتقاد کی بنیاد جس ہستی پر قائم ہے۔ وہ نیکی کی تصویر آج بھی زندہ ہے یا نہیں۔ اگر زندہ ہو بھی تو وہ کس حالت میں اور کہاں ہے۔ اس کی کھوج خبر لینے کی کوشش میں نے کبھی نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود بھی دل ہی دل میں انہیں کتنی مرتبہ پرنام کیا ہے۔ اس کو بھگوان ہی جانتے ہیں۔

شمشان کے اسی تنگ ساحل کے قریب برگد کے درخت کی جڑوں سے ناؤ کو باندھ کر جب ہم روانہ ہوئے۔ تو دن کافی بقایا تھا۔ کچھ دور چلنے پر دائیں طرف جنگل میں اچھی طرح دیکھنے سے ایک راستہ دکھائی دیا۔ اسی راستے سے ہو کر اندر اندر داخل ہوا۔ تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد ایک جھونپڑی سی نظر آئی۔ نزدیک جا کر دیکھا کہ اندر جانے کا راستہ ایک بینڈے (بانس کے ڈنڈے) سے بند ہے۔ اندر نے احتیاط سے اس کا باندھ کھول کر داخل ہو کر اور مجھے اندر لے جا کر اس کو بدستور باندھ دیا۔ میں نے ایسی رہائش گاہ اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ ایک تو چاروں طرف خوفناک جنگل دوسرے سر پہ ایک بڑے بھاری املی اور پاکر کے درخت نے تمام جگہ کو تیرہ و تار کر رکھا تھا۔ ہماری آواز سن کر مرغیاں اور ان کے بچے چیخ اٹھے۔ ایک طرف بندھی ہوئی دو بکریاں ممیا اٹھیں۔ غور سے سامنے دیکھا تو ارے بابا...... ایک بڑا بھاری اژدہا ٹیڑھا میڑھا ہو کر تقریباً تقریباً تمام صحن کو گھیرے پڑا ہے۔ چشم زدن میں ایک چلاہٹ کے ساتھ مرغیوں کو ڈراتا ہوا میں یکبارگی اس بینڈے پر چڑھ گیا۔ اندر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بولا...... ''یہ کسی سے بولتا نہیں ہے رے۔ بڑا نیک سانپ ہے۔ اس کا نام ہے رحم۔ اتنا کہہ کر وہ اس کے

قریب گیا اور اس نے اسے پیٹ سے پکڑ کر صحن کی دوسری طرف کھینچ کر سرکا دیا۔ میں نے بینڈے کے اوپر سے دائیں طرف دیکھا۔ اس جھونپڑی کے برآمدے میں بہت سی پھٹی چٹائیوں اور پھٹی کتھریوں کے بچھونے پر بیٹھا ہوا ایک کمزور جسم دبلا پتلا عمر رسیدہ انسان کھانسی کی شدت کے مارے ہانپ رہا تھا۔ اس کے سر کی جٹائیں اونچی بندھی ہوئی تھیں اور گلے میں کئی قسم کی چھوٹی بڑی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ تن کے کپڑے نہایت میلے کچیلے اور ایک قسم کے ہلدی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کی لمبی داڑھی کپڑے کے ایک ٹکڑے کے ساتھ جٹا کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا لیکن قریب آتے ہی پہچان گیا کہ وہ سپیرا ہے۔ پانچ چھ مہینے پیشتر میں اسے تقریباً تقریباً ہر جگہ دیکھا کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں بھی وہ کئی مرتبہ سانپ کا کھیل دکھانے آیا تھا۔ اندر نے اسے شاہ جی کہہ کر مخاطب کیا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر اندر کو گانجے کا سرانجام اور چلم دکھا دی۔ اندر نے کچھ کہے بغیر ہی اس کے ارشاد کی تعمیل شروع کر دی۔ جب چلم تیار ہوئی تو شاہ جی کھانسی سے بے دم ہونے پر بھی ''خواہ مخواہ مردوں یا بچوں'' کا عہد کر کے دم کھینچنے لگا اور ذرا سا بھی دھواں کسی طرف سے باہر نکل نہ جائے اس لئے اس نے بائیں ہتھیلی سے اپنی ناک کو خوب زور سے دبا لیا۔ پھر سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے چلم اندر کے ہاتھ میں دے دی اور کہا...... پیؤ۔''

اندر نے چلم پی نہیں۔ آہستہ سے نیچے رکھتے ہوئے کہا...... ''نہیں'' شاہ جی نے حیرت زدہ ہو کر وجہ دریافت کی لیکن جواب کے لئے ایک لمحہ بھی انتظار نہ کیا اور خود ہی اسے اٹھا لیا اور کھینچ کھینچ کر اسے ختم کر کے الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان نہایت نرم و نازک لہجہ میں گفتگو شروع ہوئی۔ جس کا زیادہ تر حصہ تو میں نہ سن سکا اور نہ سمجھ ہی سکا۔ لیکن ایک بات کو میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ شاہ جی ہندی بولتے رہے اور اندر نے بنگالی چھوڑ کر کسی زبان کا استعمال نہ کیا۔

شاہ جی کا لہجہ رفتہ رفتہ گرم ہوا اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پاگلوں کی چلاہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ اندر کو مخاطب کر کے وہ جو گالی گلوچ کرنے لگا وہ ایسی نہ تھی کہ سنی جا سکتی اور کہی جا سکتی۔ اندر نے تو اس کو برداشت کر لیا لیکن میں اسے کبھی برداشت نہ کر سکتا۔ اس کے بعد وہ بینڈے کے سہارے بیٹھ گیا اور دم بھر بعد ہی گردن جھکا کر سو گیا۔ دونوں کے کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے باعث میں اکتا اٹھا اور بولا...... ''وقت گزر رہا ہے تمہیں کیا وہاں نہیں جانا ہے؟''

''کہاں شری کانت!''

''اپنی جیجی کے یہاں، روپے دینے نہیں جانا ہے؟''

''جیجی کے لئے ہی تو میں بیٹھا ہوں۔ یہی تو ان کا گھر ہے۔''

کیا یہ تمہاری جیجی کا گھر ہے؟ یہ تو سپیرے...... مسلمان...... ہیں'' اندر کچھ کہنے کو تیار ہوا...... لیکن پھر اسے دبا گیا اور چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں ایک بے پایاں اضطراب جھلک رہا تھا۔ قدرے رک کر وہ بولا...... ''ایک دن تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔ سانپ کا کھیل دیکھے گا شری کانت؟''

اس کی بات سن کر میں حیران رہ گیا۔ ''کیا سانپ کو تم کھلاؤ گے؟ اگر کاٹ کھائے تو؟''

اندر اٹھ کر گھر کے اندر گیا اور ایک چھوٹی سی پٹاری اور سپیرے کی تونبی (بین) لے آیا۔ اس نے اسے سامنے رکھا، پٹاری کا ڈھکن کھولا اور تونبی بجائی میں ڈر کے مارے کاٹھ ہو گیا۔ پٹاری مت کھولو بھائی۔ اس میں اگر گوکھرو سانپ ہوا تو؟ اندر نے اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اشارے سے بتا دیا کہ میں گوکھرو سانپ کو بھی کھلا سکتا ہوں۔ دوسرے ہی لمحہ سر ہلا ہلا کر تونبی بجاتے ہوئے اس نے ڈھکن کو الگ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا ایک بڑا بھاری گوکھرو سانپ ایک ہاتھ اونچا ہو کر پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ چشم زدن کے لئے بھی تاخیر کئے بغیر اندر کے ہاتھ کے ڈھکنے میں اس نے زور سے منہ مارا اور پٹاری میں سے باہر نکل پڑا۔

''ارے باپ رے'' کہہ کر اندر صحن میں اچھل پڑا۔ میں بینڈے پر چڑھ گیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق سانپ تونبی پر ایک وار کر کے گھر کے اندر گھس گیا۔ اندر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے کہا...... ''یہ تو ایک دم جنگلی ہے۔ جس کو میں کھلایا کرتا تھا وہ یہ نہیں ہے۔'' ڈر، جھنجھلاہٹ اور تنگ آ کر مجھے قریباً قریباً رونا آ گیا۔ میں بولا...... ''ایسا کام تم نے کیوں کیا؟ اس نے جا کر کہیں اگر شاہ جی کو کاٹ کھایا تو؟'' اندر شرم و ندامت کے مارے گڑا جا رہا تھا۔ بولا...... ''گھر کی ارگل لگا آؤں؟ مگر کہیں قریب ہی چھپا ہوا ہو تو کیا ہو گا۔''

میں بولا...... ''تو پھر نکلتے ہی اسے کاٹ کھائے گا۔'' بے معنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر اندر بولا۔ ''کاٹنے دو بچو کو۔ جنگلی سانپ رکھ چھوڑا ہے۔ جو...... سالے گانجیڑی کو اتنی بھی عقل نہیں ہے...... یہ لو وہ جیجی آ گئیں...... آنا مت! آنا مت، وہیں کھڑی رہو......'' میں نے سر گھما کر اندر کی جیجی کو دیکھا۔ گویا راکھ سے ڈھکی ہوئی آگ ہو۔ جیسے دیوں کی کٹھن ریاضت ختم کر کے ابھی اٹھ کے آئی ہو۔ بائیں طرف کمر پر رسی سے بندھی ہوئی تھوڑی سی خشک لکڑیاں تھی۔ اور دائیں ہاتھ میں پھولوں کی ڈلیا کی طرح ایک ٹوکری میں کچھ ساگ سبزی تھی پوشاک ہندوستانی مسلمانوں کی طرح تھی اور کپڑے گیردے رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن میلے نہ تھے۔ ہاتھ میں لاکھ کی دو چوڑیاں تھیں۔ مانگ ہندوستانیوں کی طرح سیندور سے بھری تھی انہوں نے لکڑیوں کا بوجھ نیچے رکھ دیا اور بینڈا کھولتے کھولتے کہا...... ''کیا ہے؟''

اندر پریشانی کے عالم میں بولا...... ''کھول مت جیجی، تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ایک بڑا بھاری سانپ گھر میں گھس گیا ہے۔'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر کچھ سوچا اس کے بعد تھوڑا سا ہنس کر...... ''وہی تو سپیرے کے گھر میں سانپ گھسا ہے۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ ہے ناشری کانت؟''

میں ایک ٹک نظروں سے صرف انہی کی طرف دیکھتا رہا...... ''مگر یہ تو کہو اندر ناتھ! وہ اندر کس طرح گیا؟''

اندر بولا...... ''پٹاری کے اندر سے نکل پڑا ہے بالکل جنگلی سانپ ہے۔'' شاید وہ اندر سو رہے ہیں، کیوں؟''

اندر نے غصے سے کہا...... ''گانجا پی کر بالکل بے ہوش پڑے ہیں۔ چلا چلا کر مر جانے پر بھی نہ اٹھیں گے۔''

انہوں نے پھر ہنس کر کہا...... ''اور یہی موقعہ غنیمت سمجھ کر شری کانت کو سانپ کا کھیل دکھانے چلے تھے، کیوں نا؟ اچھا، آؤ میں پکڑے دیتی ہوں۔''

''تم مت جانا جیجی، تمہیں کاٹ کھائے گا، شاہ جی کو اٹھا دو...... میں تمہیں نہ جانے دوں گا۔''

یہ کہہ کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بے قرار لہجہ میں جو لاثانی محبت مضمر تھی اسے انہوں نے بخوبی محسوس کیا۔ لمحہ بھر کے لئے ان کی آنکھیں چھلچھلا اٹھیں لیکن انہیں چھپا کر وہ ہنس کر بولیں...... ''ارے پاگل، اتنی اچھی قسمت تیری جیجی نے نہیں پائی۔ مجھے وہ نہیں کاٹے گا۔ ابھی پکڑے دیتی ہوں دیکھ......'' کہہ کر بانسری کے منچ پر سے مٹی کے تیل کی ڈبیا اٹھا کر اور اسے جلا کر وہ گھر کے اندر گئی۔ منٹ بھر میں ہی سانپ کو پکڑ لائی اور پٹاری میں بند کر دیا...... اندر نے فوراً اس کے قدموں میں گر کر نمسکار کیا اور پاؤں کی خاک سر پر لگا کر کہا...... جیجی، اگر تم کہیں میری جیجی ہوتیں، انہوں نے داہنا ہاتھ بڑھا کر اندر کے ہاتھ کو چھوا، اور اس کی انگلی کو چوم لیا اور پھر منہ پھیر کر چھپے چھپے انہوں نے اپنی دونوں آنکھیں پونچھ لیں۔

❀......❀

تمام واقعہ سنتے سنتے اندر کی جیجی معاً دو ایک مرتبہ اس طرح لرز اٹھی کہ اگر اندر کا اس طرف کچھ خیال ہوتا تو اسے کمال حیرت ہوتی۔ وہ تو دیکھ نہ سکا لیکن میں نے دیکھ لیا۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ اس کی طرف دیکھ کر پیار بھری حقارت کے ساتھ بولیں...... ''چھی، بھیا ایسا کام اب کبھی نہ کرنا۔ ان تمام خوفناک جانوروں سے کھیلنا اچھا نہیں۔ خوش قسمتی سے تمہارے ہاتھ کی پٹاری کے ڈھکنے پر ہی اس نے دانت مارے ورنہ آج کیسا ظلم ہو جاتا۔ بولو تو۔''

''میں کیا ایسا بے وقوف ہوں جیجی! یہ کہہ کر اس نے اپنی دھوتی کا کنارہ کھینچ کر کمرے میں سوت سے بندھی ہوئی ایک خشک جڑی (بوٹی) دکھا کر کہا...... ''یہ دیکھ جیجی، نہایت احتیاط کے ساتھ باندھ رکھی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کیا آج وہ مجھے کاٹے بغیر چھوڑ دیتا؟ شاہ جی سے حاصل کرنے میں مجھے کیا کم تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں۔ اس کی موجودگی میں تو مجھے کوئی بھی کاٹ نہیں سکتا اور اگر کاٹ بھی لیتا تو بھی کیا بگڑتا۔ شاہ جی کو فوراً ہی جگا کر ان سے زہر مہرہ لے کر کئی جگہ پر رکھ دیتا۔ اچھا جیجی، یہ زہر مہرہ کتنی دیر میں سب زہر کھینچ لیتا ہے؟ آدھ گھنٹے میں؟ ایک گھنٹے میں؟ نہیں اتنی دیر نہیں لگتی ہوگی، کیوں جیجی!''

مگر جیجی اس طرح خاموش دیکھتی رہیں۔ اندر مشتعل ہو اٹھا۔ بولا...... ''آج دو نا جیجی مجھے ایک زہر مہرہ۔ تمہارے پاس تو دو تین پڑے ہیں۔ کتنے دنوں سے مانگ رہا ہوں۔'' پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ غرور کے لہجہ میں بول اٹھا...... ''مجھ سے تو تم لوگ جو بھی کہتے ہیں۔ وہی کر دیتا ہوں۔ لیکن تم لوگ مجھے جھانسہ دے کر کہتے ہو آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں...... اگر نہیں دینا ہے تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟ میں پھر نہیں آؤں گا...... جاؤ!''

اندر نے تو محسوس نہ کیا۔ لیکن میں نے جیجی کی طرف دیکھتے ہوئے خوب اچھی طرح محسوس کیا کہ ان کا چہرہ، کسی بے پایاں درد اور شرم کی وجہ سے گویا ایک دم سیاہ ہو گیا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحہ کچھ ہنسی کا تاثر اپنے خشک ہونٹوں پر زبردستی لا کر انہوں نے کہا...... ''ہاں رے اندر کیا تو اپنی جیجی کے یہاں

صرف سانپ کا منتر اور زہر مہرے کے لئے ہی آیا کرتا ہے؟''

اندر بلا جھجک بول اٹھا...... ''اور نہیں تو کیا۔'' پھر نیم خوابی کی حالت میں سوئے ہوئے شاہ جی کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ کر کہا...... ''مگر وہ ہمیشہ مجھے جھانسہ ہی دیتے رہتے ہیں۔ اس تاریخ کو نہیں اس تاریخ کو نہیں۔ اس دن نہیں اُس دن نہیں۔ صرف وہ ایک جھاڑنے کا منتر دیا تھا۔ بس اور کچھ دینا ہی نہیں چاہتے۔ لیکن آج مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے جیجی! کہ تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ تم بھی سب جانتی ہو۔ اب ان کی اور خوشامد نہیں کروں گا جیجی! تم سے ہی سب منتر سیکھ لوں گا۔'' اتنا کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر اچانک ایک طویل آہ بھر کر شاہ جی کی طرف اشارہ کر کے عزت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جی، گانجا وغیرہ ضرور ہی پیتے ہیں مگر تین دن کے مرے ہوئے مردے کو آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اٹھا کر کھڑا کر سکتے ہیں، اتنے بڑے استاد ہیں۔ ہاں جیجی، تم بھی تو مردے کو جلا سکتی ہو؟''

جیجی کچھ دیر چپ چاپ دیکھتی رہیں اور پھر یکا یک کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ وہ کتنی دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس طرح میں نے بہت ہی کم لوگوں کو ہنستے دیکھا ہے۔ لیکن وہ مسکراہٹ گویا گھنے بادلوں سے محیط آسمان کی سی بجلی کی چمک کی طرح دوسرے ہی لمحہ تاریکی میں غائب ہو گئی۔

مگر اندر کا اس طرف خیال ہی نہ تھا۔ وہ ایک دم جیجی کے گلے پڑ گیا اور بولا...... ''میں جانتا ہوں کہ تمہیں سب معلوم ہے مگر میں کہے دیتا ہوں کہ ایک ایک کر کے تمہیں اپنا تمام علم مجھے دینا ہوگا۔ جتنے دن زندہ رہوں گا اتنے دن تمہارا پورا پورا غلام بن کر رہوں گا۔ تم نے کتنے مردوں کو زندہ کیا ہے جیجی؟''

جیجی بولیں...... ''میں تو مردے جلانا جانتی نہیں اندر ناتھ؟''

اندر نے پوچھا...... ''تمہیں شاہ جی نے یہ منتر نہیں دیا؟''

جیجی نے سر ہلا کر کہا...... ''نہیں۔''

اندر آن واحد تک ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد خود ہی اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا...... ''یہ علم کوئی آسانی سے دینا چاہتا ہے جیجی، اچھا، کوڑی چلانا تو تم نے یقیناً ہی سیکھ لیا ہوگا؟''

جیجی بولیں...... ''کوڑی چلانا کسے کہتے ہیں یہ بھی تو میں نہیں جانتی بھائی۔''

اندر کو یقین نہ ہوا...... ''ہش، جانتی کیسے نہیں۔ نہیں دوں گی یہی کہہ دو نا!'' پھر میری طرف دیکھ کر بولا...... ''کوڑی چلانا کبھی دیکھا ہے شری کانت! دو کوڑیاں منتر پڑھ کر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ وہ جہاں سانپ ہوتا ہے اس کے سر پر چپٹ جاتی ہیں اور اسے دس دن تک کے راستے سے کھینچ لا کر حاضر کر دیتی ہیں۔ منتر کا ایسا ہی زور ہے۔ اچھا جیجی، گھر باندھنا، جسم باندھنا، ڈھول پڑھنا، یہ سب تو تم جانتی ہو

نا؟ اگر جانتی نہ ہوتیں تو اس طرح سانپ کو کیسے پکڑ لیتیں؟'' اتنا کہہ کر وہ متجسس نگاہوں سے جیجی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

جیجی نے بہت دیر تک سر جھکائے چپ چاپ دل ہی دل میں گویا کچھ سوچ لیا اور پھر منہ اٹھا کر آہستہ سے کہا...... ''اندر تیری جیجی کے پاس یہ سب علم کانی کوڑی کا بھی نہیں ہے اور کیوں نہیں ہے یہ اگر تو یقین کرے بھائی۔ تو آج تیرے سامنے سب باتیں کھول کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر ڈالوں۔ بولو تم آج میری سب باتوں پر یقین کرو گے؟'' کہتے کہتے اس کے آخری الفاظ کچھ بھاری ہو اٹھے۔

ابھی تک میں بالکل ہی خاموش تھا۔ اس دفعہ سب سے پہلے زور سے بول اٹھا۔ ''میں تمہاری سب باتوں پر یقین کروں گا جیجی! سب پر۔ جو تم کہو گی، سب پر ایک بھی بات پر شک نہ کروں گا۔''

میری طرف دیکھ کر وہ کچھ ہنسیں اور بولیں...... ''یقین کیوں نہ کرو گے بھائی! تم شریف گھرانوں کے لڑکے جو ٹھہرے۔ چھوٹے لوگ ہی نامعلوم اجنبی لوگوں کی باتوں پر شک کیا کرتے ہیں اور ڈر کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا نہیں بھائی؟'' اتنا کہہ کر انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہماری طرف دیکھ کر تھوڑا سا ہنس دیا۔

اس وقت شام کی دھند ہلکی ہو چکی تھی، چاند نکل آیا اور اس کی دھندلی سی کرنیں درختوں کی، گنجان شاخوں اور پتوں میں سے چھن چھن کر نیچے کی گہری تاریکی میں پڑ رہی تھیں۔

کچھ دیر خاموش رہ کر جیجی یکا یک بول اٹھیں۔ ''اندر ناتھ، سوچا تھا کہ آج ہی اپنی تمام کہانی تمہیں سنا دوں مگر سوچ کر دیکھا کہ نہیں ابھی وہ موقعہ نہیں آیا ہے لیکن میری اس بات پر ضرور یقین کر لو کہ ہم لوگوں کی تمام کرامات شروع سے آخر تک دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ اس لئے اب تم جھوٹی امید سے شاہ جی کے پیچھے پیچھے چکر مت کاٹو۔ ہم لوگ منتر جنتر کچھ نہیں جانتے۔ مردوں کو بھی نہیں جلا سکتے۔ کوڑی پھینک کر سانپ کو بھی پکڑ کر نہیں لا سکتے اور دوسرا کوئی یہ کام کر سکتا ہے یا نہیں یہ تو میں نہیں جانتی۔ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ ہم لوگوں میں ایسی کوئی بھی طاقت نہیں۔''

نامعلوم کیوں اس مختصر سے تعارف سے ہی میں نے ان کے ہر ایک لفظ پر پورا پورا یقین کر لیا۔ مگر اتنے گہرے تعلقات ہوتے ہوئے بھی اندر یقین نہ کر سکا۔ وہ ناراض ہو کر بولا...... ''اگر طاقت نہیں ہے تو تم نے سانپ کو پکڑ کس طرح لیا؟''

جیجی بولیں۔ ''یہ تو صرف ہاتھ کی پھرتی ہے اندر، کسی منتر کا زور نہیں۔ سانپ کا منتر ہم نہیں جانتے۔''

اندر بولا...... ''اگر نہیں جانتے تو تم دونوں نے مکاری کر کے مجھ سے اتنے روپے کیوں ٹھگ

لئے؟"

جیجی فوراً جواب نہ دے سکیں۔ شاید اپنے آپ کو کچھ سنبھالنے لگیں۔

اندر نے پھر سخت لہجہ میں کہا...... "تم سب ٹھگ، بدمعاش اور مکار ہو۔ اچھا دکھاتا ہوں تم لوگوں کو اس کا مزا۔"

پاس ہی مٹی کے تیل کا ایک دیا جل رہا تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں دیکھا جیجی کا چہرہ مردے کی مانند سفید فق ہو گیا ہے وہ ڈر اور جھجک کے ساتھ بولیں...... ہم لوگ مداری جو ہیں بھائی؟ ٹھگنا تو ہمارا کاروبار ہے۔"

"تمہارا کاروبار میں ابھی سب باہر نکالے دیتا ہوں۔ چل رے شری کانت! ہمیں اس سالے بدمعاش کے سایہ سے بھی بچنا چاہئے۔ حرامزادے، بدذات، بدمعاش، مکار۔" یہ کہہ کر اندر دفعتاً میرا ہاتھ پکڑ کر اور زور سے ایک جھٹکا دے کر کھڑا ہو گیا۔ اور ذرا سی بھی دیر کئے بغیر مجھے کھینچ لے گیا۔

اندر کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کی مدتوں کی بہت بڑی بڑی امیدیں گویا چشم زدن میں مٹ کر غائب ہو گئیں۔ لیکن میں اپنی دونوں آنکھوں کو جیجی کی ان آنکھوں کی طرف پھر لوٹا نہ سکا۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے اندر کے قبضہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پانچ روپے سامنے رکھ دیئے اور کہا...... "تمہارے لئے لایا تھا جیجی...... انہیں لے لو۔"

اندر نے جھپٹ کر انہیں اٹھا لیا اور کہا...... اب اور روپے؟ بے ایمانی سے انہوں نے مجھ سے کتنے روپے لئے ہیں۔ یہ کیا تجھے معلوم نہیں ہے شری کانت؟ میں تو اب یہی چاہتا ہوں کہ یہ لوگ بغیر کھائے پیئے سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا...... "نہیں اندر! دے دینے دو...... میں یہ جیجی کے لئے ہی لایا ہوں۔"

"اوہ...... بڑی آئیں تیری جیجی!" کہہ کر وہ مجھے کھینچ کر بینڈے کے پاس گھسیٹ لایا۔

اسی دوران میں اس گول مال سے شاہ جی کا نشہ اچٹ گیا...... "کیا ہوا کیا ہوا" کہتے کہتے وہ اٹھ بیٹھا۔

اندر مجھے چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا اور بولا...... "ڈاکو سالے! کبھی راستے میں مل گیا تو چابک سے تیری پیٹھ کا چمڑہ ادھیڑ دوں گا۔" کیا ہوا، بدمعاش، سالا جانتا کچھ بھی نہیں، پھر بھی کہتا پھرتا ہے۔ منتر کے زور سے مردے جلاتا ہوں۔ اگر کبھی راستہ پر دکھائی دیا تو اب کی بار اچھی طرح دیکھوں گا تجھے۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک ایسا مہیب اشارہ کیا جس سے شاہ جی چونک اٹھا۔

ایک تو نشے کی خماری، پھر اچانک یہ غیر متوقع تکرار۔ اس لئے وہ حواس باختہ ہو گیا اور اسی طرح ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

اندر مجھے لے کر جب تک دروازے کے باہر آیا تب تک شاید وہ کچھ ہوش میں آ کر خالص بنگالی زبان میں پکار اٹھا...... "سن اندر ناتھ، کیا ہوا ہے بول تو؟"

پہلی ہی مرتبہ بنگالی بولتے ہوئے میں نے اسی وقت سنا۔

اندر لوٹ کر بولا...... "جنتر منتر تم کچھ نہیں جانتے پھر کیوں جھوٹ موٹ مجھے دھوکہ دے کر اتنے دنوں تک روپیہ اینٹھتے رہے اس کا جواب دو۔"

وہ بولا...... "نہیں جانتا یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

اندر نے اسی آن خاموش کھڑی جیجی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا...... "انہوں نے کہا کہ تمہارے پاس کانی کوڑی کا بھی علم نہیں ہے۔ اگر کچھ آتا ہے تو صرف دھوکہ یا لوگوں کو ٹھگنا۔ یہی تو ہم لوگوں کا کاروبار ہے۔ جھوٹا چور!"

شاہ جی کی آنکھیں جل اٹھیں۔ وہ کس خوفناک فطرت کا انسان ہے؟ اس کا علم مجھے اس وقت تک بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرف اس نگاہ سے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی منتشر جٹاؤں کو باندھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے آ کر بولا...... "کہا ہے تو نے؟"

جیجی بدستور منہ نیچا کئے ہوئے چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ اندر نے مجھے ایک دھکا دے کر کہا "رات ہو گئی ہے چل نا۔"

میں نے کہا۔ "رات تو ضرور ہو رہی ہے لیکن میرے پاؤں تو گویا اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں ہیں۔" اندر نے اس پر توجہ نہ دی اور زبردستی ہی مجھے کھینچ لے چلا۔

کچھ قدم آگے بڑھتے ہی شاہ جی کی آواز پھر سنائی دی...... "کیوں کہا تو نے؟"

سوال تو سنا لیکن اس کا جواب نہ سن سکا۔ چند قدم اور آگے بڑھتے ہی اچانک چاروں طرف سے اس گھنی تاریکی کا کلیجہ چیر کر ایک زور کی چیخ پیٹھ کی جھونپڑی میں سے ہمارے کانوں کو چھیدتی ہوئی نکل گئی اور پلک مارتے اندر اس چیخ کا تعاقب کر کے غائب ہو گیا۔ لیکن میری قسمت میں کچھ اور ہی تھا۔ سامنے ہی ایک خاردار جھاڑی تھی۔ میں زور سے اسی پر جا گرا اور کانٹوں سے میرا تمام جسم چھلنی ہو گیا۔ یہ جو ہوا سو ہوا۔ اور اپنے آپ کو کانٹوں کی زد سے چھڑانے میں مجھے تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ ایک کانٹے سے چھوٹتا تو کسی دوسرے کانٹے میں الجھ جاتا اور اسے چھڑاتا تو کسی تیسرے میں جا اٹکتا۔ اس طرح کافی تکلیف اور دیر کے بعد جب میں شاہ جی کے گھر کے صحن کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ اس صحن کے ایک

حصے میں جیجی بے ہوش پڑی ہیں اور دوسرے حصے میں دونوں گورو چیلے کی باقاعدہ کشتی ہو رہی ہے۔ قریب ہی ایک تیز دھار والی برچھی پڑی ہوئی ہے۔

شاہ جی کا جسم طاقت ور تھا۔ لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ اندر اس سے بھی کتنا زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے اگر یہ علم ہوتا تو شاید وہ ایسی جرأت نہ کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اندر اسے چاروں شانے چت گرا کر اس کی چھاتی پر سوار ہو بیٹھا۔ اور اس کی گردن کو زور زور سے دبوچنے لگا اور اگر میں دخل نہ دیتا تو شاید، شاہ جی کی مداری زندگی اسی وقت ختم ہو جاتی۔

کافی کھینچا تانی کے بعد جب میں نے دونوں کو الگ الگ کیا تو اندر کی حالت دیکھ کر ڈر کے مارے ایک دم رو پڑا۔ پہلے تو اندھیرے میں دیکھ نہ سکا تھا کہ اس کے تمام کپڑے خون سے تر بتر ہو رہے ہیں۔ اندر ہانپتا ہوا بولا...... "سالے گنجیڑی نے مجھے سانپ مارنے کا برچھا مارا ہے یہ دیکھا!" کرتے کی آستین اٹھا کر اس نے دکھایا۔ بازو میں قریباً دو تین انچ گہرا زخم ہو گیا تھا اور اس میں سے لگاتار خون بہہ رہا تھا۔

اندر بولا...... "رومت، اس کپڑے سے میرے زخم کو خوب مضبوطی سے باندھ دے...... اے خبردار، بالکل اسی طرح بیٹھا رہ، اٹھا تو تیرے گلے پر پاؤں رکھ کر زبان کھینچ کر باہر نکال دوں گا، حرامزادے، سور...... لے شری کانت، تو کھینچ کر باندھ، دیر مت کر۔" یہ کہہ کر اس نے چر چرا اپنی دھوتی کے کنارے کا ایک حصہ پھاڑ ڈالا۔ میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زخم باندھنے لگا اور شاہ جی پاس ہی کسی لب مرگ زہری سانپ کی طرح بیٹھا ہوا چپ چاپ دیکھنے لگا۔

اندر بولا۔ "نہیں تیرا کوئی بھروسہ نہیں ہے تو خون کر ڈالے گا۔ میں تیرے ہاتھ باندھوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اس کی گیروے رنگ کی پگڑی کھینچ کھانچ کر اس کے دونوں ہاتھ کس کر باندھ دیئے۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ جواب نہ دیا۔ ذرا سی بھی چوں تک نہ کی۔

جس لاٹھی کے وار سے جیجی بے ہوش ہو گئیں تھیں۔ اسے اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے اندر بولا...... "کیسا نمک حرام شیطان ہے سالا۔ میں نے اسے اپنے باپ کے نامعلوم کتنے روپے چرا کر دیئے ہیں۔ اور اگر جیجی نے سر کی قسم دے کر روکا نہ ہوتا تو اور بھی دیتا۔ اس پر بھی یہ مجھے برچھا مار بیٹھا۔ شری کانت! اس پر نظر رکھ تاکہ یہ اٹھ نہ بیٹھے...... میں جیجی کی آنکھوں اور چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتا ہوں۔"

پانی کے چھینٹے دے کر ہوا کرتے ہوئے وہ بولا...... "جس دن جیجی نے کہا کہ "اندر ناتھ تیرے کمائے ہوئے پیسے ہوتے تو میں لے لیتی...... مگر انہیں لے کر میں اپنی یہ دنیا اور عاقبت برباد نہ

کروں گی، اس دن سے اب تک اس شیطان کے بچے نے انہیں کتنی مار ماری ہے اس کا کوئی حساب نہیں۔ پھر بھی جیجی لکڑی ڈھو کر، اوپلے بیچ کر کسی نہ کسی طرح اسے کھلاتی پلاتی ہیں، گانجے کے لئے پیسے دیتی ہیں مگر یہ اس کا اپنا نہ ہوا۔ اب میں اسے پولیس کے ہاتھ میں دوں گا تو چھوڑوں گا ورنہ یہ تو جیجی کا خون کر ڈالے گا۔ یہ خون کر سکتا ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ انسان اس بات سے لرز اور سر اٹھا کر اس نے فوراً ہی اسے نیچا کر لیا۔ یہ سب چشم زدن میں ہی ہو گیا۔ لیکن اقدام جرم کی جو تشویش اس وقت میں نے اس کے چہرے پر بکھرتی ہوئی دیکھی۔ اس کا وہ چہرہ آج بھی مجھے صاف صاف یاد آ جاتا ہے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کہانی کو جسے میں آج لکھ رہا ہوں۔ قارئین سچ تسلیم نہ کریں گے بلکہ اسے ایک عجیب تخیل سمجھ کر میرا مذاق اڑانے میں بھی جھجک نہ کریں گے۔ تاہم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے اسے لکھا ہے اور یہی میری واقفیت کی حقیقی قیمت ہے کیونکہ سچائی کی بنیاد پر کھڑے ہوئے بغیر کسی طرح بھی تمام داستان کو مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ قدم قدم پر یہی ڈر رہتا ہے کہ لوگ اسے مذاق میں اڑا نہ دیں۔ عالم امکان سچے واقعات تخیل تک کو بہت دور پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ کیفیت خود اسے لکھنے میں کس طرح کی امداد نہیں کرتی بلکہ ہاتھ کے قلم کو بار بار کھینچ کر روکتی ہے۔

لیکن جانے دو اس بات کو۔ جیجی جب آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھیں تو شاید نصف رات گزر چکی تھی۔ اس کی بے ہوشی دور ہوتے اور بھی ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کے بعد ہمارے منہ سے سارا ماجرا سن کر وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور شاہ جی کے بندھ کھولنے کے بعد بولیں...... "جاؤ اب سو رہو۔"

اس کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اندر کو پاس بلا کر اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر کہا...... "اندر میرے اسی سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ اب پھر کبھی تو اس گھر میں نہیں آئے گا۔ ہمارے ساتھ جو ہونا ہو ہو، تو اب ہماری کوئی خبر نہ لینا۔"

اندر پہلے تو گم سم کھڑا رہا لیکن دوسرے ہی لمحہ آگ کی طرح جل اٹھا اور بولا...... "ٹھیک ہی تو ہے۔ میرا خون کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں اور میں نے جو تھوڑی دیر کے لئے باندھ دیا تو تمہارا اتنا غصہ۔ ایسا نہ ہو تو پھر یہ کلجگ ہی کیوں کہلائے لیکن تم دونوں کتنے نمک حرام ہو۔ آ رے شری کانت، چلیں بس ہو چکا۔"

جیجی خاموش ہو رہیں۔ انہوں نے اس الزام کی تردید نہ کی۔ کیوں نہ کی اس بات کو بعد میں خواہ کتنا ہی سمجھا ہو لیکن اس وقت بالکل نہ سمجھ سکا۔ تاہم میں چپ چاپ وہ پانچ روپے وہیں کھمبے کے پاس رکھ کر اندر کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ صحن کے باہر آ کر وہ چلا کر بولا...... "ہندو کی لڑکی ہو کر جو ایک

مسلمان کے ساتھ بھاگ آتی ہے اس کا دین ایمان ہی کیا؟ چولھے میں چلی جائے۔ اب میں نہ کوئی کھوج ہی کروں گا اور نہ خبر لوں گا۔ حرامزادہ بدمعاش کہیں گا؟'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس جنگلی راستے کو عبور کر کے چل دیا۔

ہم دونوں آ کر کشتی میں بیٹھ گئے۔ اندر چپ چاپ کشتی کھیلنے لگا اور بار بار ہاتھ اٹھا اٹھا کر آنکھیں پونچھنے لگا۔ یہ صاف صاف سمجھ کر وہ رو رہا ہے میں نے بھی اور کوئی سوال نہ کیا۔

شمشان کے اسی راستہ میں لوٹ آیا اور اسی راستے اب بھی چلا جا رہا ہوں مگر نہ جانے کیوں؟ آج میرے دل میں ڈر کی کوئی بات نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے شاید میرا دل اتنا بے قرار اور اتنا ڈھکا ہوا تھا کہ اتنی رات گئے کس طرح، گھر میں گھسوں گا اور گھسنے پر کیا حالت ہوگی۔ اس فکر کو بھی اس وقت کوئی جگہ نہ مل سکی۔

تقریباً رات کے آخری پہر میں کشتی گھاٹ پر آ لگی۔ مجھے اتار کر اندر بولا۔ ''گھر چلا جا شری کانت! تو بڑا منحوس ہے۔ تجھے ساتھ لے کر جانے سے ایک نہ ایک فساد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ آج سے تم کو کسی بھی کام کے لئے نہ بلاؤں گا۔ اور تو بھی میرے سامنے نہ آنا۔ جا چلا جا۔'' کہہ کر وہ گہرے پانی میں کشتی کو دھکیل کر دیکھتے ہی دیکھتے بہاؤ کی طرف غائب ہو گیا۔ میں حیرت و استعجاب سے خاموش ہو کر سنسان ندی کے ساحل پر تنہا ہی کھڑا رہ گیا۔

سنجیدہ اور خاموش رات میں ماں گنگا کے کنارے بالکل بلاوجہ ہی جب اندر مجھے تنہا ہی چھوڑ کر چلا گیا تو میں اپنے گریہ کو برداشت نہ کر سکا۔ اسے میں پیار کرتا ہوں۔ اس کی اس نے کوئی قیمت ہی نہ سمجھی۔ ایک رشتہ دار کے گھر میں رہتے ہوئے سخت نگرانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ گیا۔ اس بات کی بھی اس نے کوئی قدر نہ کی بلکہ الٹا مجھے منحوس کہہ کر اور تنہا بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر بے پرواہی سے چلا گیا۔ اس کا یہ ظلم مجھے کتنا برا محسوس ہوا؟ اس کا ذکر کرنے کی کوشش کرنا بھی بیکار ہے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک نہ تو اس نے مجھے تلاش کیا اور نہ میں نے ہی اسے۔ کارے قضا کبھی اگر راہ گھاٹ میں مل بھی جاتا تو میں یوں منہ موڑ کر چلا جاتا گویا اسے دیکھا ہی نہ ہو لیکن میرا گویا، مجھے ہمیشہ ہی تنکوں کی آگ میں جلایا کرتا تھا۔ اس کا کچھ بھی نقصان نہ کر سکتا۔ لڑکوں کے گروہ میں اس کی خاص عزت تھی۔ فٹ بال، کرکٹ کا وہ سردار تھا۔ جمناسٹک اکھاڑے کا ماسٹر تھا۔ اس کے کتنے ہی پیروکار تھے۔ اور کتنے ہی عقیدت مند۔ میں تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا پھر...... کس لئے دو دن کی ملاقات میں مجھے دوست کہنے لگا اور اس کے بعد اس نے مجھے ترک کیوں کر دیا؟ اور جب اس نے ترک کر ہی دیا تو میں بھی زبردستی اس سے تعلق قائم کیوں کروں؟

مجھے خوب یاد ہے کہ ہمجولی ساتھی جب اندر کا ذکر کر کے اس کے متعلق طرح طرح کی عجیب و غریب باتیں کہنا شروع کر دیتے تو میں چپ چاپ انہیں سنتا رہتا۔ چھوٹی سی بات کہہ کر بھی میں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ مجھے جانتا ہے یا اس کے متعلق میں کچھ جانتا ہوں۔ نامعلوم کس طرح میں اس چھوٹی سی ہی عمر میں یہ جان گیا تھا کہ بڑے اور چھوٹے کی دوستی کا انجام عموماً یہی ہوا کرتا ہے۔ اپنی آئندہ زندگی میں خوش قسمتی سے بے شمار، بڑے، دوستوں کی صحبت میں آؤں گا۔ اسی لئے شاید بھگوان نے مہر کر کے یہ تمیز مجھے عطا کر دی تھی جس کے باعث میں کبھی کسی وجہ سے اپنی حالت کا غلط اندازہ کر کے یعنی اپنی قابلیت کا خیال کئے بغیر دوستی کی قیمت کا اندازہ کرنے نہ جاؤں۔ ورنہ دیکھتے دیکھتے دوست آقا بن جاتا

ہے اور دوستی کا استحقاق غلامی کی بیڑی بن کر، چھوٹے، کے پاؤں کو جکڑ لیتا ہے۔ یہ راز اتنی آسانی سے اور اس طرح حقیقی شکل میں مجھے حاصل ہو گیا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے بے عزتی اور بدنامی سے نجات پا گیا ہوں۔

تین چار مہینے گزر گئے۔ دونوں نے ہی دونوں کو ترک کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس کی کوفت کسی فریق کے لئے کتنی ہی پر آزاد ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نے بھی کسی کی کھوج خبر نہ لی۔

دت خاندان کے گھر میں کالی پوجا کے سلسلہ میں اس محلے کا شوقیہ ناٹک سٹیج تیار ہو رہا تھا۔ ''میگھ نا دودھ'' کا کھیل ہونے والا تھا۔ اس سے پیشتر ملک میں یاترا[1] تو کوئی مرتبہ دیکھی تھی مگر ڈرامے زیادہ نہیں دیکھے تھے۔ میں نے تمام دن نہ نہایا نہ کھایا اور نہ آرام ہی کیا۔ سٹیج بنانے میں مدد کر سکنے سے ہی اپنے آپ کو مبارک سمجھنے لگا تھا۔ اتنا ہی نہیں جو صاحب رام کا پارٹ کرنے والے تھے انہوں نے خود مجھ سے اس دن ایک رسی پکڑے رہنے کے لئے کہا تھا۔ اس لئے مجھے بڑی امید تھی کہ رات کو جب اور لڑکے قنات کے سوراخ میں سے اندر گرین روم میں جھانکیں گے اور مار اور لاٹھی کے ہچکولے کھائیں گے تو میں شری رام کی عنایت سے بچ جاؤں گا۔ شاید وہ مجھے دیکھ کر اندر بھی ایک آدھ بار جانے دیں۔ مگر وائے بد قسمتی تمام دن جی جان توڑ کر محنت کی۔ شام کے بعد اس کا کچھ بھی انعام نہ ملا۔ گھنٹوں گرین روم کے دروازے پر کھڑا رہا۔ رام چندر کتنی مرتبہ آئے اور گئے انہوں نے مجھے نہ پہچانا۔ ایک بار پوچھا تک نہیں۔ کہ میں اس طرح کھڑا کیوں ہوں۔ ہائے رے احسان فراموش رام! کیا رسی پکڑنے کا مطلب بھی یکبارگی ختم ہو گیا۔

رات دس بجے ناٹک کی پہلی گھنٹی بجی۔ نہایت رنجیدہ دل سے تمام سلوک کے خلاف خفا ہو کر پردے کے سامنے ایک ہی جگہ پر میں نے جگہ سنبھالی اور وہیں بیٹھ گیا۔ مگر کچھ ہی دیر میں تمام روٹھنا بھول گیا۔ کیسا عمدہ ناٹک تھا۔ زندگی میں میں نے بہت کم ناٹک دیکھے ہیں۔ لیکن ویسا کبھی نہیں دیکھا۔ میگھ نا بذات خود ایک تماشہ تھا۔ اس کا چھ ہاتھ اونچا جسم اور ساڑھے چار ہاتھ پیٹ کا گھیرا تھا۔ سب لوگ کہتے تھے کہ اگر یہ مر گیا تو بیل گاڑی پر لے جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

یہ بہت دنوں کا ذکر ہے اس لئے مجھے تمام واقعہ یاد نہیں رہا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ اس نے جو شجاعت دکھائی وہ ہمارے ہاں کے ہران پہلوانی بھیم کے پارٹ میں ساگوان کی شاخ کندھے پر رکھ کر اور دانت کڑ مڑا کر بھی نہیں دکھا سکتے۔

ڈراپ سین اٹھا۔ معلوم ہوا وہ لکشمن ہی ہوں گے...... کم و بیش بہادری کا اظہار کر رہے تھے۔

[1] بنگال میں جو منظر کے بغیر ناٹک ہوتے ہیں انہیں یاترا کہتے ہیں۔ جیسے یہاں رام لیلا۔

اسی وقت میگھ ناد کہیں سے چھلانگ مار کر سامنے آ دھمکا۔ تمام سٹیج چرمرا کر کانپ اٹھا۔ فٹ لائٹ کے پانچ چھ گولے الٹ کر بجھ گئے اور ساتھ ہی ساتھ خود اس کا پیٹ باندھنے کا زری کا کمر پٹہ بھی تڑاق سے ٹوٹ گیا۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسے بیٹھ جانے کے لئے کئی لوگ خوفزدہ ہو کر چیخ اٹھے کئی لوگ سین ڈراپ کرنے کے لئے چلا اٹھے لیکن بہادر میگھ ناد کسی کی بھی کسی بات سے گھبرایا نہ۔ بائیں ہاتھ کی کمان کو پھینک کر اس نے پتلون کو تھام لیا اور داہنے ہاتھ سے صرف تیر سے ہی جنگ کرنے لگا۔

واہ رے بہادر! واہ رے بہادری تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے طرح طرح کے جنگ دیکھے ہیں مگر ہاتھ میں کمان نہیں، بائیں ہاتھ کی حالت بھی جنگ کے موافق نہیں ہے تاہم محض دائیں ہاتھ اور تیروں کی مسلسل لڑائی کیا کبھی کسی نے دیکھی ہے؟ بلا آخر اس کی ہی جیت ہوئی۔ دشمن کو بھاگ کر جان کی حفاظت کرنی پڑی۔

مسرت کی انتہا نہ تھی محو ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں اس عجیب و غریب لڑائی کے لئے ان کی ہزار بار تعریف کر رہا تھا۔ عین اسی وقت پیٹھ پر انگلی کا دباؤ پڑا۔ منہ پھیر کر دیکھا تو اندر......

وہ آہستہ سے بولا......'' باہر آ شری کانت! جیجی تمہیں بلا رہی ہیں۔''

بجلی کی تار چھو جانے کی مانند میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا......'' کہاں ہیں وہ؟''

'' باہر تو آ بتاتا ہوں۔'' راستے پر آنے سے وہ صرف '' میرے ساتھ چل'' کہہ کر چلنے لگا۔

گنگا کے ساحل پر پہنچ کر دیکھا۔ اس کی ناؤ بندھی ہوئی ہے۔ چپ چاپ ہم دونوں اس پر جا بیٹھے۔ اندر نے ناؤ کھول دی۔

پھر اسی تیرہ تار جنگل کے راستے ہوئے دونوں شاہ جی کی جھونپڑی میں جا پہنچے۔ اس وقت رات شاید زیادہ باقی نہ تھی۔

مٹی کے تیل کے ایک دیئے کی روشنی میں جیجی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی گود میں شاہ جی کا سر رکھا ہوا تھا۔ اور ان کے پاؤں کے قریب ایک کافی لمبا کالا سانپ پڑا تھا۔

جیجی نے ملائم لہجہ میں تمام داستان مختصراً کہہ سنائی۔ آج دوپہر کو کسی گھر سے سانپ پکڑنے کا بلاوا آیا تھا۔ وہاں اس سانپ کو پکڑنے میں جو انعام ملا۔ اس سے اس نے تاڑی پی لی اور شام سے کچھ پیشتر نشہ میں چور ہو کر گھر لوٹ آیا۔ پھر جیجی کے منع کرنے پر بھی وہ اس سانپ کو کھلانے کے لیے تیار ہوا اور دیر تک کھلاتا بھی رہا۔ مگر آخر کار کھیل کو ختم کرنے سے پہلے جب وہ اسے دم سے پکڑ کر ہانڈی میں بند کرنے لگا تو نشے کی جھونک میں آ کر جونہی اس کے منہ کو اپنے منہ کے قریب لا کر بوسہ دے کر اپنا پیار ظاہر کرنے لگا تو اس نے بھی اپنا پیار ظاہر کرنے کے لیے شاہ جی کے گلے پر زور سے بوسہ کا نشان ثبت کر

دیا۔

جیجی نے اپنے میلے آنچل کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ’’شری کانت! اسی وقت انہیں علم ہوا کہ اب وقت زیادہ نہیں ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ آ رے، اب ہم دونوں ساتھ ہی کوچ کریں۔‘‘ سانپ کے سر کو پاؤں کے نیچے دبا لیا اور دونوں ہاتھ سے دم کھینچ کر اتنا لمبا کر کے پھینک دیا۔ اس کے بعد دونوں کا کھیل ختم ہو گیا۔‘‘ اتنا کہہ کر انہوں نے ہاتھ سے نہایت ہی درد کے ساتھ شاہ جی کے چہرے کے اوپر کا کپڑا اٹھا دیا۔ اور نہایت احتیاط سے ان کے نیلے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر کہا...... ’’جانے دو اچھا ہی ہوا اندر ناتھ۔ بھگوان پر میں ذرا سا بھی الزام نہیں دیتی۔‘‘

ہم دونوں میں سے کوئی بھی بول نہ سکا۔ اس گلے سے جو درد بھرا لہجہ التجا اور گھنا فخر ظاہر ہوا۔ اسے جس نے سنا اس کے لیے بھول جانا اس زندگی میں ممکن نہیں ہے مگر یہ فخر کس کے لیے تھا اور التجا بھی کس کے لیے تھی؟

کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولیں...... ’’تم لوگ ابھی بچے ہو لیکن تم دونوں کو چھوڑ کر میرا تو اور کوئی اور نہیں ہے بھائی؟ اس لیے تم سے بھیک مانگتی ہوں کہ ان کا کچھ چارہ کر جاؤ۔‘‘ پھر انگلی سے جھونپڑی کے جنوب کی طرف جنگل دکھا کر کہا...... ’’وہاں ایک جگہ ہے اندر ناتھ، بہت دنوں سے میری آرزو تھی کہ اگر میں مر جاؤں تو اسی جگہ سو جاؤں۔ صبح ہوتے ہی اسی جگہ لے جا کر انہیں سلا دو۔ اس زندگی میں انہوں نے بے شمار مصیبتیں برداشت کی ہیں...... وہاں کچھ سکون حاصل کر سکیں گے۔‘‘

اندر نے پوچھا...... ’’شاہ جی کیا قبر میں دفنائیں جائیں گے؟‘‘

جیجی بولیں...... ’’جب مسلمان ہیں تو قبر میں ہی دفنانا ہو گا بھائی؟‘‘

اندر نے پھر پوچھا...... ’’جیجی کیا تم بھی مسلمان ہو؟‘‘

جیجی بولیں...... ’’ہاں مسلمان نہیں تو اور کیا ہوں؟‘‘

جواب سن کر اندر بھی پریشان ہو اٹھا۔ اس کے چہرے کے جذبہ سے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس جواب کی اسے امید نہ تھی۔ جیجی کو دراصل وہ چاہتا تھا۔ اس لیے اپنے دل میں وہ ایک پوشیدہ آرزو کو پال رہا تھا۔ کہ اس کی جیجی اس کی سوسائٹی کی ایک عورت ہے۔ لیکن مجھے ان کی بات پر یقین نہ ہوا خود ان کے منہ سے قبول کر لینے پر بھی میرے دل میں یہ بات بیٹھ نہ سکی کہ وہ ہندو لڑکی نہیں ہے۔

بقایا رات بھی کٹ گئی۔ اندر مقررہ جگہ پر جا کر قبر کھود آیا اور ہم تینوں نے لے جا کر شاہ جی کے مردہ جسم کو دفنایا۔ گنگا جی کے عین اوپر کنکروں کا ایک ٹیلہ ٹوٹ کر گویا کسی کی آخری آرام گاہ کے لیے خود بخود ہی جگہ بن گئی تھی۔ بیس پچیس ہاتھ نیچے گنگا میا کی دھار تھی اور سر پر جنگلی بیلوں کا جھرمٹ۔ کسی عزیز شے کو احتیاط سے چھپا رکھنے کے لیے ہی یہ جگہ بنائی گئی تھی۔ نہایت ہی افسردہ دل سے ہم تینوں قریب ہی بیٹھے...... اور ایک جان ہماری بغل کے پاس ہی مٹی کے نیچے ابدی نیند سو گئی۔ اب تک بھی آفتاب طلوع نہ ہوا تھا۔ نیچے آہستہ رفتار بھاگیرتھی (گنگا) بہہ رہی تھی۔ کل صبح کیا یہ سوچا تھا کہ آج رات اس طرح بسر ہو گی۔ کون جانتا تھا کہ ایک انسان کا آخری وقت اتنا قریب آ گیا ہے؟

یکا یک جیجی اس قبر پر لیٹ گئی اور ٹوٹ گلے سے چلا کر رو پڑی۔ ’’ماں گنگا، مجھے بھی اپنے قدموں میں پناہ دو۔ میرے لیے اب کہیں اور سہارا نہیں ہے۔‘‘ ان کی یہ پکار تھنا یہ آرزو کتنی روح فرسا حقیقت تھی۔ یہ اس دن میں اتنی سختی سے محسوس نہ کر سکا تھا جتنا اس سے دو دن بعد کر سکا۔ اندر نے ایک مرتبہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بعد اس نڈھال عورت کے جھکے ہوئے سر کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اسی کی طرح نہایت غمناک لہجہ میں کہا...... ’’جیجی تم میرے یہاں چلو...... میری ماں اب بھی زندہ ہیں وہ تمہیں ٹھکرائیں گی نہیں۔ اپنی گود میں اٹھا لیں گی۔ وہ محبت کا مجسمہ ہیں۔ ایک بار تم ان کے سامنے کھڑی ہو جانا۔ چلو، تم ہندو لڑکی ہو جیجی۔‘‘

جیجی کچھ بولی نہیں۔ کچھ دیر اسی طرح بے ہوش پڑی رہیں اور آخر کار اٹھ بیٹھیں۔ اس کے بعد ہم تینوں نے گنگا اشنان کیا۔ جیجی نے ہاتھ کی چوڑیاں اور سہاگ کی کنٹھی توڑ کر گنگا میں بہا دی۔ مٹی سے سر کا سیندور پونچھ کر بیوہ کے لباس میں طلوع آفتاب کے ساتھ انہوں نے کہا کہ شاہ جی میرا خاوند تھا۔

اتنے دنوں بعد آج پہلے پہل انہوں نے کہا کہ شاہ جی ان کا خاوند تھا لیکن اندر کے دل میں یہ بات اچھی طرح جم کر بیٹھتی ہی نہ تھی۔ مشکوک لہجہ میں اس نے دریافت کیا...... ’’مگر تم تو ہندو لڑکی ہو جیجی!‘‘

جیجی بولیں...... ’’ہاں برہمن کی لڑکی ہوں اور وہ بھی برہمن تھے۔‘‘

اندر کچھ دیر تک مبہوت کھڑا رہا پھر بولا...... ’’انہوں نے اپنا دھرم کیوں چھوڑ دیا؟‘‘

جیجی بولیں...... ’’یہ بات میں اچھی طرح نہیں جانتی بھائی! لیکن جب انہوں نے اپنا دھرم بدل دیا تو ان کے ساتھ میرا دھرم بھی کھو گیا۔ عورت ہم مذہب ہوتی ہے۔ ورنہ میں نے اپنے ہاتھوں اپنا دھرم بھی نہیں چھوڑا اور کسی دن اپنے دھرم کے خلاف کوئی فعل بھی نہیں کیا۔‘‘

اندر دکھی لہجے میں بولا...... ’’یہ تو میں دیکھتا ہی ہوں جیجی۔ اس لیے تو ہر گھڑی میرے دل میں یہی بات آتی رہی ہے...... مجھے معاف کرنا جیجی۔ تم یہاں کیسے آ پڑیں۔ تمہاری عقل پر کس طرح پردہ پڑ گیا۔ لیکن اب میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا۔ میرے گھر تمہیں چلنا ہی پڑے گا۔ چلو اسی وقت چلو!‘‘

جیجی دیر تک چپ چاپ کچھ سوچتی رہیں۔ پھر سر اٹھا کر آہستہ آہستہ بولیں...... ’’ابھی میں

کہیں نہیں جاسکوں گی اندرناتھ!''

''کیوں نہیں جاسکو گی جیجی!''

جیجی بولیں...... ''مجھے معلوم ہے کہ وہ کچھ قرض سر پر لاد کر لے گئے ہیں۔ جب تک اس کو ادا نہ کروں تب تک میں کہیں ہل بھی نہیں سکتی۔''

اندر غصے سے کھول اٹھا...... ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ شراب کی دوکان کا، گانجے کی دوکان کا ضرور کچھ دینا ہوگا۔ لیکن اس سے تمہیں کیا سروکار، کس کی مجال ہے کہ تم سے روپیہ مانگ سکے؟ چلو تم میرے ساتھ دیکھوں کون روکتا ہے تمہیں؟''

اتنے غم میں بھی جیجی کو قدرے ہنسی آ گئی بولیں...... ''ارے مجھے روکنے والا خود میرا اپنا دھرم ہے۔ شوہر کا قرض خود میرا اپنا قرض ہے اور ان لینے والوں کو تم کس طرح روک سکو گے بھائی؟ یہ ناممکن ہے۔ آج تم لوگ گھر جاؤ۔ میرے پاس جو کچھ تھوڑا سامان ہے اسے بیچ کر قرض ادا کرنے کی کوشش کروں گی...... کل پرسوں پھر کسی دن آنا......''

اتنی دیر سے میں خاموش تھا اس مرتبہ بولا...... ''جیجی میرے پاس گھر میں اور بھی چار پانچ روپے پڑے ہیں۔ لے آؤں کیا؟'' بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ اٹھ کھڑی ہوگئی اور چھوٹے بچے کی مانند مجھے چھاتی سے لگا کر میری پیشانی کو اپنے ہونٹوں کا بوسہ دے کر میرے منہ کی طرف پیار سے دیکھتی ہوئی بولیں...... ''نہیں بھیا اور لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دن تم پانچ روپے رکھ گئے تھے۔ تمہاری وہ عنایت میں مرتے دم تک یاد رکھوں گی بھیا دعا دیئے جاتی ہوں کہ بھگوان تمہارے دل میں بسیں اور اسی طرح مصیبت زدہ لوگوں کے لیے آنسو بہاتے رہیں۔'' بولتے بولتے ہی ان کی ایک آنکھ ساون بن گئی اور دوسری بھادوں۔

تقریباً آٹھ نو بجے ہم گھر جانے کے لئے تیار ہوئے۔ اس دن وہ ساتھ ساتھ راستے تک پہنچانے آئیں۔ رخصت ہوتے وقت اندر کا ہاتھ پکڑ کر بولیں...... ''اندرناتھ شری کانت کو تو دعا دے دی۔ لیکن تمہیں دعا دینے کی جرأت مجھ میں نہیں ہے۔ تم انسانی دعا سے بعید تر ہو۔ اس لیے میں نے آج دل ہی دل میں تمہیں بھگوان کے مقدس قدموں میں سونپ دیا ہے۔ وہ تمہیں اپنالیں۔''

اندر کو انہوں نے پہچان لیا تھا۔ منع کرتے ہوئے بھی اندر نے ان کے قدموں کی خاک لے کر پرنام کیا۔ اور روتے روتے کہا۔ ''جیجی اس جنگل میں تمہیں تنہا چھوڑ کر جانے کا مجھے کسی طرح بھی حوصلہ نہیں ہوتا تس۔ میرا دل ایسا کہہ رہا ہے کہ اب تمہیں پھر دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔''

جیجی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ منہ پھیر کر آنکھیں پونچھتی ہوئی وہ اسی جنگلی راستہ سے اپنی

غم سے معمور اسی جھونپڑی میں واپس لوٹ گئی۔ جہاں تک نظر آتی رہیں۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا مگر انہوں نے ایک مرتبہ بھی لوٹ کر نہ دیکھا۔ اسی طرح سر نیچا کئے ایک ہی چال سے چلتی ہوئی وہ نظر سے اوجھل ہوگئیں۔ ہم دونوں محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک بار بھی لوٹ کر کیوں نہیں دیکھا؟

تین دن بعد سکول سے چھٹی ہوتے ہی باہر آ کر دیکھا کہ اندرناتھ پھاٹک کے باہر کھڑا ہے۔ اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ پاؤں میں جوتے نہیں تھے وہ گھٹنوں تک مٹی سے بھرے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہوا اٹھا بڑے آدمی کا لڑکا تھا اور بظاہر شوقین مزاج بھی تھا۔ ایسی حالت میں نے اس کی کبھی نہ دیکھی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اور کسی نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔ اشارہ سے مجھے میدان کی طرف لے جا کر اس نے کہا...... ''جیجی نہیں ہیں...... کہیں چلی گئی ہیں۔'' میرے چہرے کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا بولا...... ''کل سے کتنی ہی جگہ جا کر تلاش کر آیا ہوں لیکن کہیں بھی وہ نظر نہیں آئیں۔ تیرے لئے وہ ایک چٹھی لکھ کر رکھ گئی ہیں یہ لے۔'' اتنا کہہ کر ایک تہہ کیا ہوا زرد رنگ کا کاغذ میرے ہاتھ میں دے کر وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا دوسری طرف چل دیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا دل غم سے اتنا دب رہا تھا کہ کسی کے ساتھ ذکر کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔

میں وہیں سے اسی جگہ بیٹھ گیا اور اور [illegible]ی کھول کر اس کاغذ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا ایک زمانہ گزرنے کے بعد اگرچہ وہ تمام کا تمام یاد نہیں رہا۔ تاہم دماغ پر زور دے کر بہت سی باتیں یاد کر سکتا ہوں لکھا تھا...... ''شری کانت! رخصت ہوتے وقت میں تم لوگوں کو دعا دیئے جاتی ہوں، صرف آج ہی نہیں جتنے دن زندہ رہوں گی تمہیں دعا دیتی رہوں گی۔ لیکن میرے لئے تم افسوس مت کرنا۔ اندرناتھ مجھے ڈھونڈتا پھرے گا۔ یہ میں جانتی رہوں گی۔ لیکن میرے لئے تم افسوس مت کرنا۔ یہ میں جانتی ہوں مگر تم اسے سمجھا کر روک دینا۔ میری تمام باتیں آج ہی نہیں سمجھ سکو گے مگر بڑے ہونے پر ایک دن ضرور سمجھو گے۔ اس امید سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اپنی کہانی اپنے ہی منہ سے کہی جا سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں نہیں کہہ سکی۔ ''کہوں کہوں'' سوچتے ہوئے بھی نہ جانے خاموش رہ گئی لیکن اگر آج نہ کہہ سکی تو پھر کبھی کہنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔

''میری کہانی صرف میری کہانی ہی نہیں بھائی!...... میرے شوہر کی کہانی ہے۔ اور پھر وہ بھی کچھ اچھی کہانی نہیں ہے۔ میری اس زندگی کے گناہوں کی تعداد کتنی ہے یہ تو میں نہیں جانتی لیکن گزشتہ زندگی کے جمع شدہ گناہوں کی حد بہت نہیں۔ اس میں رتی بھر بھی شبہ نہیں۔ اس لئے جب جب بھی میں نے کہنا چاہا۔ تب تب میرے دل میں یہی آیا ہے کہ عورت ہو کر اپنے منہ سے شوہر کی برائی کر کے گناہ کے اس بوجھ کو اور بھی بھاری نہ بناؤں گی اور جب وہ عقبےٰ سدھار گئے اس لئے اس کے کہنے میں کوئی

برائی نہیں۔ یہ میں تسلیم نہیں کرتی۔ تاہم نہ معلوم کیوں اپنی اس بے انتہا دکھ بھری کہانی کو تمہیں سنائے بغیر میں کسی طرح بھی رخصت لینے کے قابل نہیں ہوں۔''

''شری کانت! تمہاری اس مصیبت زدہ بہن کا نام ان دا ہے۔ شوہر کا نام پوشیدہ کیوں رکھ رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے اس خط کو آخر تک پڑھنے کے بعد خود بخود معلوم ہو جائے گی۔''

''میرے باپ بڑے آدمی ہیں۔ ان کے کوئی لڑکا نہیں۔ ہم صرف دو بہنیں تھیں۔ اس لئے میرے باپ نے میرے شوہر کو ایک غریب کے گھر سے لا کر اپنے پاس رکھ کر، پڑھا لکھا کر، انسان بنانا چاہا تھا۔ وہ انہیں پڑھنا لکھنا تو ضرور سکھا سکے لیکن انسان، بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میری بڑی بہن بیوہ ہونے کے بعد گھر ہی رہتی تھی۔ اس کا خون کر کے وہ ایک دن لاپتہ ہو گئے۔ یہ برا فعل انہوں نے کیوں کیا اس کا باعث تم ابھی کم سن ہو اس لئے نہ سمجھ سکو گے پھر بھی کسی دن تم جان جاؤ گے۔ لیکن بتاؤ شری کانت! یہ کتنا بڑا آزار ہے۔ یہ کتنی جان لیوا ندامت ہے۔ پھر بھی تمہاری جیجی نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ مگر شوہر بن کر جس بے عزتی کی آگ کو انہوں نے اپنی بیوی کے دل میں جلا دیا تھا۔ اس کے شعلوں کو تمہاری جیجی آج تک بھی بجھا نہیں سکی۔ لیکن جانے دو اس بات کو!......''

''مندرجہ بالا واقعہ کے سات سال بعد انہیں پھر دیکھ سکی۔ جس بھیس میں تم نے انہیں دیکھا تھا۔ اسی بھیس میں وہ ہمارے گھر کے سامنے سانپ کا کھیل دکھا رہے تھے۔ انہیں اور تو کوئی پہچان نہ سکا۔ مگر میں نے پہچان لیا۔ میری آنکھوں کو وہ دھوکہ نہ دے سکے۔ سنا ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے میرے ہی لئے کیا تھا لیکن یہ جھوٹ ہے۔ پھر بھی ایک دن گہری رات میں کھڑکی کا دروازہ کھول کر شوہر کی خاطر میں نے گھر کو ترک کر دیا اور سب نے یہی سنا سب نے یہی سمجھا کہ ان دا کلنک کا ٹیکہ لگا کر گھر سے نکل گئی ہے۔

کلنک کا یہ بوجھ ہمیشہ ہی مجھے اپنے اوپر لادے پھرنا ہوگا۔ کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ شوہر کے جیتے جی تو اپنے آپ کو ظاہر نہ کر سکی۔ اپنے باپ کو پہچانتی تھی۔ وہ کبھی کسی طرح بھی اپنی اولاد کا خون کرنے والے کو معاف نہیں کر سکتے۔ آج اگرچہ وہ ڈر نہیں ہے۔ آج جا کر ان سے سب حال کہہ سکتی ہوں۔ مگر اتنے دنوں بعد اس پر کون یقین کرے گا؟ اس لئے باپ کے گھر میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہاں شوہر کا جو قرض تھا وہ سب ادا ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے پاس سونے کی دو بالیاں چھپا کر رکھ چھوڑی تھیں۔ انہیں آج بیچ دیا ہے۔ تم جو پانچ روپے ایک دن رکھ گئے تھے۔ انہیں میں نے خرچ نہیں کیا۔ بڑے راستے کے موڑ پر جو مودی کی دکان ہے۔ اس کے مالک کے پاس انہیں رکھ دیا ہے۔

مانگتے ہی وہ تمہیں مل جائیں گے۔ دل میں ناراض نہ ہونا بھائی۔ وہ روپے تو ضرور میں نے لوٹا دیئے ہیں لیکن تمہارے اس کچے نازک دل کو اپنے دل میں رکھ کر لئے جاتی ہوں اور تمہاری جیجی کا یہ ایک حکم ہے شری کانت! کہ میری یاد کر کے اپنے دل کو ناشاد نہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ تمہاری جیجی جہاں کہیں بھی رہیں گی، اچھی ہی رہیں گی کیونکہ تکالیف کو برداشت کرتے کرتے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ اس کے جسم پر اب کسی بھی مشکل کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کسی طرح بھی اسے تکلیف پہنچ نہیں سکتی۔ میرے دونوں بھائیو! کیا کہہ کر تمہیں دعا دوں۔ ڈھونڈے سے بھی مجھے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے محض یہی کہے جاتی ہوں بھگوان اگر شوہر پرست بیوی کی بات رکھتے ہیں تو وہ تمہاری دوستی کو ہمیشہ کے لئے قائم رکھیں گے۔

تمہاری جیجی

''ان دا''

آج میں اکیلا مووی کی دکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا پتہ پا کر مووی نے ایک چھوٹا سا پرانا چیتھڑا باہر نکالا اور گانٹھ کھول کر اس میں سے سونے کی دو بالیاں اور پانچ روپے نکالے۔ انہیں میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ ''بہو یہ دو بالیاں مجھے اکتیس روپے میں بیچ کر شاہ جی کا تمام قرض چکا کر چلی گئی ہیں مگر کہاں گئی ہیں یہ معلوم نہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ کس کا کتنا قرض تھا اس کا حساب بتا کر بولا...... ''جاتے وقت بہو کے ہاتھ میں کل ساڑھے پانچ آنے پیسے تھے۔'' یعنی بائیس پیسے لے کر اس بے کس و بے بس عورت نے دنیا کے دشوار گزار راستہ کا اکیلے سفر شروع کر دیا ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کے یہ دونوں بچے کہیں اسے سہارا دینے کے لیے بیکار ہی پریشان نہ ہوں۔ اس خوف سے بغیر کچھ کہے وہ گھر سے چلی گئی ہیں۔ کہاں؟ یہ بھی کسی کو انہوں نے معلوم نہیں ہونے دیا...... صرف اتنا ہی نہیں بلکہ میرے پانچ روپے بھی قبول نہیں کئے پھر بھی دل میں یہ سمجھ کر کہ انہوں نے لے لئے ہیں۔ میں مسرت اور فخر سے نامعلوم کتنے دنوں تک نہ جانے کتنے گلہائے فردوس کا تخیل قائم کرتا رہا۔ لیکن وہ سب یکا یک مٹی میں مل گئے۔ آنکھوں میں پانی چھلچھلا آیا۔ جسے اس بوڑھے سے چھپانے کے لئے میں تیزی سے باہر چل دیا۔ بار بار دل میں یہی کہنے لگا کہ اندر سے تو انہوں نے کتنے ہی روپے لئے لیکن مجھ سے کچھ بھی نہیں لیا...... جاتے وقت نہیں کہہ کر واپس چلی گئیں۔

اب میرے دل میں وہ جذبہ نہیں ہے۔ عمر بڑھ جانے پر اب میں نے سمجھا ہے کہ میں نے ایسا کون سا ثواب کیا تھا جو انہیں خیرات دے سکتا۔ آگ کے ان روشن شعلوں میں جو کچھ بھی میں دیتا جل کر خاک ہو جاتا...... اس لئے جیجی نے میرا دان واپس کر دیا...... مگر اندر؟ اندر اور میں کیا ایک ہی دھات کے بنے ہوئے کہ جہاں وہ دان کرے میں بھی بے حیائی سے اپنا ہاتھ بڑھا دوں؟ اس کے علاوہ یہ بھی تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ آخر کس کا منہ دیکھ کر انہوں نے اندر کے آگے ہاتھ پھیلایا تھا...... خیر جانے بھی دو ان باتوں کو۔ اس کے بعد بے شمار جگہ میں گھوما پھرا ہوں لیکن ان جلی آنکھوں سے میں انہیں کہیں

بھی دیکھ نہ سکا۔ لیکن دل کے اندر وہ ہنستا ہوا چہرہ ہمیشہ ہی ویسا نظر آتا رہتا ہے۔ ان کے اخلاق کی کہانی کو یاد کر کے جب کبھی میں سر جھکا کر دل ہی دل میں انہیں پرنام کرتا ہوں تو صرف یہی بات میرے دل میں آتی ہے کہ بھگوان یہ تمہارا کیسا ظلم ہے؟ ہمارے اس ستی ساوتری کے ملک میں تم نے شوہر کی خاطر بیوی کو بے انتہا دکھ دے کر ستی کی فضیلت کو روشن سے روشن تر کر کے دنیا کو دکھایا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں ان کی تمام مصیبتوں اور مشکلوں کو ابدی شہرت میں تبدیل کر کے تمام نسوانی دنیا کو فرض کے راستہ پر چلانے کی تمہاری خواہش ہے؟ اس کو بھی میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ مگر ہماری ایسی جیجی کی قسمت میں اتنا بڑا آزار اور اتنی بڑی بدنامی کیوں رقم کر دی......؟ کس لئے تم نے ایسی ستی کے منہ پر بدنامی کی گہری چھاپ لگا کر اسے ہمیشہ کے لئے دنیا سے جلا وطن کر دیا؟ ان کا تم نے کیا نہیں چھڑا لیا؟ ان کی ذات چھڑائی۔ ان کا دھرم چھڑایا...... سوسائٹی، دنیا، عزت اور شہرت بھی سبھی کچھ تو چھڑا لیا اور جو بے پایاں دکھ دے دیا ہے اس کا تو میں آج بھی گواہ ہوں۔ اس کا بھی مجھے افسوس نہیں جگدیشور! مگر جن کی سند سیتا ساوتری وغیرہ عورتوں کے قریب ہے۔ انہیں ان کے ماں باپ، رشتہ دار، دوست دشمن وغیرہ نے کس شکل میں سمجھا۔ عصمت فروش کی شکل میں، رنڈی کی شکل میں...... اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا اور دنیا کو بھی کیا حاصل ہوا......؟

ہائے رے کہاں ہیں وہ رشتہ دار بھائی بہن؟ کاش ایک دفعہ بھی مجھے علم ہو جاتا۔ پھر وہ ملک کتنی ہی دور کیوں نہ ہوتا۔ اس ملک سے باہر ہی کیوں نہ ہوتا۔ تو بھی میں نے ضرور وہاں جا کر کہا ہوتا...... یہی ہیں ہماری ان دا، اور یہی ہے ان کی لازوال کہانی۔ تم نے اپنی جس لڑکی کو کل کلنکنی سمجھ لیا ہے اس کا نام اگر صبح ایک دفعہ بھی لے لیا کرو گے تو بے شمار گناہوں سے نجات حاصل کر جاؤ گے۔

اس واقعہ سے میں نے ایک حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ اس سے پیشتر بھی میں ایک دفعہ کہہ چکا ہوں کہ عورت کے کلنک کی بات پر میں آسانی سے یقین نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے جیجی یاد آ جاتی ہیں۔ اگر ان کی تقدیر میں بھی اتنی بڑی بدنامی ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں اور کیا نہیں ہو سکتا۔ ایک میں ہوں اور ایک وہ ہیں جو ہر وقت کے اور ہر گناہ و ثواب کے گواہ ہیں۔ ان کو چھوڑ کر دنیا میں ایسا اور کوئی نہیں جو ''ان دا'' کو ذرا سے پیار کے ساتھ یاد کرے اسی لئے سوچتا ہوں کہ نہ جانتے ہوئے عورت کے کلنک کی بات پر بے یقینی کر کے دھوکہ کھا لیا اچھا ہے مگر یقین کر کے گناہ کا حقدار بننا اچھا نہیں۔

اس کے بعد بہت دنوں تک اندر کو نہ دیکھا۔ گنگا کے ساحل پر سیر کرنے جاتا تھا تو دیکھتا تھا کہ اس کی ناؤ کنارے پر بندھی ہوئی ہے۔ وہ پانی میں بھیگ رہی ہے اور دھوپ میں پھٹ رہی ہے۔ صرف ایک مرتبہ اور ہم دونوں اس ناؤ پر بیٹھے تھے۔ اس ناؤ پر وہی ہمارا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد نہ وہ ہی اس

ناؤ پر بیٹھا اور نہ میں ہی۔ وہ دن خوب یاد ہے۔ صرف اسی لئے نہیں کہ وہ ہمارے کشتی کے سفر کے خاتمے کا دن تھا بلکہ اس لئے کہ اس دن خود غرضی کی جو برہنہ شکل میں نے دیکھی تھی اسے آج تک بآسانی بھول نہ سکا۔ لیجئے وہ داستان بھی عرض کئے دیتا ہوں......

وہ کڑاکے کی سردی کی شام تھی۔ پہلے دن خوب موسلا دھار بارش ہو چکی تھی۔ اس لئے سردی سوئی کی مانند جسم میں چبھتی تھی۔ آسمان میں پورا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ چاروں طرف چاندنی تیر رہی تھی۔ یکایک اندر آ ٹپکا بولا...... ''تھیٹر دیکھنے چلے گا؟'' تھیٹر کے نام سے میں یکبارگی اچھل پڑا...... اندر بولا۔ ''تو پھر کپڑے پہن کر جلدی ہمارے گھر آ جا۔'' پانچ منٹ میں ایک ریپر لے کر باہر نکل پڑا۔ اس جگہ ریل گاڑی سے جانا ہوتا تھا۔ سوچا گھر سے گاڑی کر کے جانا ہوگا...... اس لئے اتنی جلدی ہے۔

اندر بولا...... ''ایسا نہیں، ہم لوگ کشتی پر چلیں گے۔ میرا تمام جوش جاتا رہا کیونکہ گنگا میں ناؤ کو اس طرف چلا کر لے جانا پڑے گا۔ اور اس لئے بہت زیادہ دیر ہو جانے کا امکان تھا۔ شاید وقت پر پہنچ بھی نہ سکیں۔ اندر بولا...... ''ہوا تیز ہے، دیر نہ ہوگی۔ ہمارے نوین بھیا کلکتہ سے آئے ہیں۔ وہ گنگا سے ہی جانا چاہتے ہیں۔''

خیر ڈانڈے لے کر بادبان لگا کر ٹھیک طرح سے ہم لوگ ناؤ میں بیٹھ گئے۔ نوین بھیا بہت دیر میں گھاٹ پر پہنچے۔ چاند کی روشنی میں انہیں دیکھ کر میں تو ڈر گیا۔ کلکتے کے خوفناک بابو۔ ریشم کے موزے، چمچماتے پمپ شو۔ اوپر سے نیچے تک اوور کوٹ پہنے ہوئے، گلے میں گلوبند، ہاتھ میں دستانے، سر پر ٹوپی...... سردی کے خلاف ان کی احتیاط کی حد نہ تھی۔ ہماری اس پیاری کشتی کو انہوں نے نہایت ''ردی'' کہہ کر اپنی سخت رائے ظاہر کر دی۔ اور اندر کے کندھے پر بوجھ ڈال کر اور میرا ہاتھ پکڑ کر بڑی مشکل سے، بڑی احتیاط کے ساتھ وہ ناؤ کے درمیان جا کر بیٹھ گئے۔

''تیرا کیا نام ہے رے؟''

ڈرتے ڈرتے میں نے کہا...... ''شری کانت!''

انہوں نے بے اعتنائی کے ساتھ منہ بنا کر کہا...... ''شری...... کانت...... صرف کانت ہی کافی ہے۔ جا حقہ تو بھر لا۔ ارے اندر! حقہ چلم کہاں ہے؟ اس چھوکرے کو دو، تمبا کو بھر دے۔''

ارے باپ رے کوئی اپنے نوکر کو بھی اس طرح حقارت سے حکم نہیں دیتا۔ اندر گھبرا کر بولا ...... ''شری کانت! تو آ کر کچھ دیر ڈانڈ پکڑ رکھ! میں حقہ بھرے دیتا ہوں۔''

اس کا کچھ جواب نہ دے کر میں خود ہی حقہ بھرنے لگا کیونکہ وہ اندر کی موسی کے لڑکے تھے۔ کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ اور حال ہی میں انہوں نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ لیکن میرا دل بگڑ اٹھا۔

تمبا کو بھر کر حقہ ہاتھ میں دیتے ہی انہوں نے خوش ہو کر پیتے پیتے پوچھا...... ''تو کہاں رہتا ہے رے کانت؟ تیرے جسم پر وہ کالا سا کیا ہے؟...... ریپر ہے۔ آہا، ریپر کی کیا ہی شان ہے۔ اس کے تیل کی خوشبو سے تو بھوت بھی بھاگ جائیں۔ چھوکرے...... پھیلا کر بچھا تو دے یہاں اسے، بیٹھیں اس پر۔'' ...... ''میں دیتا ہوں نوین بھیا! مجھے سردی نہیں لگتی، یہ لو۔'' کہہ کر اندر نے اپنے جسم کی الوان فوراً اتار کر پھینک دی۔ وہ اسے مزے سے بچھا کر بیٹھ گیا اور آرام سے تمبا کو پینے لگا۔

موسم سرما کی گنگا کا پاٹ زیادہ نہ تھا۔ آدھ گھنٹے میں ہی ناؤ دوسرے کنارے سے جا ٹکرائی۔ ساتھ ہی ساتھ ہوا بند ہو گئی۔

اندر بے قرار ہو کر بولا...... ''نوین بھیا! یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔ ہوا بند ہو گئی ہے اب تو بادبان چلے گا نہیں۔''

نوین بھیا بولے...... ''اس چھوکرے کے ہاتھ میں دے دو نا، ڈانڈ کھینچے۔''

کلکتہ کے باشندے نوین بھیا کی واقفیت عامہ پر کچھ ہلکی سی ہنسی ہنس کر اندر نے کہا۔ ''ڈانڈا کوئی نہیں لے جا سکتا نوین بھیا! اس ریت کو دھکیل کر جانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ ہمیں لوٹنا پڑے گا۔''

یہ تجویز سن کر نوین بھیا لمحہ بھر کے لئے آگ بگولا ہو گئے۔ ''تو پھر لے کیوں آیا بدبخت! جس طرح بھی ہو مجھے وہاں پہنچانا ہی ہوگا۔ مجھے تھیٹر میں ہارمونیم بجانا ہی ہوگا۔ ان کا خاص اصرار ہے۔''

اندر بولا...... ''ان کے پاس بجانے والے اور بھی ہیں نوین بھیا، تمہارے نہ جانے سے ان کا کام اٹکا نہ رہے گا۔''

''اٹکا نہ رہے گا؟ اس گنوار علاقہ کے چھوکرے بجائیں گے ہارمونیم! چل جس طرح ہو ویسے ہی لے چل۔'' یہ کہہ کر انہوں نے جس طرح کی شکل بنائی اس سے میرا تمام جسم جل اٹھا۔ ان کا ہارمونیم بجانا بھی بعد میں ہم نے سنا لیکن وہ کیسا تھا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔

اندر کو مصیبت میں پڑے دیکھ کر میں نے آہستہ سے کہا...... ''اندر کیا رسی سے کھینچ کر لے جانے سے کام نہ چلے گا؟'' بات ختم ہونے سے پیشتر ہی میں چونک اٹھا۔ وہ اس طرح دانت کٹکٹا اٹھے کہ ان کا وہ چہرہ آج بھی مجھے یاد آ جاتا ہے۔ بولے...... ''تو پھر جا، کھینچتا کیوں نہیں؟ جانور کی طرح بیٹھا کیوں ہے؟''

اس کے بعد ایک دفعہ اندر اور ایک دفعہ میں باری باری سے رسی کھینچتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کہیں اونچے کنارے کے اوپر سے، کہیں نیچے اتر کر اور گاہے گاہے برف کی مانند اس سرد پانی میں

گھس کر ہمیں نہایت تکلیف کے ساتھ کشتی کو آگے لے جانا پڑا اور اس کے علاوہ کئی دفعہ بابو صاحب کا حقہ بھرنے کے لئے بھی کشتی کو روکنا پڑا۔ لیکن بابو بدستو جم کر بیٹھے رہے...... ذرا سی بھی مدد انہوں نے نہ کی۔ اندر نے ایک بار ان سے چپو پکڑنے کو کہا تو جواب دیا کہ ''میں دستانے کھول کر ایسی سردی میں نمونیا کو بلانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' اندر نے کہنا چاہا...... ''انہیں کھولے بغیر ہی......''

''ہاں قیمتی دستانوں کو مٹی کر ڈالوں، یہی نا...... لے...... جا جو کرنا ہو کر۔''

درحقیقت ایسے خود غرض انسان زندگی میں بہت ہی کم دیکھے ہیں۔ ان کے ایک واہیات شوق کو پورا کرنے کے لئے ہم لوگوں کو جو ان سے عمر میں بھی چھوٹے تھے۔ اتنی تکلیف برداشت کرتے ہوئے اپنی آنکھوں دیکھ کر بھی ان کا پتھر دل ذرا سا بھی نہ پسیجا۔ مبادا ذرا سی سردی انہیں بیمار نہ کر دے۔ ایک چھینٹا پانی پڑ جانے سے ان کا قیمتی اوورکوٹ خراب نہ ہو جائے یا ہلنے جلنے سے انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسی خوف سے وہ بالکل بے جان ہو کر، بیٹھے رہے اور چلا چلا کر احکام کی جھڑی لگاتے رہے۔

اور بھی ایک آفت آئی...... ''گنگا کی موافق ہوا میں بابو صاحب کی بھوک بھی بھڑک اٹھی۔ اور دیکھتے دیکھتے کشتی کے ہچکولوں سے اور بھی تیز ہو اٹھی چلتے چلتے رات کے دس بج گئے۔ تھیٹر پہنچتے پہنچتے دو بج جائیں گے۔ یہ سن کر بابو صاحب تقریباً پاگل سے ہو گئے اور جب رات کے گیارہ بجے تو کلکتے کے بابو بے قابو ہو کر بولے۔ ''ہاں رے اندر! قریب ہی کہیں ہندوستانیوں کی کوئی بستی وغیرہ ہے یا نہیں چڑوا وغیرہ کچھ ملے گا؟''

اندر بولا...... ''سامنے ہی ایک خوب بڑی بستی ہے نوین بھیا، سب چیزیں ملتی ہیں۔'' ''تو پھر چل چلا...... ارے چھوکرے...... ذرا کھینچ نہ زور سے...... کیا کھانے کو نہیں ملتا؟ اندرا اپنے ساتھی سے کہنا، تھوڑا اور زور کے ساتھ کھینچ کر چلے۔''

اندر یا میں کسی نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ جس طرح چل رہے تھے اسی طرح چلتے ہوئے ہم تھوڑی دیر میں ایک گاؤں کے قریب جا پہنچے۔ اس جگہ کنارہ ڈھلوان اور کشادہ ہوتا ہوا پانی کے ساتھ مل گیا تھا۔ ناؤ کو پوری طاقت کے ساتھ دھکا دے کر اور تھوڑے پانی میں کر کے ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بابو صاحب بولے...... ''ہاتھ پاؤں کچھ سیدھے کرنے ہوں گے اترنا چاہتا ہوں۔'' اس لئے اندر نے انہیں کندھے پر اٹھا کر نیچے اتار دیا۔ وہ چاندنی کی بہار میں گنگا کی چمکتی ہوئی ریت پر چہل قدمی کرنے لگے۔

ہم دونوں ان کی اشتہا کو مٹانے کے لئے گاؤں کے اندر گھسے۔ اگرچہ ہم لوگ جانتے تھے کہ اتنی رات گزرے اس غریب بستی میں کھانا ملنا آسان کام نہیں ہے تاہم کوشش کئے بغیر بھی چھٹکارہ نہ تھا۔

اس کے علاوہ اکیلے رہنے کی بھی خواہش نہ تھی۔ بابو صاحب کہتے ہی اندر اسی دم بول اٹھا...... نوین بھیا اکیلے تمہیں ڈر لگے گا...... ہمارے ساتھ تھوڑا گھومنا بھی ہو جائے گا۔ یہاں پر کوئی چور وور نہیں ہے۔ ناؤ کوئی نہیں لے جائے گا، چلے نہ چلو؟''

نوین بھیا اپنے چہرے کو بگاڑ کر بولے...... ''ڈر! ہم لوگ ورزی پاڑے کے لڑکے ہیں۔ ملک الموت سے بھی نہیں ڈرتے...... یہ جانتے ہو۔ لیکن بایں ہمہ گندی بستی میں ہم نہیں جاتے۔ سالوں کے جسم کی بدبو اگر ناک میں چلی جائے تو ہماری طبیعت خراب ہو جائے۔'' دراصل ان کا دلی منشا یہ تھا کہ میں ان کے پہرے پر مقرر ہو کر ان کا حقہ بھرتا رہوں۔

لیکن ان کے سلوک سے میں دل ہی دل میں اتنا ناراض ہو گیا تھا کہ اندر کے اشارہ کرنے پر بھی میں کسی طرح اس آدمی کے ساتھ اکیلے رہنے پر رضامند نہ ہوا۔ اندر کے ساتھ ہی چل دیا۔

ورزی پاڑے کے بابو صاحب نے ہاتھ سے تالی دے کر گانا شروع کیا۔

بہت دور تک ان کے ناک کے لہجہ میں گانے کی متعارف آواز ہم لوگوں کو سنائی دیتی رہی۔ اندر خود بھی دل میں اپنے بھائی کے رویہ سے نہایت شرمندہ اور ناراض ہو گیا تھا۔ آہستہ سے بولا...... ''یہ کلکتے کے بابو ٹھہرے، ہماری طرح آب و ہوا برداشت نہیں کر سکتے......'' ''سمجھے شری کانت!''

میں نے کہا...... ''ہوں۔''

اندر ان کی غیر معمولی واقفیت کا تعارف (شاید میری عقیدت کشش کرنے کے لئے ہی) کراتے ہوئے چلنے لگا...... بات چیت کے دوران میں اس نے یہ بھی کہا کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں بی۔ اے پاس کر کے ڈپٹی ہو جائیں گے۔ خیر جو ہو، اب اتنے دنوں بعد بھی اس وقت وہ کہاں کے ڈپٹی ہیں یا نہیں وہ رتبہ حاصل ہوا یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈپٹی ضرور ہو گئے ہوں گے۔ ورنہ گاہے گاہے بنگالی مجسٹریٹوں کی اتنی شہرت کس طرح ہوتی۔ اس وقت وہ شباب کی پہلی منزل میں تھے۔ سنتے ہیں کہ زندگی کے اس زمانہ میں دل کی وسعت، اور ہمدردی کا جذبہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے اتنا پھر کبھی نہیں بڑھتا۔ لیکن ان کچھ گھنٹوں کی صحبت میں ہی جو نمونہ انہوں نے دکھایا اتنے عرصہ کے بعد بھی وہ فراموش کیا نہیں جا سکتا۔ خوشی ہے کہ ایسے نمونے قسمت سے ہی کبھی کبھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ ورنہ بہت دیر پہلے ہی یہ دنیا باقاعدہ پولیس تھانہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی لیکن رہنے دو اب اس بات کو۔

قارئین کو یہ اطلاع دینا نہایت ضروری ہے کہ بھگوان بھی ان پر غصہ ہو گئے تھے۔ اس طرف کے راہ گھاٹ دوکان ہاٹ سب اندر کو معلوم تھے۔ وہ جا کر مودی کی دکان پر حاضر ہوا۔ لیکن دکان بند تھی اور دوکاندار سردی کے خوف سے دروازے، کھڑکیاں بند کر کے گہری نیند میں محو تھا۔ نیند کی وہ گہرائی کتنی

اتھاہ ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں کو لکھ کر بتائی نہیں جا سکتی جنہیں خود اس کا تجربہ نہ ہو۔ یہ لوگ تو نکمے اور بیمار زمیندار ہیں اور نہ بہت بوجھ سے دبے ہوئے، لڑکی کی شادی کے جہیز کی فکر میں مبتلا بنگالی گرہستی۔ اس لئے سونا جانتے ہیں۔ دن بھر محنت شاقہ کرنے کے بعد جونہی انہوں نے چارپائی پکڑی کہ پھر گھر میں آگ لگائے بغیر صرف چلا کر یا دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں جگا دوں گا...... ایسا عہد اگر خود ہمیشہ سچ بولنے والے ارجن بھی، جیدرتھ کو مارنے کی بجائے کر بیٹھتے تو یہ بات قسم کھا کر کہی جا سکتی ہے کہ انہیں بھی جھوٹے عہد کے لئے جل کر مر جانا پڑتا۔

ہم دونوں باہر کھڑے ہو کر اونچی آواز میں چلا کر اور جس قدر بھی مکر و فریب انسانی دماغ میں آ سکتے ہیں ان سب کو یکے بعد دیگرے آزما کر آدھے گھنٹے کے بعد خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ مگر گھاٹ پر آ کر دیکھا تو وہاں آدم نہ آدم زاد۔ چاندنی میں جہاں تک نظر دوڑتی تھی۔ وہاں تک کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ ''درزی پاڑے'' کا کہیں کوئی نشان نہ تھا۔ ناؤ بدستور پڑی ہوئی تھی ...... پھر بابو صاحب کہاں گئے؟ ہم دونوں پوری طاقت سے چلا اٹھے ...... ''نوین بھیا!'' مگر کہیں کوئی نہیں ہم لوگوں کی اضطراب بھری پکار بائیں اور دائیں طرف کے خوب اونچے کناروں سے ٹکرا کر ناپید ہوتی ہوئی بار بار واپس آنے لگی۔ قریب کے رقبہ میں، سردی کی وجہ سے گاہے گاہے بھیڑیوں کی آنے کی بات بھی سنی جاتی تھی اور یہاں کے کسان بھیڑیوں کے اس گروہ کی مصیبت سے پریشان تھے۔ اچانک اندر نے اسی بات کو دوہرایا۔ ''کہیں کوئی بھیڑیا تو اٹھا نہیں لے گیا؟'' ڈر کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ...... یہ کیا کہتے ہو؟ اس سے پہلے ان کے ناروا اور غیر مہذب سلوک سے میں سچ مچ ہی خفا ہو اٹھا تھا۔ لیکن اتنی بڑی بددعا تو میں نے انہیں نہ دی تھی۔ دفعتہً ہم دونوں کی نظر کچھ دور ریت پر پڑی ہوئی کسی چمکتی ہوئی شے پر گئی۔ قریب جا کر دیکھا تو ان کے بیش قیمت پمپ شو کا ایک فرد ہے۔ اندر گیلی ریت پر لوٹ گیا۔ ''ہائے شری کانت ان کے ساتھ موسی بھی تو آئی ہیں۔ اب میں گھر واپس نہ جاؤں گا۔'' اب آہستہ آہستہ سب بات صاف ہونے لگی۔ جس وقت ہم لوگ مودی کی دکان پر اسے جگانے کی فضول کوشش کر رہے تھے۔ اسی وقت اس طرف کتوں کا ایک جھنڈ اکٹھا ہو کر شور و غل کر کے اس حادثہ کی خبر ہمارے گوش گزار کرنے کے لئے بیکار محنت کر رہا تھا۔ یہ بات اب بالکل صاف ہو گئی۔ اس وقت بھی دور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ بھیڑیئے انہیں کھینچ لے جا کر جس جگہ انہیں کھا رہے ہیں وہیں آس پاس کھڑے ہو کر یہ کتے بھونک رہے ہیں۔

اچانک اندر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور بولا ...... ''میں وہاں جاؤں گا'' میں نے ڈر کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ...... ''پاگل ہو گئے ہو بھیا'' اندر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ناؤ پر جا کر اس نے کندھے پر بلی رکھ لی اور ایک کافی لمبی چھری جیب سے نکال کر بائیں ہاتھ میں لے لی اور کہا ...... ''تو اسی جگہ ٹھہر شری کانت! اگر میں نہ آیا تو واپس جا کر میرے گھر اطلاع دے دینا میں چلتا ہوں۔''

اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا مگر دونوں آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ اس کی فضول ہی محض اچھل کود نہ تھی کہ ہاتھ پکڑ کر یونہی ڈر کی دو چار باتیں کہنے سے اس کا جوش پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔ میں یقیناً جانتا تھا کہ کسی طرح بھی وہ روکا نہیں جا سکتا...... وہ ضرور جائے گا جنہیں روز اول سے خوف سے واسطہ نہ رہا ہو۔ انہیں کس طرح اور کیا کہہ کر روکا جاتا؟ جب وہ جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں بھی ٹھہر نہ سکا۔ میں بھی جو کچھ ملا ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس مرتبہ اندر نے منہ پھیر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا...... ''تو پاگل ہو گیا ہے شری کانت! تیرا کیا قصور ہے؟ تو کیوں جائے گا؟''

اس کا لب و لہجہ سن کر ایک لمحہ میں ہی میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کسی طرح انہیں چھپا کر بولا ...... ''تمہارا ہی بھلا کیا قصور ہے اندر؟ تم ہی کیوں جاتے ہو؟''

جواب میں اندر نے میرے ہاتھ سے بانس چھین کر ناؤ میں پھینک دیا اور کہا۔

''میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے بھائی! میں نوین بھیا کو ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب اکیلے لوٹا بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے تو جانا ہی ہوگا۔''

''مگر مجھے بھی تو جانا چاہئے۔'' کیونکہ پہلے ہی ایک دفعہ کہہ چکا ہوں میں بھی بالکل ڈرپوک نہیں تھا۔ اس لئے بانس کو پھر اٹھا کر میں کھڑا ہو گیا اور بحث کئے بغیر ہی ہم دونوں آگے چل دیئے۔ اندر بولا ...... ریت پر دوڑا نہیں جا سکتا ...... خبردار، دوڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ ''ورنہ پانی میں جا گرے گا۔''

سامنے ہی ریت کا ایک ٹیلہ تھا۔ اسے پار کرتے ہی دیکھا بہت دور پانی کے کنارے چھ سات کتے کھڑے بھونک رہے ہیں۔ جہاں تک نگاہ گئی چند کتوں کو چھوڑ کر بھیڑیا تو درکنار کوئی گیدڑ تک نظر نہ آیا۔ احتیاط سے کچھ اور آگے بڑھنے پر معلوم ہوا کوئی ایک سیاہ سی چیز پانی میں پڑی ہے اور وہ اس کا پہرہ دے رہے ہیں۔ اندر چلا اٹھا...... ''نوین بھیا!''

نوین بھیا گلے تک پانی میں کھڑے ہوئے ناقابل فہم لہجہ میں رو پڑے...... ''یہاں ہوں میں!''

ہم دونوں پوری طاقت سے دوڑ پڑے۔ کتے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور اندر جھٹ پٹ کود کر گلے تک ڈوبے ہوئے نیم بے ہوش اپنے موسیرے بھائی کو کھینچ کر کنارے پر اٹھا لایا۔ اس وقت بھی ان کے ایک پاؤں میں بیش قیمت پمپ شو جسم او ورکوٹ، ہاتھ میں دستانے، گلے میں گلوبند اور سر پر ٹوپی

تھی۔ بھگینے کی وجہ سے پھول کر وہ ڈھول ہو گئے تھے۔ ہمارے جاتے وقت ہاتھ سے تالی دے کر جو عمدہ تان چھیڑی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ گانے کی اسی تان سے مسحور ہو کر گاؤں کے کتے گروہ باندھ کر وہاں آ پہنچے تھے۔ اور اس دلکش گیت اور بے مثل پوشاک کی شان سے مرعوب ہو کر اس خاص الخاص شخصیت کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ پیچھا چھڑانے کی غرض سے اتنی دور بھاگنے پر بھی جب انہیں اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو بالآخر جھٹ سے پانی میں کود پڑے اور اس نہایت ہی سرد رات میں، نہایت ٹھنڈے پانی میں آدھے گھنٹے تک ڈوبے رہ کر اپنے گزشتہ اعمالوں کی سزا بھگتتے رہے۔ مگر اس مصیبت کو دور کر کے انہیں پھر سے اچھا کرنے میں بھی ہمیں کم محنت نہ کرنی پڑی۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ بابو صاحب نے زمین پر قدم رکھتے ہی پہلی بات یہ پوچھی۔ ''ہمارا ایک پمپ شو کہاں گیا؟''

''وہ وہاں پڑا ہوا ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ تمام دکھ بھول کر اسے جلدی اٹھا لانے کے لئے سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد کوٹ کے لئے، گلوبند کے لئے، موزے کے لئے، دستانے کے لئے، باری باری سے ایک ایک کے لئے افسوس ظاہر کرنے لگے اور اس رات کو جب تک ہم لوگ لوٹ کر اپنے گھاٹ پر نہ پہنچ گئے لگاتار یہی کوستے رہے کہ کیوں ہم نے جاہلوں کی طرح ان کے جسم پر سے ان سب چیزوں کو جلدی جلدی اتار ڈالا۔ نہ اتارا ہوتا تو اس طرح مٹی لگ کر وہ کیوں خراب ہوتے۔ ہم دونوں غیر مہذب لوگوں میں رہنے والے دیہاتی کسان ہیں۔ ہم لوگوں نے ان تمام چیزوں کو پہلے کبھی آنکھوں سے دیکھا نہ ہوگا۔ یہ سب وہ برابر کہتے رہے۔ جس جسم پر وہ اس سے پہلے ایک بوند پانی گرنے سے بے قرار ہو اٹھتے تھے۔ کپڑے لتوں کے غم میں وہ اس جسم کو بھی بھول گئے غیر ضروری چیز اصل شے کو بھی کس طرح کئی گنا ہو کر دبا دیتی ہے۔ یہ بات اگر ایسے لوگوں کے تعلق میں نہ آیا جائے تو اس طرح صاف ظاہر نہیں ہوتی۔

رات کے دو بجے کے بعد ہماری کشتی گھاٹ پر آ لگی۔ میرے جس ریپر کی سخت بدبو سے کلکتے کے بابو صاحب اس سے پیشتر بے ہوش ہوئے جاتے تھے اسی کو اپنے جسم سے لپیٹ کر اس کی برائی کرتے ہوئے......اور پاؤں صاف کرنے میں بھی نفرت ہوتی ہے...... یہ بار بار سناتے ہوئے بھی اندر کو الوان اوڑھ کر اس سفر میں جان بچاتے ہوئے گھر گئے۔ کچھ بھی ہم لوگوں پر رحم کھا کر جو وہ زندہ واپس لوٹ آئے۔ ان کی اسی عنایت کی مسرت سے ہم معمور ہو رہے تھے۔ اتنی مشکلوں اور مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اور آج تاؤ پر چڑھنے کا خاتمہ کر کے اس خطرناک سردی کی رات صرف ایک دھوتی کا سہارا لیے ہوئے کانپتے کانپتے ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔

لکھنے بیٹھتے ہی میں بہت دفعہ حیرت سے سوچتا ہوں کہ اس قسم کے بے سلسلہ واقعات میرے دماغ میں نہایت ہوشیاری سے کس نے قرینے سے سجا کر رکھ دیئے ہیں۔ جس ترتیب سے میں لکھ رہا ہوں اس ترتیب سے تو وہ ایک کے بعد ایک سلسلہ وار ظہور پذیر نہیں ہوئے اور اس کے علاوہ زنجیر کی کیا تمام کڑیاں مکمل بنی ہوئی ہیں یہ بھی تو نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنے ہی واقعات تو بھول چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی تو وہ سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔ حیرت تو یہ ہے کہ انہیں پھر سے تازہ کر کے کون جوڑ دیتا ہے۔

اور بھی ایک تعجب کی بات ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کے بوجھ سے چھوٹے پس جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر زندگی کے خاص اور اہم واقعات تو ضرور ہی یاد رکھنے کی چیزیں ہوتیں۔ لیکن یہ بھی تو نہیں دیکھتا ہوں بچپن کی باتیں کہتے وقت یکا یک میں نے دیکھا کہ تصور کے مندر میں بہت سے حقیر اور غیر ضروری واقعات بھی نامعلوم کس طرح بہت بڑے ہو کر ٹھاٹھ سے بیٹھ گئے ہیں اور بڑے بڑے واقعات حقیر بن کر نا معلوم کب کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہتے وقت بھی یہی بات صادق آتی ہے حقیر باتیں بڑی ہو کر دکھائی دیتی ہیں۔ اور بڑی باتیں یاد بھی نہیں رہتیں۔ اور ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل بھی قارئین سے بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے صرف اسے ہی میں نے عرض کر دیا ہے۔

اس قسم کی ایک حقیر سی بات جو دل کے اندر اتنے دنوں تک چپ چاپ پوشیدہ رہ کر اتنی بڑی ہو اٹھی ہے کہ آج اس کو دیکھ کر میں خود بھی بہت حیران ہو رہا ہوں۔ وہی بات میں آج اپنے قارئین سے عرض کروں گا۔ مگر بات ٹھیک ٹھیک کیا ہے؟ اس بات کے متعلق اگر اس کی پوری روداد نہ سنا دوں تو اس کی صورت اچھی طرح ظاہر نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر میں شروع میں ہی یہ کہہ دوں کہ وہ ایک داستان محبت ہے تو اس سے اگرچہ دروغ گوئی کا گناہ نہ ہوگا۔ تاہم وہ واقعہ اپنی کوشش سے جتنا بڑھا ہوا ہے میری زبان شاید اس کی حدود سے بھی تجاوز کر جائے گی۔ اس لیے نہایت محتاط ہو کر کہنے کی ضرورت ہے۔

وہ بہت بعد کی بات ہے۔جیجی کی یاد بھی اس وقت دھندلی ہو چکی تھی۔جن کا چہرہ تصور میں آتے ہی نامعلوم طاقت سے شباب کی بیتابیاں خود بخود سر جھکا لیتی ہیں۔ان جیجی کی یاد اس وقت اس طرح نہ آتی تھی۔یہ اس وقت کی کہانی ہے ایک راجکمار کی طرف سے مدعو ہو کر میں اس کی شکار پارٹی میں شامل ہوا تھا۔اس کے ساتھ بہت عرصہ میں سکول میں پڑھا کرتا تھا۔پوشیدہ طور پر کئی بار اس کے حساب کے سوال حل کر دیئے تھے۔اس لئے وہ مجھے خوب چاہتا تھا۔اس کے بعد انٹرنس کی جماعت میں ہم دونوں الگ ہو گئے۔میں جانتا ہوں کہ لڑکوں کی یادداشت بہت کم ہوا کرتی ہے لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھے یاد کر کے خط و کتابت کرنا شروع کر دے گا۔ایک دن یکا یک اس سے ملاقات ہو گئی۔اس وقت وہ بالغ ہوا تھا۔بہت سا اندوختہ اس کے ہاتھ لگا اور اس کے بعد......وغیرہ وغیرہ۔

راجہ کے کانوں میں بات پہنچی اور پہنچی بھی کافی مبالغہ کے ساتھ۔کہ میں رائفل چلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔اور اس کے علاوہ اس دوران میں اور بھی بہت سی خوبیاں مجھ میں آ گئی ہیں۔اور میری ان تمام صفات نے مل کر مجھے کسی راجہ کے اکلوتے اور بالغ راجکمار کا جگری دوست بننے کے قابل بنا دیا ہے۔اپنے عزیز و اقارب تو اپنے آدمی کی تعریف تو کچھ مبالغہ آمیزی سے ہی کرتے ہیں ورنہ سچ مچ میں ہی میں اتنا زیادہ قابل اتنی چھوٹی سی عمر میں ہو گیا تھا۔یہ غرور مجھے زیب نہیں دیتا۔کم از کم کچھ عجز تو رکھنا ہی چاہیئے۔خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔عالموں نے کہا ہے راجے ریاستوں کی دعوت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ہندو کا بیٹا ہو کر اپنے شاستر کے عالموں کی رائے کے خلاف عمل کس طرح کرتا؟لہٰذا میں چلا گیا سٹیشن سے دس بارہ کوس ہاتھی پر بیٹھ گیا۔دیکھا کہ بلاشبہ راجا کے لڑکے میں بالغ ہونے کے سب آثار موجود ہیں۔کوئی پانچ خیمے ہیں ایک خود ان کا،ایک وزیر صاحب کا،ایک مصاحبوں کا،ایک نوکروں کا ایک رسوئی کا،ان کے علاوہ ایک خیمہ کچھ فاصلے پر نصب تھا......اس کے دو حصے کر کے ان میں دو رقاصائیں اور ان کے سازندے اڈہ جمائے ہوئے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔داخل ہوتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ راجکمار کے خاص کمرے میں محفل رقص و نغمہ جمی ہوئی ہے۔راجکمار نے عزت سے میرا خیر مقدم کیا۔حتیٰ کہ احترام سے کھڑے ہونے کو تیار ہو کر وہ تکیے کے سہارے لیٹ گئے۔دوست احباب پر تپاک لہجہ میں آیئے،آیئے،تشریف لایئے کہہ کر گرمجوشی سے استقبال کرنے لگے۔میں بالکل اجنبی تھا۔مگر ان تمام لوگوں کی جو حالت تھی اس سے مجھے کسی قسم کی جھجھک کا احساس نہ ہوا۔

یہ بائی جی،پٹنہ سے بہت سا روپیہ حاصل کرنے کی شرط پر دو ہفتے کے لیے آئی تھیں۔اس انتخاب کے لیے راجکمار کی صحیح قدردانی کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔بائی جی نہایت حسین

اور گانے میں لاجواب تھیں۔

میرے داخل ہوتے ہی گانا تھم گیا۔اس لیے باموقعہ مناسب گفتگو اور ادب سے قاعدے کا کام ختم ہونے میں بھی کچھ وقت گزر گیا۔راجکمار نے بضد ہو کر مجھ سے گانے کی فرمائش کرنے کا اصرار کیا۔راجا کا حکم پا کر پہلے تو میں پریشان ہوا تھا۔لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ نغمہ کی اس محفل میں صرف میں ہی کچھ دھندلا سا دیکھ سکتا ہوں۔باقی تمام کے تمام چھچھوندر کے مانند اندھے ہیں۔

بائی جی کھل اٹھیں۔دولت کے لالچ سے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں۔یہ میں اس وقت بھی جانتا تھا لیکن ان جاہلوں کے دربار میں بینا بجانا درحقیقت ہی اتنی دیر تک اسے بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ایک دفعہ ایک سمجھدار انسان پا کر گویا وہ بچ گئیں۔اس کے بعد رات کو دیر تک محض میرے ہی لیے انہوں نے اپنے کمال فن اور حسن و جمال کی تمام تر دل آویزیوں کے ساتھ کئے کہ انتہائی شیرینی میں اطراف و جوانب کو ڈبو یا دیا اور بالآخر خاموش ہو گئیں۔

بائی جی پٹنہ کی رہنے والی تھیں۔نام تھا پیاری۔اس رات انہوں نے جس طرح اپنی تمام تر طاقت لگا کر گانا سنایا اس طرح شاید پہلے کبھی نہ سنایا ہو گا۔میں تو محو سا ہو گیا۔گانا ختم ہوتے ہی میرے منہ سے بے اختیار صرف اتنا ہی نکلا......"واہ بہت خوب"

پیاری نے سر نیچا کر کے ہنس دیا۔اس کے بعد دونوں ہاتھوں کو پیشانی سے لگا کر پرنام کیا......سلام نہیں۔مجلس اس رات کے لیے برخاست ہو گئی۔

اس وقت تماشائیوں میں سے کوئی سو رہا تھا کوئی نیم خوابی کی حالت میں تھا اور اکثر بے ہوش تھے۔اپنے خیمہ میں جانے کے لیے جب بائی جی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ نکل رہی تھیں تو میں مسرت سے جوش میں ہندی میں کہہ اٹھا......"بائی جی میری خوش نصیبی ہے کہ تمہارا گانا دو ہفتے تک ضرور سننے کا موقعہ ملے گا۔"

بائی جی پہلے تو ٹھٹھک کر کھڑی رہیں لیکن دوسرے ہی لمحے نزدیک آ کر نہایت نازک لہجہ میں خالص بنگالی زبان میں بولیں......"روپے لیے ہیں اس لیے مجھے گانا ہی پڑے گا۔لیکن کیا آپ بھی پندرہ سولہ دنوں تک ان کی مصاجی کرتے رہیں گے؟جایئے کل ہی آپ اپنے گھر چلے جایئے۔"

یہ بات سن کر میں حواس باختہ ہو گیا اور سوچتا رہا کہ اس کا کیا جواب دوں لیکن بائی جی خیمہ سے باہر جا چکی تھیں۔

صبح شور و غل مچا کر کمار صاحب شکار کے لیے باہر نکلے۔مے نوشی اور گوشت خوری کی تیاری ہی سب سے زیادہ تھی۔دس بارہ شکاری نوکر ساتھ تھے۔پندرہ بندوقیں تھیں۔جن میں رائفلیں تھیں۔

شکار کا موقعہ ایک ادھ سوکھی ندی کے دونوں ساحل...... اس پار گاؤں تھا اور اس پار ریت کا ٹیلہ تھا۔ اس پار کوس بھر تک سیمر کے درخت تھے اور اس پار ریت پر جا بجا کائی اور دوب کے جھرمٹ۔ یہاں ہی ان پندرہ بندوقوں کو لے کر شکار کیا جائے گا۔ سیمر کے درختوں پر مجھے کبوتر کی نسل کے کچھ جانور نظر آئے۔ اور اس آدھی خشک ندی کے موڑ کے پاس حلکچا چکوی تیر رہے ہیں ایسا معلوم ہوا۔ کون کس طرح جائے۔ اس پر نہایت گرمجوشی کے ساتھ تبادلہ خیالات ہونے لگا...... اور سب نے ہی دو دو پیالے چڑھا کر جسم اور دل کو بہادروں کی طرح بنا لیا۔ میں نے بندوق نیچے رکھی۔ ایک تو بائی جی کی طنز کی چوٹ کھا کر راہ میں ہی دل بے قرار ہو رہا تھا۔ اور شکار کا یہ میدان دیکھ کر تو تمام جسم ہی جل اٹھا۔

کمار نے پوچھا...... کیوں جی کانت! تم تو بڑے گم صم ہو رہے ہو؟ ارے یہ کیا بندوق ہی رکھ دی؟"

"میں پرندوں کا شکار نہیں کرتا۔"

"یہ کیا جی؟ کیوں، کیوں؟"

"چہرے پر چیچک نکلنے کے بعد میں نے چھرے والی بندوق نہیں چلائی...... میں اسے چلانا بھول گیا ہوں۔"

کمار صاحب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لیکن اس ہنسی کا کس خوبی سے کتنا تعلق ہے یہ ضرور علیحدہ بات تھی۔

سرجو کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو اٹھیں۔ وہ نمسکاریوں کے ساتھ اس گروہ کا سرغنہ اور راجکمار کا خاص مصاحب تھا۔ ان کے بے خطا نشانہ کی شہرت میں نے آتے ہی سن لی تھی۔ وہ ناراض ہو کر بولے...... چڑیوں کا شکار کیا کچھ شرم کی بات ہے؟

میرا مزاج ابھی ٹھکانے نہیں تھا۔ اس لیے جواب دیا۔ "ہر ایک کے لیے نہیں مگر میرے لیے تو ہے...... خیر، کمار صاحب میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں کہہ کر میں اپنے خیمے میں واپس لوٹ آیا۔ اس پر کون ہنسا، کس نے آنکھ مچکائی، کس نے منہ بنایا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

خیمے میں واپس لوٹ کر میں فرش پر چت لیٹا ہی تھا اور ایک پیالہ چائے تیار کرنے کا حکم دے کر ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ کہ بہرے نے آ کر ادب کے ساتھ کہا...... "بائی جی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" بالکل اسی بات کی امید میں کر رہا تھا۔ اور فکر بھی۔ پوچھا...... "کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا؟"

"تم کون ہو؟"

"میں بائی جی کا خانساماں ہوں۔"

"بنگالی ہو؟"

"جی ہاں، ذات کا نائی ہوں۔ میرا نام رتن ہے۔"

"بائی جی ہندو ہیں؟"

رتن ہنس کر بولا...... "نہ ہوتیں تو اب تک میں کیسے رہتا بابو جی؟"

مجھے ساتھ لے جا کر اور خیمے کا دروازہ دکھا کر رتن چلا گیا۔ پردہ اٹھا کر اندر دیکھا کہ بائی جی اکیلی بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہیں۔ کل رات پشواز اور اوڑھنی کی وجہ سے میں اچھی طرح پہچان نہ سکا تھا۔ لیکن آج دیکھتے ہی پہچان گیا کہ خواہ کوئی بھی ہوں مگر بائی جی ہیں بنگال کی ہی لڑکی۔ بائی جی ریشمی ساڑھی زیب تن کئے بیش قیمت کارپٹ پر بیٹھی تھیں۔ بھیگے منتشر بال پیٹھ پر پھیل رہے تھے۔ ہاتھوں کے قریب ہی پاندان رکھا تھا۔ اور سامنے حقہ۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں اور مسکرا کر سامنے رکھے ہوئے آسن کی طرف اشارہ کر کے بولیں...... "بیٹھیے، آپ کے سامنے اب تمباکو نہ پیوں گی...... ارے رتن، حقہ اٹھا لے جا...... یہ کیا کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھ جائیے نا۔"

رتن آ کر حقہ لے گیا۔ بائی جی بولیں...... "آپ تمباکو پیتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے لیکن دوں کس طرح؟ دوسری جگہ آپ چاہیں جو کر لیں مگر دیدہ دانستہ تو میں آپ کو اپنا حقہ نہ دے سکوں گی...... اچھا چرٹ لائے دیتی ہوں...... ارے او......"

"ٹھہرو ٹھہرو، ضرورت نہیں۔ میری جیب میں ہی چرٹ ہیں۔"

"ہیں؟ اچھا تو اطمینان سے ذرا بیٹھ جائیے۔ بہت سی باتیں کرنا ہے۔ بھگوان کب کس سے ملا دیتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ شکار کے لیے گئے تھے یکا یک لوٹ کیوں آئے؟"

"جی نہیں لگا۔"

"نہ لگنے کی ہی بات ہے۔ کیسی بے رحم ہے مردوں کی یہ نسل۔ فضول ہی جانوروں کا خون بہانے میں انہیں کیا مزہ آتا ہے۔ یہی جانیں...... بابو جی تو اچھے ہیں؟"

"بابو جی تو چل بسے۔"

"ہیں چل بسے!...... اور ماں؟"

"وہ تو ان سے بھی پہلے چل بسی تھیں۔"

"اوہ، اسی لیے تو۔" کہہ کر بائی جی ایک طویل آہ بھر کر میری طرف دیکھتی رہ گئیں ایک دفعہ تو معلوم ہوا گویا ان کی آنکھیں چھلچھلا آئی ہیں۔ مگر شاید وہ میری بھول ہو۔ دوسرے ہی لمحہ وہ بولیں تو بھول

کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کا چنچل اور حاضر جواب لہجہ درحقیقت اضطراب سے بھرا تھا۔ بوا جی کے پاس ہی رہتے ہو نا؟...... اور کہاں رہو گے؟ شادی ہوئی نہیں...... یہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔ پڑھتے لکھتے ہو یا وہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم کر دیا؟''

اب تک تو میں اس کی پریشانی اور سوالات کے سلسلے کو کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا رہا۔ مگر نا معلوم کیوں آخری بات مجھے گویا نا قابل برداشت معلوم ہوئی۔ میں نے چڑ کر خشک لہجے میں کہا......

''اچھا کون ہو تم؟ زندگی میں تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ یہ تو یاد آتا نہیں۔ میرے متعلق تم اتنی باتیں معلوم کرنا کیوں چاہتی ہو اور معلوم کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟''

بائی جی کو غصہ نہ آیا وہ ہنس کر بولیں...... ''نفع و نقصان ہی دنیا میں کیا سب کچھ ہے۔ مایا، ممتا پیار محبت کچھ نہیں...... میرا نام ہے پیاری...... لیکن جب میری شکل دیکھ کر بھی نہ پہچان سکے، تو بچپن کا نام سن کر بھی کیسے پہچان لو گے؟ اس کے علاوہ میں تمہارے اس گاؤں کی لڑکی بھی تو نہیں ہوں۔''

''اچھا، تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''نہیں یہ میں نہ بتاؤں گی۔''

''تو پھر اپنے باپ کا نام ہی بتا دو؟''

بائی جی زبان کاٹ کر بولیں...... وہ سورگ چلے گئے ہیں۔ رام رام کیا ان کا نام اس گنہگار زبان سے لے سکتی ہوں۔

میں بے قرار ہو اٹھا بولا...... ''اگر نہیں لے سکتی تو پھر مجھے تم نے پہچانا کس طرح۔ یہی بتاؤ؟ شاید یہ بتانے میں کوئی حرج نہ ہو گا؟''

پیاری نے میرے دلی جذبات کو بھانپ کر مسکرا دیا کہا...... ''نہیں اس میں کوئی حرج نہیں...... لیکن کیا تم یقین کر سکو گے؟''

''کہہ دو نا۔''

پیاری نے کہا...... ''تمہیں پہچانا تھا مہاراج بدعقلی کی مار سے، اور کس طرح؟ تم نے میری آنکھوں میں جتنا پانی بہایا ہے۔ خوش قسمتی سے سورج نے اس خشک کر دیا ہے ورنہ آنکھوں کے اس کھارے پانی سے ایک تالاب بھر گیا ہوتا۔ پوچھتی ہوں کیا اس پر یقین کر دگے؟''

اور میں سچ مچ ہی یقین نہ کر سکا۔ لیکن یہ میری غلطی تھی۔ اس وقت کسی طرح بھی خیال نہ آیا۔ کہ پیاری کے ہونٹوں کی بناوٹ کچھ اس قسم کی ہے۔ کہ ہر بات وہ مذاق میں ہی کہتی ہے اور دل ہی دل میں ہنستی ہے۔ میں خاموش رہ گیا۔ وہ بھی کچھ دیر خاموش رہ کر سچ مچ ہی ہنس پڑی۔ مگر صرف اتنی ہی دیر

میں نا معلوم کس طرح مجھے احساس ہوا کہ اس نے اپنی حالت کو سنبھال لیا ہے۔ ہنس کر کہا...... ''نہیں مہاراج! تمہیں جتنا بھولا سمجھا تھا اتنے بھولے تم نہیں ہو میرے کہنے کا جو طریقہ ہے اس کو تم نے سمجھ لیا ہے مگر یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ تمہاری نسبت زیادہ عقلمند کہلانے والے بھی اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ بس اگر اتنے زیادہ دوراندیش اور تیز فہم ہیں تو مصاحبی کا یہ کاروبار کیوں اختیار کیا ہے؟ یہ نوکری تو آپ جیسے انسان سے نہ ہو گی۔ جاؤ یہاں سے فوراً کھسک جاؤ۔''

مارے غصہ کے میرا خون کھول اٹھا۔ لیکن میں نے اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ قدرتی لہجے میں کہا...... ''نوکری جتنے دن ہو سکے غنیمت ہے۔ بیکار سے بیگار بھلی۔ سمجھیں نا؟ اچھا اب میں جاتا ہوں باہر کے لوگ شاید کچھ اور ہی سمجھ بیٹھیں۔''

پیاری نے جواب دیا۔ ''سمجھ بیٹھیں تو یہ تمہارے لیے خوش نصیبی کی بات ہے مہاراج؟ آپ کو افسوس نہیں ہونا چاہئے۔''

جواب دیئے بغیر ہی جب میں دروازے پر آ کھڑا ہوا تو وہ دفعتہً قہقہہ مار کر اٹھی اور بولی...... ''دیکھو بابو، میری آنکھوں کے آنسوؤں کی بات بھول مت جانا۔ دوست احباب میں، کمار صاحب کے دربار میں، ظاہر کر دو گے تو ممکن ہے تمہاری تقدیر کھل جائے۔''

میں جواب دیئے بغیر باہر ہو گیا۔ لیکن اس بے حیا کی ہنسی اور بھی زیادہ آزار کے ساتھ بچھو کے کاٹنے کی طرح جسم میں جلن پیدا کرنے لگی۔

اپنے ڈیرہ پر آ کر اور ایک پیالہ چائے پی کر چرٹ منہ میں دبا کر اور اپنے آپ کو امکان بھر اطمینان کے ساتھ ٹھنڈا کر کے سوچنے لگا...... یہ کون ہے؟ میں اپنی پانچ چھ سال کی عمر تک کے تمام واقعات صاف طور پر یاد کر سکتا ہوں۔ مگر ماضی کے پردہ پر جہاں تک نظر جا سکتی تھی اتنی دور تک میں نے خوب چھان بین کر دیکھا۔ لیکن کہیں بھی اس پیاری کا کھوج نہ ملا۔ پھر بھی یہ مجھے خوب پہچانتی ہے۔ بوا تک کی بات جانتی ہے۔ میں غریب ہوں یہ بھی اس سے مخفی نہیں اس لیے اور تو کوئی گہری چال اس میں نہیں ہو سکتی۔ تاہم جس طرح بھی ہو مجھے یہاں سے جلد از جلد بھگا دینا چاہتی ہے۔ مگر یہ کس لئے؟ میرے لیے یہاں رہنے نہ رہنے سے اس کو کیا مطلب؟ باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا تھا...... دنیا میں نفع و نقصان ہی کیا سب کچھ ہے۔ پیار محبت کچھ نہیں؟ میں نے جس کو آنکھوں سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس کے منہ کی یہ بات یاد کر کے ہی مجھے ہنسی آ گئی لیکن تمام گفتگو کو دبا کر اس کا آخری طنز مجھے چھیدنے لگا۔

شام کو شکاریوں کا گروہ واپس لوٹ آیا۔ نوکروں کی زبانی سنا۔ آٹھ پرندے مار کر لائے گئے

ہیں۔کمار نے مجھے بلا بھیجا۔طبیعت درست نہ ہونے کا بہانہ کر کے میں بستر پر ہی پڑا رہا۔ اور اسی طرح پڑے پڑے، رات کو دیر تک پیاری کا رقص ونغمہ اور مے خواروں کی واہ واہ سنتا رہا۔

اس کے بعد تین چار دن بدستور ایک ہی طرح سے کٹ گئے۔ بدستور اس لیے کہتا ہوں کہ صرف شکار کو چھوڑ کر اور سب باتیں ہر روز ایک سی ہوتی تھیں۔ پیاری کی بددعا شاید اپنا اثر کر چکی ہو۔ جانداروں کے خون کے متعلق کسی میں کچھ بھی جوش وخروش میں نے پھر نہیں دیکھا۔کوئی خیمے کے باہر بھی نکلنا نہیں چاہتا۔ پھر بھی انہوں نے مجھے نہ چھوڑا۔ میرے وہاں سے بھاگ جانے کی کوئی خاص اور معقول وجہ نہ تھی۔ مگر اس بائی جی سے مجھے کچھ نفرت سی ہوگئی۔ وہ جب حاضر ہوتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی مجھے مار رہا ہو۔اٹھ کر جب وہاں سے چلا جاتا، تو کچھ سکون ملتا، اور اگر اٹھ نہ سکتا تو کسی دوسری طرف منہ پھیر کر کسی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے محو ہونے کا سوانگ بھرتا۔اس وقت بھی وہ مجھ سے آنکھ ملانے کی ہزار کوشش کیا کرتی یہ بھی میں محسوس کرتا۔شروع شروع میں دو تین دن اس نے مجھے مخاطب کر کے مذاق کرنے کی کوشش بھی کی۔لیکن میرے رویہ کو دیکھ کر وہ یک دم سن ہو رہی۔

سنیچر کا دن تھا۔اب کسی طرح بھی میں ٹھہر نہیں سکتا۔ کھا پی چکنے کے بعد بھی آج روانہ ہو جاؤں گا۔اس بات کا فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے آج صبح سے ہی گانے بجانے کی بیٹھک جم گئی تھی۔تھک کر بائی جی نے گانا بند کیا ہی تھا کہ اچانک تمام داستانوں سے افضل بھوتوں کی داستان شروع ہوگئی۔ پل بھر میں ہی جو جہاں تھا اس نے وہیں داستان سرا کو گھیر لیا۔

پہلے تو میں لاپراہی سے سنتا رہا۔لیکن آخر کار میں بیقرار ہو کر بیٹھ گیا۔ کہانی سنانے والے گاؤں کے ایک بوڑھے ہندوستانی تھے۔ کہانی کو کس طرح بیان کرنا چاہئے اس بات کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔وہ کہہ رہے تھے کہ ”بھوت پریت کے متعلق اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ آج اس سنیچر کی اماوس کو اس گاؤں میں آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے۔ وہ خواہ کسی بھی ذات کا ہو اور خواہ جیسا بھی آدمی ہو اور خواہ کتنے ہی آدمیوں کو ساتھ لے کر جائے۔آج کی رات اس کا شمشان جانا بیکار نہیں ہوگا آج کی تاریک رات اطمینان میں رہنے والے اس پریت کو نہ صرف آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے بلکہ اس کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔ اور اگر خواہش ہو تو اس سے بات چیت بھی کی جا سکتی ہے۔“ میں اپنے بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنس دیا۔ بوڑھا اسے دیکھ کر بولا... ”آپ میرے پاس آیئے۔“ میں اس کے نزدیک کھسک گیا۔اس نے پوچھا...... ”آپ یقین نہیں کرتے؟“

”نہیں“

”کیوں نہیں کرتے؟ نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”نہیں“

”تو پھر؟ اس گاؤں میں ہی دو ایک ایسے سدھ ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پھر بھی آپ اگر یقین نہیں کرتے، منہ پر ہنستے ہیں تو یہ صرف دو ورق انگریزی پڑھ لینے کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً بنگال کے لوگ تو ناستک ملیچھ ہوگئے ہیں۔“ کہاں کی بات کہاں آپڑی، دیکھ کر میں ششدر رہ گیا بولا...... ”دیکھئے اس کے متعلق میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔میرا یقین میرے پاس ہے۔ میں خواہ ناستک ہوں یا ملیچھ ہوں۔لیکن میں بھوت کو نہیں مانتا۔ جو کہتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے وہ یا تو دھوکہ کھا گئے ہیں یا جھوٹے ہیں۔یہی میرا خیال ہے۔“

اس بھلے انسان نے جھٹ میرے دائیں ہاتھ کو پکڑ کر کہا...... ”کیا آپ آج رات کو شمشان جا سکتے ہیں؟“

میں ہنس کر بولا، ”جا سکتا ہوں، بچپن سے ہی میں بے شمار راتوں میں لاتعداد شمشانوں میں گیا ہوں۔“ بوڑھا چڑ کر بول اٹھا...... ”آپ شیخی مت بگھاڑیئے بابو۔“ اتنا کہہ کر اس نے اس شمشان کا تمام سامعین کو حیرت میں ڈال دینے والا تذکرہ شروع کر دیا۔ ”وہ شمشان کچھ ایسی ویسی جگہ نہیں ہے۔ یہ عظیم (مہان) شمشان ہے۔ یہاں ہزاروں انسانی کھوپڑیاں شمار کی جا سکتی ہیں۔اس شمشان میں ہر رات مہا بھیروی اپنے ہمراہیوں کیساتھ انسانی کھوپڑیوں سے گیند کھیلتی ہے۔اور ناچتی ہوئی گھومتی ہے۔ ان کے کھلکھلا کر ہنسنے کی مہیب آواز سے کتنی ہی مرتبہ کتنے ہی بے اعتقاد انگریز ججوں، مجسٹریٹوں کے بھی دل کی دھڑکن بند ہوگئی ہے۔“ اس قسم کی لرزہ خیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی وہ اس طرح بیان کرنے لگا۔ کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں دن کے وقت خیمے کے اندر بیٹھے ہوئے بھی بہت سے لوگوں کے سر کے بال تک کھڑے ہوگئے۔ ترچھی نظر سے میں نے دیکھا کہ پیاری نامعلوم کب پاس آ کر بیٹھ گئی ہے۔ اور ان باتوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی ہے۔

اس طرح جب اس مہا شمشان کی داستان ختم ہوئی تو مقرر صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا...... ”کیوں بابو جی! آپ جائیں گے؟“

”جاؤں گا کیوں نہیں؟“

”جاؤ گے اچھا آپ کی مرضی جان جانے پر......“

میں ہنس کر بولا...... ”نہیں صاحب نہیں، جان جانے پر بھی تمہیں الزام نہیں دیا جائے گا۔ تم اس کے لیے مت ڈرو۔لیکن انجانی جگہ پر میں بھی خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔ بندوق ساتھ ہوگی۔“

بحث زیادہ زوردار ہو چکی ہے اس کا احساس کر کے میں وہاں سے اٹھ آیا۔ ”پرندہ مارنے کی تو

ہمت نہیں پڑتی، بندوق کی گولی سے بھوت ماریں گے صاحب! ...... بنگالی لوگ انگریزی پڑھ کر ہندو شاستروں کو نہیں مانتے۔ یہ مرغی تک کھا جاتے ہیں ...... منہ سے یہ لوگ کتنی ہی شیخی، کیوں بھگاریں کام کے وقت بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ...... ایک معمولی دھونس پڑتے ہی نانی یاد آ جاتی ہے' اس قسم کی تنقید شروع ہوئی۔ یعنی جن رلیف دلائل اور اچھوتے خیالات کے اظہار سے راجا رئیسوں کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور جوان کے دماغ کو پریشان نہیں کر سکتے یعنی جن پر وہ خود بھی شامل ہو کر چند الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ اسی قسم کے وہ تمام دلائل تھے۔

ان لوگوں میں صرف ایک آدمی ایسا تھا جس نے تسلیم کیا کہ میں شکار کرنا نہیں جانتا۔ یہ شخص عموماً کم گو تھا اور شراب بھی بہت کم پیتا تھا۔ اس کا نام پرشوتم تھا۔ شام کے وقت آ کر اس نے مجھے پکڑ لیا اور کہا...... ''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا کیونکہ اس سے پیشتر میں نے کبھی بھوت نہیں دیکھا۔ اس لئے آج جب ایسا موقعہ ملا ہے تو میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا'' ...... یہ کہہ کر وہ خوب ہنسنے لگا۔

میں نے پوچھا...... ''کیا تم بھی بھوتوں کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتے؟''

''بالکل نہیں۔''

''کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ بھوت نہیں ہیں؟ اتنا کہہ کر وہ مروجہ اعتراضات اٹھا اٹھا کر بار با انکار کرنے لگا۔ میں اتنی آسانی سے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ کیونکہ بہت دنوں کے تجربہ کے بعد میں نے سیکھ لیا تھا کہ یہ سب دلیل اور اعتراض کا معاملہ نہیں۔ یہ تو فطرت کا تقاضا ہے عقل کی بنا پر جو کسی ایک بات کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی ڈر اور خطرہ کے درپیش آ جانے پر خوف کے مارے ہوش گم کر بیٹھتے ہیں۔

لیکن پرشوتم اس طرح آسانی سے چھوڑنے والی آسامی نہ تھا۔ وہ لانگ کس کر اور پکے بانس کی لکڑی کندھے پر رکھ کر بولا ...... ''شری کانت بابو! آپ کی خواہش ہو تو آپ بے شک بندوق لے چلیں مگر اپنے ہاتھ میں جب تک لاٹھی ہے۔ بھوت ہو خواہ پریت۔ میں کسی کو بھی نزدیک پھٹکنے نہ دوں گا۔''

''لیکن کیا وقت پر ہاتھ میں لاٹھی رہے گی بھی؟''

''بالکل اسی طرح رہے گی بابو، آپ اس وقت دیکھ لینا۔ کوس بھر کا راستہ ہے۔ رات کو گیارہ بجے سے پہلے ہی روانہ ہونا چاہئے۔''

میں نے محسوس کیا کہ، اس کا اصرار وزن دار ہے۔

جانے کے لیے اس وقت بھی تقریباً گھنٹہ بھر کی دیر تھی۔ میں خیمے کے باہر چہل قدمی کرتا ہوا

اس سلسلہ میں اپنے دل کے ساتھ بحث و تمحیص کر کے دیکھ رہا تھا کہ حالات دراصل کیا ہو سکتے ہیں؟ اس قسم کے معاملات میں بھی جن کا شاگرد تھا انہیں بھوت کا بالکل ڈر نہیں تھا۔ لڑکپن کی باتیں یاد آ رہی تھیں...... اس رات جب اندر نے کہا...... ''شری کانت، دل ہی دل میں رام نام لیتا رہ، وہ لڑکا میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا...... صرف اسی دن میں ڈر کے مارے بیہوش ہو گیا تھا۔ اور کسی دن نہیں۔ پھر ڈرنے کا موقعہ ہی نہ آیا۔ اگر آج کی بات سچ ہو، تو وہ شے ہے کیا؟ خواہ اندر کو بھوت کی ہستی میں اعتقاد تھا۔ لیکن اس نے بھی کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں بھی خواہ اپنے دل میں جتنا بھی انکار کیوں نہ کروں مقام اور وقت کے اثر سے اس وقت میں جسم میں سنسنی پیدا ضرور ہو گی دفعتہً سامنے اماوس کی اس لامحدود تاریکی کی طرف دیکھ کر مجھے کسی گزرتی ہوئی اماوس کی رات یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسا ہی ایک سنیچر تھا۔

پانچ چھ سال پیشتر، ہماری پڑوسن نیرو جیجی کم سنی میں بیوہ ہو کر جب پرسوت کی بیماری میں مبتلا ہو کر اور چھ مہینے تک دکھ برداشت کرتے رہنے کے بعد مر گئی۔ تو ان کے بستر مرگ کے پاس میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ باغ کے درمیان مٹی کے ایک مکان میں وہ تنہا رہتی تھیں۔ ہر ایک کی دکھ تکلیف میں، مشکل اور مصیبت میں اتنی خدمت کرنے والی، بے غرض اور نیک عورت محلے بھر میں اور کوئی نہ تھی۔ کتنی ہی عورتوں کو پڑھا لکھا کر، سوئی کا کام سکھا کر، اور خانہ داری کے مشکل امور اور راز سمجھا کر انہوں نے انسان بنا دیا تھا۔ اس کا شمار نہ تھا۔ نہایت متین اور سنجیدہ مزاج اور پاکیزہ اخلاق کی بدولت محلہ بھر کے لوگوں کو ان سے بے حد پیار تھا۔ لیکن ان نیرو جیجی کا جب دفعتہً تیس سال کی عمر میں پاؤں پھسل گیا اور بھگوان نے اس بے موقعہ ندامت اور شرمندگی سے ان کا زندگی بھر کا اونچا سر مٹی میں ملا دیا تو محلے کے کسی بھی آدمی نے اس بدنصیب کو پناہ دینے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا اور گناہ کے نام سے بھی دور بھاگنے والی ہندو سوسائٹی نے اس کے سامنے ہی اپنے کھڑکی کے دروازے بند کر لیے اور اس محلہ میں جہاں شاید ایک بھی فرد ایسا نہ تھا جس نے ضرورت اور تکلیف کے موقعہ پر کسی نہ کسی طرح نیرو جیجی کی خدمت سے استفادہ حاصل نہ کیا ہوا۔ اسی محلے کے ایک کونے میں اپنی آخری سیج بچھا کر وہ بدنصیب نفرت اور شرم کے مارے سر نیچا کئے ہوئے تنہا ایک ایک دن شمار کرتی ہوئی طویل چھ مہینوں تک بلا علاج پڑی رہی۔ اپنے پاؤں پھسلنے کا کفارہ ادا کرنے کے بعد، ساون مہینے کی ایک نیم شب میں یہ دنیا چھوڑ کر جس دنیا میں وہ چلی گئی۔ اس کی صحیح صحیح تفصیل کسی بھی دھرماتما پنڈت سے دریافت کی جا سکتی ہے۔

میری بوا نہایت ہی پوشیدہ طور پر ان کی مدد کیا کرتی تھیں۔ یہ بات میں اور میرے گھر کی ایک بڑی نوکرانی کے علاوہ اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بوا نے ایک دن مجھے تنہائی میں بلا کر کہا۔

''بھیا شری کانت، تو تو اس طرح بیمار ، درد دکھ میں بہتوں کی خبر لیا کرتا ہے، اس چھوکری کو

ایک آدھ دفعہ کیوں نہیں دیکھ آیا کرتا؟'' اس دن سے متواتر گاہے گاہے میں جا کر انہیں دیکھ آیا کرتا اور بوا کے پیسوں سے یہ چیز، وہ چیز خرید کے دے آیا کرتا۔ ان کی موت کے وقت صرف اکیلا میں ہی ان کے پاس تھا۔ کسی شے کا قائل نہ ہونے پر بھی خوف کے مارے جسم میں جو سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اس کی مثال کے طور پر میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔

اس دن بھی ساون کی اماوس تھی۔ رات کے بارے بجے کے بعد آندھی اور طوفان کے زدر سے زمین اپنی جگہ سے ہل جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ میں کھاٹ کے پاس ہی ایک بہت پرانی ٹوٹی ہوئی ڑام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ نیرو جیجی نے اپنے مخصوص نرم لہجہ میں مجھے اپنے پاس بلا کر ہاتھ اٹھا کر میرا کان اپنے منہ پر لا کر آہستہ سے کہا...... ''شری کانت، تو اپنے گھر جا۔''

''یہ کیوں جیجی، ایسی آندھی اور طوفان میں؟''

''رہنے دے آندھی اور طوفان، جان تو پہلے ہے۔'' وہ وہم میں بڑبڑا رہی ہیں۔ یہ سمجھ کر میں نے کہا...... ''اچھا جاتا ہوں، بارش ذرا تھم لینے دو۔ نیرو جیجی نہایت متفکر ہو اٹھیں۔ ''نہیں نہیں شری کانت، تو جا، جا بھائی جا...... اب ذرا سا بھی مت ٹھہر...... جلدی بھاگ جا۔'' اس دفعہ ان کے گلے کی آواز سے میرے سینے کا اندرونی حصہ تک لرز اٹھا۔ میں بولا...... ''مجھ سے جانے کے لیے کیوں کہہ رہی ہو؟''

جواب میں میرا ہاتھ کھینچ کر اور بند کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے وہ چلا اٹھیں۔ ''جائیگا نہیں تو کیا جاندے گا؟ دیکھتا نہیں، مجھے لے جانے کے لیے وہ کالے کالے سپاہی آئے ہیں۔ تو یہاں موجود ہے۔ اس لیے وہ کھڑکی میں سے مجھے ڈرا رہے ہیں۔''

اس کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا...... ''وہ اس کھاٹ کے نیچے ہیں۔ وہ سر کے اوپر ہیں۔ وہ مارنے آ رہے ہیں۔ وہ پکڑ لیا۔'' رات کے آخری حصہ میں ان کی یہ چیخ و پکار اسی وقت ختم ہوئی۔ جب ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

❁...... ❁

وہ واقعہ آج بھی میرے سینے میں نقش ہے۔ اس رات مجھے معلوم ہوا تھا۔ لور ایسا بھی یاد آتا ہے کہ کچھ چہرے بھی دیکھے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت اس واقعہ کی یاد آنے سے ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اگر اس بات کا مجھے یقین نہ ہوتا کہ دروازہ کھول کر باہر ہوتے ہی نیرو جیجی کے کالے کالے سپاہی سنتریوں کی بھیڑ میں جا کر محصور ہو جاؤں گا تو اس دن اماوس کی اس تیرگی کو حقیر سمجھ کر بھی میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے بلکہ دم توڑنے والا انسان موت کی بیہوشی میں ہی چلا رہا ہے۔ اس کو بھی میں سمجھتا تھا...... اسی دوران میں......

''بابو؟''

چوک کر مڑ کر میں نے دیکھا، رتن ہے۔

''کیا ہے رے؟''

''بائی جی نے پرنام کہا ہے۔''

میں جتنا حیران ہوا اتنا ہی پریشان بھی۔ اتنی رات گئے اچانک بلا بھیجنا صرف اپنی توہین ہی نہیں بلکہ گزشتہ تین چار دنوں کے دونوں طرف کے رویہ کو دیکھ کر مجھے بالکل بے ہودہ معلوم ہوا۔ مگر اس نتیجے کے طور پر نوکروں کے روبرو کسی طرح کا جوش ظاہر نہ ہو جائے۔ اس خیال سے میں نے ضبط کر کے کہا...... ''آج میرے پاس وقت نہیں ہے رتن، مجھے باہر جانا ہے کل مل سکوں گا۔''

رتن سکھایا پڑھایا نوکر تھا۔ ادب قاعدے میں پکا۔ مودب اور شیریں لہجے میں بولا...... ''بڑی ضرورت ہے بابو جی، ایک دفعہ اپنے قدموں کی خاک دینی ہوگی ورنہ بائی جی نے کہا ہے کہ وہ خود ہی آ جائیں گی۔''

تباہی، اس خیمہ میں رات کو اتنے لوگوں کی موجودگی میں۔ میں نے کہا۔ ''تو سمجھا دینا رتن! آج نہیں کل صبح ہی مل لوں گا۔ آج تو میں کسی طرف بھی نہیں جا سکتا۔'' رتن نے جواب دیا۔ ''تو پھر وہ ہی

آ جائیں گی بابو جی، میں گزشتہ پانچ سال سے دیکھ رہا ہوں کہ بائی جی کی بات میں کبھی ذرا سا بھی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نہیں چلے گے تو وہ یقیناً ہی آ جائیں گی۔''

اس بے موقعہ اور بے فائدہ ضد کو دیکھ کر میں ایڑی سے چوٹی تک جل اٹھا بولا ...... ''اچھا ٹھہرو، میں آتا ہوں۔'' خیمے کے اندر دیکھا، شراب کی عنایت سے جاگتا کوئی نہیں۔ پرشوتم بھی بے ہوش ہے۔ نوکروں کے خیمے میں صرف دو چار آدمی بھاگ رہے ہیں۔ جھٹ پٹ، بوٹ پہن کر ایک کوٹ جسم پر ڈال دیا۔ رائفل تیار رکھی تھی۔ اس کو ہاتھ میں لے کر رتن کے ساتھ ساتھ بائی جی کے خیمہ میں پہنچا۔ پیاری سامنے ہی کھڑی تھی۔ مجھے جھکے ہوئے سر سے بار بار دیکھتے ہوئے کسی قسم کی تمہید باندھے بغیر ہی غصہ آمیز لہجے میں بولی ...... ''شمشان وغیرہ میں تمہارا جانا نہ ہو سکے گا۔ کسی طرح بھی نہیں۔''

بہت زیادہ متعجب ہو کر میں بولا ...... ''کیوں؟''

''کیوں اور کیا؟ کیا بھوت پریت نہیں ہیں۔ جو اس سنیچر کی اماوس کو تم شمشان جاؤ گے۔ کیا تم جان سلامت لے کر واپس آ سکو گے وہاں سے؟''

اتنا کہہ کر پیاری یکا یک رونے لگی اور آنسوؤں کی مسلسل جھڑی لگا دی۔ میں چپ چاپ اضطراب سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیا کروں، کیا جواب دوں، کچھ سوچ بھی نہ سکا۔ اور اس سوچ نہ سکنے میں تعجب ہی کیا تھا؟ جس سے جان نہیں، پہچان نہیں وہ اگر ہمدردی سے آدھی رات کو بلا کر خواہ مخواہ رونا شروع کر دے تو کون ایسا ہے جو حواس باختہ نہ ہو جائے۔ میری طرف سے جواب نہ پا کر آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ...... ''تم کیا کسی دن بھی آرام اور چین سے نہ بیٹھو گے؟ ایسے ضدی بن کر ہی زندگی گزار دو گے؟ جاؤ، دیکھوں، تم کس طرح جاتے ہو؟ پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے شال اٹھا کر اپنے جسم پر ڈالنے کی تیاری کر دی۔

میں نے اختصار کے ساتھ کہا ...... ''اچھا ہے چلو، میرے اس پوشیدہ طنز سے جل بھن کر پیاری بولی ...... ''آہا، نزدیک و دور پھر تو تمہاری نیک نامی کی حد نہ رہے گی۔ بابو شکار کھیلنے کے لیے آئے تھے اور ایک رقاصہ کو ساتھ لے کر آدھی رات بھوت دیکھنے گئے تھے واہ! میں پوچھتی ہوں گھر سے کیا بالکل ہی اوٹ، ہو کر آئے ہو؟ نفرت، بے اعتنائی، لاج شرم وغیرہ کیا کچھ باقی نہیں رہ گئی۔'' کہتے کہتے اس کا تیز لب ولہجہ گویا بے قرار ہو کر بھاری ہو گیا، بولی ...... ''پہلے تو تم ایسے نہ تھے۔ تم اتنے گر جاؤ گے یہ تو کسی نے کبھی سوچا نہ تھا۔'' اس کے آخری جملہ پر اگر اور کوئی وقت ہوتا تو میں اتنا ناراض ہو اٹھتا جس کی حد نہ رہتی۔ لیکن اس وقت غصہ نہ آیا۔ دل ہی دل میں ایسا محسوس ہوا گویا میں نے پیاری کو پہچان لیا ہے اور دل میں یہ بات کیوں آئی اس کا ذکر پھر کروں گا۔ اس وقت تو یہی کہہ سکا۔ ''لوگوں کے سمجھنے

سوچنے کی قیمت کیا ہے۔'' یہ تو تم خود بھی جانتی ہو۔ اور تم بھی اتنا گر جاؤ گی کیا کبھی کسی نے سوچا تھا۔''

لحہ بھر تک پیاری کے چہرہ پر موسم سرما کی ابر آلود چاندنی کی مانند تبسم کا ایک خط جھلک اٹھا۔ مگر وہ لحہ بھر کے لیے ہی تھا۔ دوسرے ہی لحہ۔ اس نے بے خوف لہجہ میں کہا ...... ''میرے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ کون ہوں میں، بتاؤ؟''

''تم ہو پیاری''

''یہ تو سبھی جانتے ہیں۔''

''جس بات کو سب لوگ نہیں جانتے وہ بھی میں جانتا ہوں۔ اسے سن کر کیا تم خوش ہو گی؟ اگر خوش ہوتیں تو خود ہی اپنا تعارف کرا دیتیں۔ لیکن جس حالت میں تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا تو میرے منہ سے بھی کوئی بات نہ سن سکو گی۔ سوچ کر دیکھو اپنے آپ کو ظاہر کر سکو گی یا نہیں؟ مگر اب وقت نہیں ہے ...... میں جاتا ہوں۔''

پیاری نے برق کی سی تیزی کے ساتھ میرا راستہ روک کر کہا ...... ''اگر نہ جانے دوں تو کیا زبردستی چلے جاؤ گے۔''

''لیکن جانے ہی کیوں نہ دو گی؟''

پیاری بولی ...... ''جانے دوں؟ سچ مچ ہی کیا جھوٹ نہیں ہوتے جو تمہارے صرف جانے دو، کہنے سے ہی جانے دوں گی؟ میں کہے دیتی ہوں کہ میں بات کی بات میں ''پیاری میا، چلا کر بھیڑ جمع کر دوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے بندوق چھین لینے کی کوشش کی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ لمحوں سے میری ناراضگی ہنسی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس دفعہ خوب ہنس کر کہہ دیا ...... ''سچ مچ کے بھوت ہوتے ہیں یا نہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن جھوٹ موٹ کے بھوت ضرور ہوتے ہیں وہ سامنے کھڑے ہو کر بات چیت کرتے ہیں، روتے ہیں، راستہ روکتے ہیں اور ایسے ایسے کتنے ہی شہرت کے کام کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر گردن دبوچ کر کھا بھی جاتے ہیں۔'' پیاری اداس ہو گئی اور چشم زدن کے لیے شاید سوچ نہ سکی کہ کیا کہے۔ اس کے بعد بولی ...... ''اگر یہ بات ہے تو جو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے مجھے پہچان لیا، یہ تمہاری غلطی ہے۔ وہ بے شمار شہرت کے کام کرتے ہیں یہ سچ ہے مگر گردن دبوچنے کے لیے راستہ روک کر کھڑے نہیں ہوتے۔ انہیں اپنے پرائے کی تمیز ہوتی ہے۔ میں نے پھر ہنس کر سوال کیا۔ یہ تو ہوئی تمہاری اپنی بات لیکن کیا تم بھوت ہو؟''

پیاری بولی ...... ''بھوت ہی تو ہوں اور نہیں تو کیا؟ جو لوگ مر کر بھی نہیں مرتے وہی تو بھوت ہیں۔ یہی تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ خود ہی پھر کہنے لگی۔ ''ایک حساب سے تو، جو

میں مرچکی ہوں یہ سچ ہے لیکن سچ ہو خواہ جھوٹ اپنے مرنے کی خبر میں نے مشہور نہیں کی۔ ماما کے ذریعہ ماں نے پھیلائی تھی۔ سننا چاہتے ہو سب حال؟''

مرنے کی یہ بات سنتے ہی میرا تمام شک رفع ہو گیا۔ میں نے اچھی طرح جان لیا کہ یہ راج لکشمی ہے۔ بہت عرصہ پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ تیرتھ یاترا کرنے گئی تھی۔ اور پھر واپس لوٹ کر نہ آئی۔ ماں نے گاؤں میں آ کر یہ بات مشہور کر دی کہ کاشی میں ہیضے کی بیماری سے وہ مر گئی ہے...... اسے میں نے کبھی دیکھا ہے یہ بات مجھے یاد نہ آتی تھی۔ مگر اس کی ایک عادت پر میں جب سے یہاں آیا تھا اسی وقت سے غور کر رہا تھا یعنی جب وہ غصّے میں ہوتی تھی تو اپنے ہونٹ دانتوں کے نیچے دبا لیا کرتی تھی۔ کبھی کہیں کسی کو بالکل ایسا کرتے کئی بار دیکھا ہے صرف یہی بات بار بار یاد آتی تھی۔ وہ کون تھا؟ کہاں دیکھا تھا؟ کب دیکھا تھا؟ اس کے متعلق کچھ بھی یاد نہ آتا تھا۔ وہی راج لکشمی آج ایسی ہو گئی ہے، یہ دیکھ کر میں حیرت واستعجاب سے دم بخود رہ گیا۔ جس وقت میں اپنے گاؤں کے پنڈت منسا کی پاٹھ شالہ میں سب طالب علموں کا سردار تھا تو اس کے دو پشت کے معزز باپ نے اپنی دوسری شادی کر کے اس کی ماں کو گھر سے نکال دیا۔ شوہر سے ٹھکرائی ہوئی ماں، سرلکشمی اور راج لکشمی نام کی دو لڑکیوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی۔ اس کی عمر اس وقت آٹھ نو سال کی ہوگی۔ اور سرلکشمی کی بارہ تیرہ سال۔ اس کا رنگ تو ضرور ہی خوب گورا تھا۔ لیکن ملیریا اور تلی کی بیماری سے پیٹ مٹکے کی طرح، ہاتھ پاؤں سوکھی لکڑی کی طرح اور سر کے بال تانبے کی سلاخوں کی طرح تھے۔ اور کتنے تھے یہ بھی گنے جا سکتے تھے۔ میری مار کے ڈر سے یہ لڑکی کروندے کی جھاڑی میں گھس کر کروندوں کا ہار بنا کر مجھے دیا کرتی تھی۔ اگر وہ ہار کسی دن چھوٹا ہوتا تو میں اپنا پرانا سبق پوچھ کر اسے جی بھر کر چپتایا کرتا تھا۔ مار کھا کر یہ لڑکی ہونٹ چباتی ہوئی گم سم ہو کر بیٹھ رہتی۔ لیکن کسی طرح بھی یہ نہ کہہ سکتی کہ روز روز کروندے جمع کرنا اس کے لیے کتنا مشکل ہے۔ جو کچھ بھی ہو اتنے روز تک تو میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ مار کے خوف سے اتنی تکلیف برداشت کرتی تھی۔ لیکن آج دفعتہً کچھ شک پیدا ہو گیا۔ خیر جانے دو۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ یہ شادی بھی ایک عجیب بیوپار تھا۔ بچارا ماما بھانجیوں کے بیاہ کی فکر میں مرا جا رہا تھا۔ کارے قضا سے کہیں یہ خبر آئی۔ درنجی دت کا رسوئیا اونچے خاندان کی اولاد ہے دت صاحب بانکڑے سے اپنی تبدیلی ہوتے وقت اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ درنجی دت کے دروازہ پر ماما دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ برہمن کی قومی حفاظت کرنی ہو گی۔ ابھی تک ہر ایک یہی جانتا تھا، دت صاحب کا رسوئیا سیدھا سادہ اور نیک انسان ہے مگر مطلب کے موقعہ پر دیکھا گیا کہ رسوئیا مہاراج دنیاوی عقل میں کسی سے رتی بھر بھی کم نہیں۔ صرف اکیاون روپے ہتر کی بات سنتے ہی وہ زور سے سر ہلا کر بولے...... ''صاحب! اتنے سستے تو نہیں ہو سکتا۔ بازار کا بھاؤ

دیکھ لیجئے۔ پچاس اور ایک روپے میں تو ایک جوڑی بڑے بکرے بھی نہیں ملتے۔ اور ایک اس رقم میں داماد خرید رہے ہیں۔ ایک سو ایک روپے دو تو ایک دفعہ اس پاٹے پر اور ایک اس پاٹے پر بیٹھ کر دو پھول چھوڑ دوں گا دونوں ہی بہنیں ایک ساتھ پار ہو جائیں گی۔ کیا ایک سو ایک روپے...... دو سانڈ خریدنے کا خرچ...... بھی آپ نہ دیں گے؟'' بات کچھ غیر مناسب بھی نہ تھی۔ پھر بھی کافی مول تول اور بڑی منت سفارش کے بعد ستر روپے میں طے ہو کر ایک ہی رات میں ایک ساتھ سرلکشی اور راج لکشمی کی شادی ہو گئی۔ دو دن بعد ستر روپیہ نقد لے کر دو پشت کا دو خاندان برہمن داماد باٹکرا چل دیا۔ اس کے بعد پھر کسی نے اسے نہ دیکھا۔ ڈیڑھ سال بعد پلیگ کے بخار سے سرلکشمی مر گئی اور اس کے بھی ڈیڑھ سال بعد اس راج لکشمی نے کاشی میں مر کر نروان حاصل کیا۔ یہی ہے پیاری بائی کی مختصر سوانح حیات۔

بائی جی نے کہا...... ''تم کیا سوچ رہے ہو، بتاؤں بھلا؟''

''کیا سوچ رہا ہوں؟''

''تم سوچ رہے ہو۔ آہا لڑکپن میں میں نے اسے کتنی تکلیف دی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں بھیج کر روز روز کروندے منگواتا تھا۔ اور اس کے عوض مار پیٹ ہی کرتا رہا ہوں۔ مار کھا کر یہ گپ چپ ہمیشہ رویا ہی کی ہے۔ لیکن کسی شے کی کبھی خواہش نہ کی۔ آج اگر یہ کوئی بات کہتی ہے تو سن لینے میں کیا حرج ہے۔ نہ سہی، نہ گیا آج شمشان کو...... یہی نا۔''

میں ہنس پڑا۔

پیاری نے بھی ہنس کر کہا...... ''یہ تو ہونا ہی چاہئے۔ بچپن میں جس سے ایک مرتبہ پیار کیا جاتا ہے کیا وہ کبھی بھولتا ہے؟ اور اگر اصرار کرے تو پھر اسے کیا پاؤں سے ٹھوکر مار کر ٹالا جا سکتا ہے؟ دنیا میں کون اتنا سنگدل ہے؟ چلو ذرا بیٹھ لو۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ رتن، بابو جی کے جوتے تو کھول دے...... ارے ہنستے ہو؟''

''ہنستا ہوں یہ دیکھ کر کہ تم لوگ انسان کو پھسلا کر کس طرح قابو میں کر لیا کرتی ہو؟''

پیاری بھی مسکرا دی۔ بولی...... ''یہ دیکھ کر ہنستے ہو، اوروں کو تو باتوں میں بھلا کر قابو میں کیا جا سکتا ہے لیکن ہوش میں آتے ہی جس کے قابو میں رہی ہوں اسے بھی کیا باتوں میں بھلایا جا سکتا ہے۔ اچھا، آج تو جیسے میں بات کرتی ہوں مگر ہر روز جب کانٹوں میں الجھ کر ہار گوندھ دیتی تھی۔ اس وقت کتنی بات کیا کرتی تھی کہو نا؟ وہ کیا تمہاری مار کے خوف سے، یہ بات بھول کر بھی اپنے دل میں مت لانا۔ راج لکشمی ایسی نہیں ہے۔ لیکن رام رام! تم تو مجھے بالکل ہی بھول چکے تھے۔ دیکھ کر پہچان بھی نہ سکے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں اپنے دل میں جگہ ہی کب دی تھی۔ جو بھولتا نہ؟ بلکہ آج

میں نے تمہیں پہچان لیا ہے یہ دیکھ کر مجھے خود ہی حیرت ہو رہی ہے۔ اچھا بارہ بج چکے...... جاتا ہوں۔"

پیاری کا ہنستا چہرہ آن واحد میں بالکل پھیکا پڑ گیا۔ قدرے سنبھل کر اس نے کہا...... "اچھا تم بھوت پریت کے قائل نہ بنو۔ لیکن سانپ، بچھو، بھیڑیئے، شیر، جنگلی سؤر وغیرہ تو بن جنگل میں اندھیری راتوں کو پھرا ہی کرتے ہیں انہیں تو ماننا چاہیئے۔"

میں نے کہا...... "ان کو تو میں مانتا ہی ہوں۔ اور ان سے خوب محتاط ہو کر چلتا ہوں۔"

مجھے جانے کے لیے تیار دیکھ کر وہ آہستہ سے بولی...... "تم جس دھات کے بنے ہوئے انسان ہو۔ مجھے معلوم ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں روک نہ سکوں گی۔ یہ اندیشہ مجھے خوب ہی ہو رہا تھا تاہم میں نے سوچا کہ رو دھو کر ہاتھ پاؤں جوڑ کر آخری لمحہ تک شاید تمہیں روک سکوں۔ مگر دیکھتی ہوں کہ رونا ہی کامیاب رہا۔" مجھے جواب نہ دیتے دیکھ کر وہ پھر بولی۔ "اچھا جاؤ، پیچھے لوٹا کر اب اور بدشگونی نہ کروں گی۔ لیکن اگر کچھ ہو گیا تو اس پردیس میں، غیر جگہ، راجے راجواڑے یا دوست احباب کسی بھی کام نہ آئیں گے۔ یہ تو سب مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔ مجھے پہچان نہیں سکتے۔ یہ میرے منہ پر ہی کہہ کر تم تو اپنی مردانگی کی ڈینگ ہانک کر چل دیئے مگر ہمارا دل تو نسوانی ہے مصیبت کے وقت میں تو یہ نہ کہہ سکوں گی۔ کہ میں تمہیں پہچانتی ہی نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک گہری آہ دبا لی۔ جاتے جاتے میں نے واپس مڑ کر کھڑے ہو کر ہنس دیا۔ نامعلوم مجھے کسی قدر کوفت ہوئی۔ میں بولا...... "اچھا ہی ہے بائی جی، یہ تو مجھے ایک بہت بڑا فائدہ ہو گا۔ میرا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اس لیے میں جانہ سکوں گا۔ کیونکہ اس وقت میں یہی خیال کروں گا کہ میرا بھی کہیں کوئی ہے جسے چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔"

پیاری نے جواب دیا۔ "یہ کیا تم جانتے نہیں ہو؟ ایک سوا ایک بار بائی جی، کہہ کر تم خواہ میری کتنی ہی توہین کیوں نہ کرو، راج لکشمی تمہیں چھوڑ کر نہ جا سکے گی۔ اس بات کو کیا تم دل سے نہیں جانتے۔ لیکن بفرض محال اگر میں تم کو چھوڑ کر جا سکتی تو اچھا ہی ہوتا۔ تمہیں بھی سبق مل جاتا۔ لیکن کتنی بری ہے عورتوں کی یہ ذات ایک مرتبہ کسی سے پیار کیا کہ مریں۔"

میں بولا...... "پیاری بھولے سنیاسی کو بھی بھیک نہیں ملتی، جانتی ہو کیوں؟"

پیاری بولی...... "جانتی ہوں مگر تمہارے طنز میں اتنی کاٹ نہیں کہ مجھے چھید سکو۔ یہ میری خداداد دولت ہے۔ اور جس وقت مجھے دنیا کے نیک و بد تک کی تمیز نہ تھی یہ دولت بھی اسی وقت کی ہے آج کی نہیں۔"

میں قدرے نرم ہو کر بولا...... "اچھی بات ہے چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر کوئی آفت آ جائے اور تمہاری اس خداداد دولت کا ہاتھوں ہاتھ امتحان ہو جائے۔"

پیاری بولی...... "رام رام! ایسی بات مت کہو، اچھے بھلے لوٹ آؤ۔ اس صداقت کی آزمائش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری ایسی تقدیر کہاں کہ وقت موقعے پر اپنے ہاتھ پاؤں ہلا جلا کر تمہیں تندرست و توانا بنا سکوں اگر یہ ہو تو سمجھوں گی کہ اس زندگی کے ایک اہم فرض کو ادا کر ڈالا۔" اتنا کہہ کر اور منہ پھیر کر اس نے اپنے آنسو چھپا لئے۔ یہ ہری کین کی مدھم روشنی میں بھی اچھی طرح جان گیا۔

"اچھا بھگوان تمہارا یہ ارمان بھی کسی دن پورا کریں۔" کہہ کر اور مزید تاخیر کئے بغیر میں خیمے سے باہر آ کھڑا ہوا۔ کون جانتا تھا کہ ہنسی مذاق میں ہی میری زبان سے ایک خوفناک سچائی نکل جائے گی۔

خیمے کے اندر سے آنسوؤں کی کثرت بھرے ہوئے گلے سے درگا، درگا، کی دردناک پکار کان میں آئی اور میں تیز چال سے چل دیا۔

میرا تمام دل پیاری کی باتوں سے مستور تھا۔ کب میں آم کے باغیچہ کے نہایت تاریک راستہ کو پار کر گیا اور کب ندی کے ساحل پر سرکاری باندھ کے اوپر آ کھڑا ہوا۔ یہ مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ تمام راستہ بھر محض یہی ایک بات سوچتا رہا کہ عورت کا دل کیسا عظیم اچنبھا ہے۔ اس تلی کی مریض لڑکی نے اپنے مٹکے سے پیٹ اور لکڑی جیسے ہاتھ پاؤں لے کر پہلی مرتبہ کس وقت مجھے چاہا تھا اور کرندوں کی مالا سے اپنی غریبانہ پرستش کو کامیاب بنایا تھا۔ یہ میں بالکل ہی جان نہ سکا اور آج جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حیرت کچھ اس لیے بھی تھی کہ ناول اور ناٹکوں میں بچپن کی محبت کی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں۔ لیکن جس شے کو فخر کے ساتھ، اپنی خداداد دولت کہہ کر ظاہر کرتے ہوئے بھی اسے جھجک نہیں ہوئی۔ اس کو اس نے اتنے دنوں تک اپنی اس نفرت آمیز زندگی کے سینکڑوں جھوٹے پیاروں کی موجودگی میں کس کونے میں زندہ رکھ چھوڑا تھا۔ کس جگہ سے اس کے لیے خوراک بہم پہنچاتی رہی؟ کس راستے داخل ہو کر وہ اس کی پرورش کرتی رہی؟

"باپ"

میں یک دم چونک پڑا۔ سامنے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ بھوڑے رنگ کی ریت کا ایک وسیع میدان ہے اور اسے چیرتی ہوئی ندی کی بل کھاتی ہوئی دھار ٹیڑھی میڑھی ہو کر بہت دور جا کر ناپید ہو گئی ہے۔ تمام میدان میں جا بجا کائی کے جھنڈ اگ رہے ہیں۔ تاریکی میں یکا یک ایسا معلوم ہوا وہ تمام جھنڈ ایک ایک آدمی ہیں جو آج کی اس تیرہ و تار اماوسا کی رات کو بھوت روحوں کا رقص دیکھنے کے لیے مدعو ہو کر آئے ہیں۔ اور ریت کے بچھے ہوئے فرش پر اپنی اپنی مسند لگائے سناٹے میں انتظار کر رہے ہیں۔ سر پر گھنے کالے آسمان میں لاتعداد ستارے بھی بے تابی کے ساتھ اپنی آنکھوں کو ایک ساتھ کھولے ہوئے

تاک رہے ہیں۔کوئی ہوا نہیں کوئی آواز نہیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اپنے سینے کی دھڑکن کے علاوہ کہیں بھی آہٹ محسوس کرنے کی گنجائش نہیں۔رات کا جو پرندہ، باپ، کہہ کر تھم گیا وہ بھی اور کچھ نہ بولا ...... میں آہستہ آہستہ مغرب کی طرف چلا۔اسی طرح وہ مہاشمشان تھا۔ایک دن شکار کے لیے آنے پر جس سیمر کے جھنڈوں کے جھنڈ کو دیکھ گیا تھا کچھ فاصلہ طے کرنے پر ان کی سیاہی مائل شاخیں اور پتے نظر آنے لگے۔یہی تھے اس مہاشمشان کے دربان ان ہی کو پار کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔اسی وقت سانس کی مبہم سی آہٹ ملنے لگی۔لیکن یہ ایسی نہ تھی جس سے دل خوش ہو۔کچھ دور چلنے پر وہ کچھ اور صاف ہوئی۔ کسی ماں کے کمبھ کرن کی نیند میں سو جانے پر اس کا ننھا بچہ روتے روتے تھک کر اور بے جان سا ہو کر آخر کار جس طرح رہ رہ کر روں روں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ایسا معلوم ہوا کہ بالکل اسی طرح شمشان کی خلوت میں کوئی روں روں کر رہا ہے۔میں شرط لگا سکتا ہوں۔کہ جس نے پہلے اس قسم کے رونے کی حقیقت دیکھی سنی نہ ہو۔وہ اس گہری اندھیری اماوس کی رات میں اکیلا ایک قدم بھی آگے بڑھانا نہ چاہے گا۔وہ انسان کا بچہ نہیں چمگادڑ تھا جو اندھیرے میں اپنی ماں سے بچھڑ کر رو رہا تھا۔یہ بات پہلے سمجھے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی اپنے آپ یقینی طور پر یہ کہہ سکے کہ یہ آواز انسان کے بچے کی نہیں۔اور بھی نزدیک جا کر دیکھا ٹھیک یہی بات تھی۔جھولوں کی طرح سمر کی ہر شاخ میں لٹکے ہوئے لاتعداد چمگادڑ رات بسر کر رہے ہیں۔اور ان میں سے کوئی شیطان بچہ اس طرح بے قرار ہو کر رو رہا ہے۔

جھاڑی کے اوپر وہ روتا ہی رہا۔اور اس کے نیچے بڑھتا ہوا میں اس مہاشمشان کے ایک حصے میں جا کھڑا ہوا۔صبح اس بوڑھے نے جو کہا تھا کہ یہاں لاکھوں انسانی کھوپڑیاں گنی جا سکتی ہیں ...... میں نے دیکھا کہ اس بیان میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔تمام میدان انسانی کھوپڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔گیند کھیلنے کے لیے انسانی کھوپڑیاں تو وہاں لاتعداد پڑی ہیں لیکن ابھی تک کوئی بھی کھلاڑی کھیلنے کے لیے نہ آیا تھا۔میرے علاوہ کوئی اور بغیر جسم کا تماشائی حاضر تھا یا نہیں۔ان دو فانی آنکھوں سے میں دیکھ نہ سکا۔ اس وقت اماوس اپنے پورے جوبن پر تھی۔اس لیے کھیل شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔یہ سوچ کر میں ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا۔بندوق کھول کر اس کے گھوڑے کی اور ایک بار جانچ کر کے پھر اسے مناسب جگہ لگا کر میں نے اسے گود میں رکھ لیا اور مستعد ہو رہا۔مگر وائے بدقسمتی، مصیبت کے وقت اس گھوڑے نے کچھ بھی ساتھ نہ دیا۔

پیاری کی بات یاد آ گئی۔اس نے کہا تھا۔''اگر تم بھوت کے سچ مچ ہی قائل نہیں ہو تو پھر وہاں کرنے ہی کیا جاتے ہو؟ اور اگر اعتقاد میں اتنا زور نہیں تو پھر بھوت پریت خواہ ہوں یا نہ ہوں تمہیں کسی طرح بھی جانے نہ دوں گی۔'' سچ تو یہ ہے آخر یہاں دیکھنے کیا آیا ہوں؟ محض دکھانے آیا ہوں کہ مجھ

میں کتنی جرأت اور استقلال ہے۔صبح جن لوگوں نے کہا تھا...... ''بزدل بنگالی کام کے وقت بھاگ جاتے ہیں۔'' مجھے تو ان باتوں کا باثبوت یہی دکھانا ہے کہ بنگالی لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔''

میرا یہ مدتوں کا زبردست اعتقاد تھا کہ انسان کے مرجانے پر پھر اس کی کوئی ہستی نہیں رہتی۔ اور اگر رہتی بھی ہے تو شمشان میں اس کے خاکی جسم کو تکلیف اور آزار پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔وہاں اسی جگہ لوٹ کر اپنی ہی کھوپڑی میں مار مار کر اسے لڑھکاتے پھرنے کی خواہش نہ تو قدرتی ہی ہے اور نہ مناسب ہی، کم از کم میں تو اپنے متعلق ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔یہ علیحدہ بات ہے کہ سب انسانوں کا مزاج ایک سا نہیں ہوتا۔اگر کسی کی ہوتی ہو تو ایسی اعلیٰ رات، رات بھر بیدار رہ کر میرا اتنی دور تک آنا رائیگاں نہیں جائے گا۔اور آج اس بوڑھے نے اس کی بہت بڑی امید دلائی تھی۔

دفعتہً ہوا کا ایک جھونکا کتنا ہی ریت اڑاتا ہوا میرے جسم پر سے ہو کر نکل گیا۔اور وہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دوسرا اور پھر تیسرا بھی اوپر سے ہو کر نکل گیا۔دل میں سوچنے لگا کہ بھلا یہ کیا ہے؟ اب تک تو ذرا سی بھی ہوا نہ تھی۔اپنے آپ خواہ کتنا ہی کیوں نہ سمجھوں اور سمجھاؤں تاہم یہ اعتقاد کہ مرنے کے بعد بھی کچھ نامعلوم سا رہ جاتا ہے۔یہ اعتقاد ہمارے گوشت اور پوست میں ملا رہتا ہے۔اور جب تک گوشت پوست ہے تب تک وہ بھی ہے۔پھر خواہ میں اسے تسلیم کروں یا نہ کروں اس لیے ہوا کے اس جھونکے نے صرف ریت اور مٹی ہی نہیں اڑائی بلکہ میرے گوشت پوست میں سرایت کیے ہوئے اس اعتقاد کو بھی چوٹ پہنچائی۔رفتہ رفتہ ہوا کچھ اور زور سے چلنے لگی۔بہت سے لوگ شاید یہ نہیں جانتے کہ مردہ انسان کی کھوپڑی میں سے ہوا گزرنے سے بالکل گہری سانس چھوڑنے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ آن کی آن میں نزدیک و دور، آگے پیچھے چاروں طرف گہری سانوں کی ایک جھڑی سی لگ گئی۔بالکل ایسا محسوس ہونے لگا گویا کتنے ہی آدمی مجھے گھیر کر بیٹھے ہیں اور لگاتار زور زور سے ہائے ہائے کر کے سانسیں لے رہے ہیں۔اور انگریزی میں جسے ''انکینی فیلنگ'' (ان مناسا لگنا) کہتے ہیں۔اسی قسم کے ایک اضطراب یا بے چینی سے تمام جسم لرز اٹھا۔چمگادڑ کا وہ بچہ اب بھی خاموش نہ ہوا تھا۔بلکہ الٹا اور بھی زور زور سے روں روں کرنے لگا تھا۔مجھے اب محسوس ہونے لگا کہ میں خوفزدہ ہو رہا ہوں۔کافی واقفیت کے بل پر یہ خوب جانتا تھا کہ جس جگہ آیا ہوں وہاں پر موقعہ اگر خوف کو دبا نہ سکا تو موت تک واقع ہو جانا ناممکن نہیں۔درحقیقت اس قسم کی خوفناک جگہ میں اس سے پہلے کبھی تنہا نہ آیا تھا۔بے خوف ہو کر جو شخص اکیلا آ سکتا تھا وہ اندر تھا۔میں نہیں۔کئی مرتبہ اس کے ساتھ کئی خوفناک مقامات پر جانے سے میرا خیال ہو گیا تھا کہ خواہش ہونے پر میں خود بھی اس کی مانند ہر ایک جگہ اکیلا جا سکتا ہوں۔لیکن یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔اور اس وقت میں صرف اسی خبط میں اس کی تقلید کرنے چلا تھا۔ایک ہی لمحہ میں آج سب بات

صاف ہو اٹھی تھی۔ میرا اتنا فراخ سینہ کہاں؟ میرے پاس رام نام کا وہ زرہ بکتر کہاں؟ میں اندر نہیں ہوں جو بھوتوں کے اس مسکن میں تنہا کھڑا رہوں اور ٹکٹکی باندھ کر بھوت روحوں کا گیند کھیلنا دیکھوں۔ دل میں آیا کہ کوئی ایک آدھ زندہ بھیڑیاں یا شیر ہی نظر آ جائے تو شاید زندہ بچ جاؤں۔ یکا یک کسی نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر میرے داہنے کان پر سانس ڈالی۔ وہ اتنی سرد تھی کہ برف کے ذرات کی طرح گویا اسی جگہ جم گئی۔ گردن اٹھائے بغیر ہی مجھے صاف صاف معلوم ہوا کہ وہ سانس جس ناک کے بڑے بڑے نتھنوں سے ہو کر آئی ہے اس میں نہ گوشت ہے نہ پوست۔ ایک بوند خون بھی نہیں ہے۔ صرف ہڈی اور سوراخ ہی ہے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں تاریکی محیط تھی۔ سناٹے کی آدھی رات سائیں سائیں کرنے لگی۔ آس پاس کی ہائے ہائے رفتہ رفتہ ہاتھوں کے قریب سے چھوتی ہوئی گزرنے لگی۔ کانوں پر بدستور ویسی ہی نہایت سرد سانسیں لگا تار آنے لگیں اور مجھے سب سے زیادہ بے بس کرنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا گویا بھوت اور پریت روحوں کے مسکن کی تمام سرد ہوا باہر آ کر میرے کانوں کو چھو رہی ہے۔

لیکن اس حالت میں بھی مجھے یہ بات بھول نہ سکی کہ کسی طرح بھی اپنے ہوش وحواس گم کر دینے سے کام نہ چلے گا۔ اگر ایسا ہوا تو موت لازمی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرا داہناں پاؤں تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اس کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکا نہیں۔ گویا وہ میرا پاؤں ہی نہ ہو۔

عین اسی وقت بہت دور سے بہت سے گلوں کی اجتماعی آواز کانوں میں پہنچی ''بابو جی! بابو صاحب!'' جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کون لوگ پکار رہے ہیں؟ دوبارہ آواز آئی، کہیں گولی مت چھوڑ دیئے گا۔'' آواز آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ترچھا دیکھنے سے روشنی کی مدھم سی کرنیں نظر آئیں۔ ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ اس چلاہٹ میں رتن کے لہجہ کا شک ہے۔ کچھ دیر اور ٹھہر کر صاف معلوم ہوا کہ ضرور وہی ہے۔ اور بھی آگے بڑھ کر سیمر کے ایک درخت کے نیچے آڑ میں کھڑا ہو کر وہ چلایا...... ''بابو جی، آپ جہاں بھی ہوں گولی مت چھوڑ دیئے میں ہوں رتن۔'' رتن سچ مچ ذات کا حجام ہے اس میں مجھے ذرا سا بھی شک نہ رہا۔

میں نے جوش میں چلا کر جواب دینا چاہا لیکن گلے سے آواز ہی نہ نکلی۔ روایت ہے کہ بھوت پریت جاتے وقت کچھ نہ کچھ تباہ کر جاتے ہیں۔ اس لیے جو میرے پیچھے تھا وہ میرے گلے کی آواز ہی تباہ کر کے رخصت ہوا تھا۔

رتن اور دیگر تین آدمی ہاتھ میں لیمپ اور لٹھ لئے ہوئے پاس آئے ان میں ایک تو تھا چھٹو لال جو طبلہ بجایا کرتا تھا۔ دوسرا تھا پیاری کا دربان اور تیسرا گاؤں کا چوکیدار۔

رتن بولا...... ''چلئے تین بجتے ہیں۔''

'چلو' کہہ کر میں آگے ہو لیا۔ راستہ چلتے چلتے رتن کہنے لگا۔'' بابو جی، کمال ہے آپ کی جرأت، ہم چار ہیں پھر بھی جس طرح ڈرتے ڈرتے یہاں آئے ہیں اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔''

''تم آئے ہی کیوں؟''

رتن بولا...... ''روپوؤں کے لالچ سے، ہم سب کو ایک ایک مہینے کی تنخواہ جو نقد ملی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ میرے قریب آیا اور دھیمی آواز سے بولا...... ''آپ کے چلے جانے پر دیکھا۔ ماں بیٹھی رو رہی ہیں۔ مجھ سے بولیں...... رتن، نہ معلوم کیا ہونے والا ہے بھیا، تم لوگ پیچھے پیچھے جاؤ۔ میں تم سب کو ایک ایک مہینے کی تنخواہ انعام دوں گی'۔ میں نے جواب دیا۔'' چھٹو لال اور گنیش کو ساتھ لے کر جا سکتا ہوں ماں، لیکن راستہ تو میں نے دیکھا نہیں ہے۔'' اسی وقت چوکیدار نے ہانک دی۔ ماں بولیں...... ''اسے بلا لے رتن، وہ ضرور راستہ جانتا ہوگا''۔ باہر جا کر میں اسے بلا لایا۔ چوکیدار کو جب چھ روپے نقد مل گئے تو راستہ دکھاتا ہوا لے آیا۔ اچھا بابو جی، آپ نے چھوٹے بچے کا رونا سنا ہے؟'' یہ کہہ کر کانپتے ہوئے رتن نے میرے کوٹ کے پچھلے حصّہ کو پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔'' ہمارے گنیش پانڈے برہمن ہیں اسی لیے ہم لوگ آج بچ گئے ورنہ......''

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تردید کر کے کسی کے عقیدہ کو زک پہنچانے کی میری فطرت نہیں۔ سحر خوردہ کی طرح چپ چاپ چلنے لگا۔

کچھ دور چلنے کے بعد رتن نے پوچھا...... ''آج کچھ دیکھا بابو جی؟''

میں بولا...... ''نہیں''

میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے صاف نظر آنے لگا کہ پیاری ایک دیئے کے سامنے بے تاب اور تر آنکھوں سے بیٹھی بیٹھی انتظار کر رہی ہے اور میرا دل بے اختیار جذبہ سے دھڑکتا ہوا دوڑا جا رہا ہے۔

رتن نے مودبانہ عرض کیا..... ''آیئے''

چشم زدن کے لیے آنکھیں بند کر کے اور دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھا وہاں ہوش و حواس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ سب کے سب شراب کے نشے میں چور ہو رہے تھے۔ رام رام، متوالوں کے اس گروہ کو لے کر ان سے ملنے جاؤں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔

دیر ہوتے دیکھ کر رتن حیرت سے بولا..... ''اس جگہ اندھیرے میں کیوں کھڑے ہو بابو جی..... آیئے نا؟''

میں جھٹ پٹ بول اٹھا۔ ''نہیں رتن، اس وقت نہیں ..... میں چلتا ہوں۔''

رتن بضد ہو کر بولا..... ''لیکن ماں، راہ دیکھتی بیٹھی ہیں.....''

''میں ایسا ہوں، میں ویسا ہوں۔ یہ کام مجھ سے ہرگز نہ ہوتا۔ وہ کام میں مرجانے پر بھی نہ کرتا۔ وغیرہ وغیرہ'' تو یہ باتیں سن کر مجھے شرم آئے بغیر نہیں رہتی اور طرہ یہ کہ محض اپنے دل کے متعلقہ ہی نہیں بلکہ دوسروں کے متعلق بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے غرور کی انتہا نہیں۔ ایک مرتبہ نقادوں کے مضامیں پڑھ کر دیکھیے خواہ مخواہ ہنسی آ جائے گی۔ شاعر کو نظر انداز کر کے وہ خیالی کردار کو انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور زور سے کہتے ہیں۔ ''یہ کردار کسی طرح بھی ویسا نہیں ہو سکتا..... وہ کردار کبھی ویسا نہیں کر سکتا'' اسی قسم کی اور بھی کتنی باتیں ہیں۔ لوگ واہ واہ کر اٹھتے ہیں۔ ''واہ اسی کا نام تو تنقید..... ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں کرداروں پر تبصرہ۔ سچ ہی تو کہا ہے فلاں نقاد کی موجودگی میں من مانا لکھ دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ دیکھو کتاب میں جو اوٹ پٹانگ غلطیاں اور غلط فہمیاں تھیں۔ وہ سب کس طرح چھان بین کر رکھ دی گئی

ہیں۔'' اسے رہنے دو۔ غلطی بھلا کس سے نہیں ہوتی۔ لیکن پھر تو میں اپنی زندگی پر تنقید کر کے۔ یہ سب پڑھ کر ان لوگوں کی ندامت کے بوجھ سے اپنا سر اور نہیں اٹھا سکتا۔ دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ ''اوئے بدبختی، کہا جاتا ہے۔ کہ انسان کے اندر کی شے لامحدود ہے مگر یہ کیا محض کہنے کے لیے ہی ہے۔ وقت آنے پر اس کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور کوئی پھوٹی کوڑی بھی اس کی قیمت نہیں دیتا۔ آپ کا ہزار جنم کے نامعلوم کتنے لاکھ عجیب و غریب کارنامے اس لامحدود میں محو پڑے ہوتے ہیں۔ اور یکایک بیدار ہو کر آپ کی علمیت، آپ کی تعلیم و تحصیل، آپ کی قابلیت آپ کی مردم شناسی کے غرور کو چشم زدن میں چور کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ بات کیا ایک دفعہ بھی آپ کے دل میں نہیں آئی..... ''یہ بھی کیا آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہی تو اس لامحدود روح کی نشست گاہ ہے؟''

یہی تو میں ان داجیجی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی پاکیزہ اور پر جلال صورت اس وقت تک بھی نہیں بھول سکی۔ جب سے جیجی چلی گئی ہیں نامعلوم کتنی خاموش اور سنجیدہ راتوں میں آنکھوں کے پانی سے میرا تکیہ تر ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جیجی مجھے اپنے آپ کے لیے کوئی تشویش نہیں ہے۔ تمہارے پارس سے چھو کر میرے اندر باہر کا تمام لوہا سونا بن چکا ہے۔ اور کسی بھی آب و ہوا سے زنگ لگنے کا اندیشہ نہیں رہا۔ لیکن کہاں گئیں تم جیجی؟ جیجی اپنی اس خوش قسمتی میں میں اور کسی کو بھی حصہ دار نہیں بنا سکا۔ اور تمہیں بھی کوئی نہیں دیکھ سکا ورنہ تمہارا درشن کر کے ہر انسان نیکی اور پاکیزگی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس بات کو لے کر میں اس وقت بچوں کے سے تصورات میں تمام رات جاگ کر گزار دیتا تھا۔ اور گاہے گاہے سوچتا کہ دیوی چودھرانی کی طرح اگر کہیں سے سات گھڑے اشرفیاں پا جاؤں تو ان داجیجی کو ایک عظیم الشان تخت پر بٹھا دوں۔ جنگل کاٹ کر، جگہ صاف کر کے گاؤں کے لوگوں کو بلاؤں اور انہیں اس تخت کے چاروں طرف بسا دوں۔ کبھی سوچتا ایک بڑے بھاری بجرے میں انہیں سوار کر کے بینڈ بجاتا ہوا انہیں دیش بدیش کے لیے پھروں۔ اس قسم کے نامعلوم کتنے فردوسی پھولوں کی مالائیں گونتھا رہتا۔ اس وقت اس کا تصور کر کے بھی مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی کچھ کم نہیں گرتے۔

اس وقت میرے دل میں یہ یقین ہمالہ کی طرح مضبوط ہو چکا تھا کہ اس لامحدود کائنات میں اور کوئی ایسی عورت نہیں جو مجھے فریفتہ کر سکے۔ ..... لیکن کسی دوسری دنیا میں بھی ہے یا نہیں یہ میرے تصور سے بعید تر تھا۔ سوچتا تھا کہ زندگی میں جب کبھی کسی زبان میں ایسی ملائم اور شیریں گفتار، ہونٹوں میں ایسی ولآویز مسکراہٹ، پیشانی پر ایسا بے مثل نور، آنکھوں میں ایسی دردمند نگاہ نظر آئے گی۔ صرف اسی وقت اس کی طرف دیکھوں گا۔ اور اپنا دل جس پر نثار کروں گا وہ بھی کوئی ایسی ہی نیک خصائل اور فرشتہ

صفت ہوگی۔ اس کے بھی ہر ہر قدم پر گویا ایسی ہی ایک دنیا آباد ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ بھی گویا دنیا کا تمام رنج و راحت، نیکی بدی تمام اچھا برا ترک کر کے مجھے حاصل کر سکے گی۔

میں آج بھی گو وہی ہوں۔ تو بھی آج صبح نیند کھلتے ہی کسی کی گفتار، کسی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، کسی کی آنکھوں کی جلن نے یاد آتے ہی دل کی خلوتوں میں ایک درد پیدا کر دیا ہے۔ میری سنیاسی جیجی کے ساتھ اس کی کسی پہلو میں ذرا سی بھی مشابہت نہ تھی۔

میں خوب سمجھتا ہوں کہ جو لوگ سنگدل نقاد ہیں وہ میری اس رام کہانی کے اس باب پر پیچ و تاب کھا کر کہہ اٹھیں گے کہ "اتنا بڑھا کر، اتنا مبالغہ کر کے آخر بابو تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ اچھی طرح واضح کر کے تم بے تاب ہوا ٹھے تھے...... یہی نا؟ جس کو دل کے دروازے پر سے ہی جھاڑو مار کر رخصت کر دیتے تھے۔ آج اسے ہی بلا کر گھر میں بسانا چاہتے ہو۔ تم اپنی ان داجیجی کا نام مت لو، کیونکہ تم خواہ کتنی ہی باتیں، خواہ کتنی ہی طرح بنا سنوار کر کیوں نہ کہو ہم لوگ انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ کسی نیک خصال اور فرشتہ صفت سادھوی عورت کا خیال تمہارے دل میں قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے دل کی تمام تر طاقتوں سے تم کبھی حاصل ہی نہیں کر سکے۔ اگر کیا ہوتا تو تم اس باطل اور فریب میں مبتلا نہ ہو سکتے۔"

میری طبیعت صرف اتنی ہی ہے کہ جو میری کمزوری اندر ہی اندر پوشیدہ تھی اس کی میں نے خبر نہ لی۔ آج جب وہ موقعہ پا کر سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اور جب اس نے اپنی دیگر ہم جنس کمزوریوں کو دعوت دے کر یکبارگی اپنے ساتھ ملا لیا۔ تو نا قابل عبور حیرت سے میری آنکھوں میں سے آنسو گر پڑے لیکن 'جا' کہہ کر اسے رخصت کر دینے کا بھی مجھے حوصلہ نہ ہو سکا۔ یہ بھی جانتا ہوں، کہ آج ندامت کے مارے اپنا منہ چھپانے کے لیے میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے مگر دل کا کونا کونا آج کیف سے معمور ہو اٹھا ہے۔ جو نقصان ہونا ہوگا ہوتا ہی رہے گا۔ دل تو اس کا ترک کرنا نہیں چاہتا۔

"بابو صاحب!" راجا کا خادم آ پہنچا۔ میں کھاٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے مؤدبانہ عرض کیا...... "کمار صاحب اور دیگر بہت سے لوگ آپ کی گزشتہ رات کی سرگزشت سننے کے لیے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا...... "انہیں کس طرح معلوم ہوا؟"

سوالات کا جوش کم ہوتے ہی میں نے جواب دینا شروع کیا۔ کمار جی بولے...... "آفرین ہے آپ کی جرأت اور استقلال پر، شری کانت، کتنی رات گئے وہاں پہنچے تھے؟"

"بارہ اور ایک کے درمیان۔"

بوڑھے صاحب بولے...... "خطرناک اماوس، گیارہ بجے کے بعد اماوس شروع ہوئی تھی۔"

چاروں طرف حیرت کا شور قدرے اٹھ کر قدرے سکون ہونے پر کمار جی نے پھر دریافت کیا...... "اس کے بعد کیا دیکھا؟"

میں بولا...... "دور تک پھیلے ہوئے ہڈیوں کے پنجر اور کھوپڑیاں۔"

کمار جی بولے...... "اف کتنا حوصلہ ہے۔ شمشان کے اندر گئے تھے یا باہر کھڑے رہے تھے؟"

میں بولا...... "اندر جا کر ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا تھا۔"

میں ہنس پڑا اور بولا...... "دو ایک بڑے بڑے چمگادڑ سر کے اوپر اڑ کر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔"

اس وقت بوڑھے صاحب نے خود آگے بڑھ کر دریافت کیا...... "اور کچھ نہیں دیکھا؟"

میں نے کہا...... "نہیں"

جواب سن کر خیمے بھر کے لوگ گویا مایوس ہو گئے۔ اور بوڑھے صاحب تو غصے سے مشتعل ہو اٹھے۔ "ایسا کبھی ممکن نہیں۔ آپ گئے ہی نہیں" ان کے غصے کو دیکھ کر میں صرف ہنس دیا۔ کیونکہ بات ہی غصہ ہونے کی تھی۔ کمار جی میرا ہاتھ دبا کر منت آمیز لہجہ میں بولے...... "تمہیں قسم ہے شری کانت، کیا دیکھا سچ سچ کہہ دو۔"

سچ ہی کہتا ہوں کچھ نہیں دیکھا"

"وہاں کتنی دیر ٹھہرے؟"

"تین ایک گھنٹہ۔"

"اچھا اگر دیکھا نہیں تو کیا کچھ سنا بھی نہیں؟"

"سنا"

چشم زدن میں ہی سب کے چہرے جوش سے کھل اٹھے۔ کیا سنا اسے سننے کے لیے کچھ لوگ اور بھی آگے سرک آئے تو میں نے کہنا شروع کیا کہ کس طرح راہ کے اوپر رات کا ایک پرندہ باپ کہہ کر اڑ گیا۔ کس طرح بچے کی سی آواز میں کسی پرندے کے بچے نے سیمر کے درخت پر روں روں کر کے رونا شروع کر دیا کس طرح یکا یک آندھی اٹھی۔ اور مردہ انسانوں کی کھوپڑیاں لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگیں اور سب سے آخر کس طرح گویا کوئی میرے پیچھے کھڑا ہو کر لگا تار برف کی مانند ٹھنڈی سانس داہنے کان میں چھوڑنے لگا۔ میرا بیان ختم ہو گیا۔ مگر کافی دیر تک کسی کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ مکمل سناٹا

تھا۔ انجام کار وہ بوڑھے صاحب ایک آہ بھر کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ بول اٹھے۔

''بابو جی آپ سچ مچ ہی برہمن کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے کل اپنی جان سلامت لے کر واپس لوٹ آئے، ورنہ اگر اور کوئی ہوتا تو زندہ نہ آتا۔ لیکن آج سے اس بوڑھے کی قسم ہے بابو جی! پھر کبھی ایسی غلطی نہ کیجئے گا۔ آپ کے ماں باپ کے چرنوں میں میرے ہزار پرنام محض ان کی نیک اعمالی سے آپ بچ گئے''۔ یہ کہہ کر اس نے جھونک میں آ کر فوراً میرے پاؤں چھو لئے۔

پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ یہ شخص بات کہنا خوب جانتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے کہنا شروع کیا۔ آنکھوں کی پتلیاں اور بھنویں کبھی سکوڑ اور کبھی پھیلا کر کبھی بجھا کر اور کبھی روشن کر کے اس نے پرندے کے رونے سے شروع کر کے کان پر ٹھنڈی سانس چھوڑنے تک اس خوبی سے تشریح کی کہ دن دہاڑے اتنے لوگوں کی موجودگی میں میرے سر کے بال کانٹوں کی مانند کھڑے ہو گئے۔ کل صبح کی طرح پیاری آج بھی کب چپ چاپ سرک کر قریب آ بیٹھی تھی۔ اس پر میری توجہ ہی نہ گئی۔ یکایک آہ بھرنے کی آواز سے چونک کر جونہی میں نے اپنی گردن گھمائی تو دیکھا میری بیٹھ کے عین پیچھے بیٹھی ہوئی وہ ٹکٹکی لگائے بولنے والے کے منہ کی طرف دیکھ رہی ہے اور اس کے دونوں چکنے اور سرخ رخساروں پر بکھرے ہوئے آنسوؤں کی دو لکیریں خشک ہو کر پھوٹ اٹھی ہی کب اور کس لیے اس کی آنکھوں کا وہ پانی بہہ نکلا تھا شاید وہ بالکل ہی نہ جان سکی ورنہ اسے ضرور پونچھ ڈالتی۔ مگر آنسوؤں سے تر اس چہرے پر ایک نگاہ پڑتے ہی آن واحد میں میرے دل میں ایک آگ مشتعل ہو اٹھی۔ بات ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمار کو سلام کر کے اور ان کی اجازت پا کر آہستہ آہستہ باہر ہو گئی۔

آج صبح ہی میرے رخصت ہونے کی بات تھی۔ لیکن جسم تندرست نہ تھا۔ اس لیے کمار کا اصرار قبول کر کے میں اس وقت جانے کا پروگرام ملتوی کر کے اپنے خیمے میں واپس لوٹ آیا۔ اتنے دنوں بعد آج پیاری کے رویہ میں میں نے پہلے پہل دوسرا ہی جذبہ دیکھا۔ اتنے دنوں تک اس نے مذاق کیا تھا۔ طعنہ زنی کی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے شوخی و شرارت کے علاوہ جھگڑا کرنے کا ارادہ بھی ظاہر ہوتا رہا تھا۔ یہ سب میں نے محسوس کیا لیکن اس قسم کی ہمدردی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید آپ کو حیرت ہو گی کہ میں افسردہ ہونے کی بجائے الٹا مسرور ہوا تھا۔ کیوں؟ جانتا ہوں۔ اگرچہ نوخیز اور حسین عورتوں کے دلی جذبات کو لے کر دماغ سوزی کرنا میرا پیشہ نہیں اور نہ اس سے پیشتر میں نے کبھی یہ کام کیا ہی ہے لیکن میرے دل میں کئی جنموں کا جو سلسلہ پوشیدہ طور پر قائم ہے اس کی بنا پر نسوانی دل کے رازہائے نہاں سے متاثر ہوا تھا۔ میرا دل اس کو اپنی توہین سمجھنے کی غلطی نہ کر سکا بلکہ فخر محسوس کر کے محظوظ ہوا۔ شاید اسی پوشیدہ سلسلہ کی کسی اندرونی رمز کو سمجھ کر میں نے اپنے شمشان کے سفر کی یہاں تک کی کہانی میں اس بات کا ذکر تک نہیں کیا کہ پیاری نے کل رات مجھے شمشان سے لوٹا لانے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔ اور وہ خود بھی بات ختم ہوتے ہی چپ چاپ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ اس لیے ہے یہ فخر۔ کل رات لوٹ کر اس سے ملاقات کر کے میں نے یہ نہیں کہا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ اسے جس بات کو اکیلے بیٹھ کر سننے کا سب سے پہلے حق تھا۔ اسی کو آج سب سے پیچھے بیٹھ کر ہی اس نے سنا۔ لیکن یہ فخر بھی کچھ عجیب لطف بیز ہوتا ہے...... زندگی میں اس لطف سے پہلی مرتبہ محظوظ ہو کر میں بچے کی طرح خلوت میں بیٹھ گیا اور چکھ چکھ کر اس کا لطف لینے لگا۔

☆☆☆

آج دوپہر کو میں سو جانا چاہتا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے پلکیں بھاری ہو جاتیں لیکن رتن کے آ جانے کی امید ہر بار شانے جھنجھوڑ کر جگا دیتی۔ اسی طرح وقت تو گزر گیا لیکن رتن نہ آیا۔ وہ ضرور آئے گا یہ یقین میرے دل میں اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ جب بستر چھوڑ کر باہر آ کر میں نے دیکھا کہ آفتاب مغرب کی طرف ڈھل چکا ہے تو مجھے دل ہی دل میں یہ یقین ہو گیا کہ جب میں سو رہا تھا تو رتن میرے ہاں آیا تھا اور مجھے محو خواب دیکھ کر واپس لوٹ گیا۔ بدتمیز جاہل! ایک مرتبہ پکار کر تو دیکھ لیا تھا۔ دوپہر کے اس تخلیہ کا وقت فضول ہی چلا گیا۔ یہ سوچ کر میں غصے ہوا تھا۔ لیکن شام کے بعد وہ دوبارہ آئے گا۔ اور مجھ سے ہلکا سا اصرار...... یا لکھا ہوا پرزہ، جو کچھ بھی ہو چپ چاپ دے جائے گا۔ اس میں مجھے ذرا بھی شک نہ تھا۔ لیکن وہ وقت کس طرح کٹے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں۔ سامنے دیکھتے ہوئے کچھ دور بہت سا پانی میری آنکھوں کے سامنے جھلک اٹھا۔ وہ کسی وسیع میدان کا عظیم فخر تھا۔ وہ تالاب تقریباً نصف کوس وسیع ہو گا۔ غرب کی طرف وہ ٹوٹ کر پر ہو گیا تھا۔ اور گھنے جنگل سے ڈھک گیا تھا۔ گاؤں سے دور ہونے کی وجہ سے عورتیں اس کا پانی استعمال نہیں کر سکتی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں سنا تھا کہ یہ تالاب کتنا قدیم ہے اور کس نے بنایا ہے اس کا کسی کو بھی علم نہیں۔ ایک پرانا ٹوٹا گھاٹ تھا۔ اسی پر تنہائی میں جا کر بیٹھ گیا۔ کسی زمانہ میں اس کے چاروں طرف ایک بارونق گاؤں آباد تھا۔ جو نا معلوم کب ہیضہ اور پلیگ سے اجاڑ ہو کر پھر اپنی موجود جگہ میں سرک آیا ہے۔ بے آباد مکانوں کے بہت سے نشان چاروں طرف موجود تھے۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی ترچھی کرنیں آہستہ آہستہ جھک کر تالاب کے سیاہ پانی میں سونے کی آمیزش کر رہی تھیں۔ میں ایک ٹک دیکھتا رہا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ آفتاب غروب ہو گیا۔ تالاب کا سیاہ پانی اور بھی سیاہ ہو گیا۔ قریبی جنگل میں سے دو ایک پیاسے گیدڑ باہر نکل کر ڈرتے ڈرتے پانی پی کر چلے گئے۔ میرے اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور جس وقت کو کاٹنے کے لیے میں وہاں گیا تھا وہ کٹ چکا ہے۔ یہ محسوس کرنے کے باوجود بھی میں

وہاں سے اٹھ نہ سکا...... گویا اس ٹوٹے گھاٹ نے مجھے زبردستی جکڑ لیا۔

دفعتاً خیال آیا کہ جہاں میں پاؤں رکھ کر بیٹھا ہوا ہوں وہاں پاؤں رکھ کر نا معلوم کتنے آدمی آئے ہیں گئے ہیں۔ اسی گھاٹ پر وہ غسل کرتے تھے۔ کپڑے چھانٹتے اور پانی بھرتے تھے۔ اس وقت وہ کہاں کس تالاب سے اپنے یہ تمام روزانہ کام پورے کرتے ہوں گے؟ یہ گاؤں جب زندہ تھا تو یقیناً اس میں بسنے والے لوگ اس وقت یہاں آکر بیٹھتے ہوں گے۔ کتنے ہی گیت گا گا کر اور ہنسی خوشی کی کتنی ہی باتیں کرکے اپنے دن بھر کی تھکان کو دور کرتے تھے۔ اس کے بعد اچانک ایک دن تباہی پلیگ کی شکل اختیار کرکے تمام گاؤں کو نوچ کر لے گئی۔ اس وقت نا معلوم کتنے قریب المرگ انسان پیاس سے بے حال ہو کر یہاں دوڑے آئے ہوں گے۔ اور اسی گھاٹ پر آخری سانس لے کر چلے گئے ہوں گے۔ شاید ان کی پیاسی روح آج بھی یہاں چکر کاٹتی پھرتی ہوگی۔ یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا وہ ہے ہی نہیں؟ آج بھی صبح اس بوڑھے نے کہا تھا...... ''بابو جی، دل میں یہ کبھی مت سوچنا کہ موت کے بعد کچھ بقایا نہیں رہتا...... بے سہارا پریت روحیں ہماری ہی طرح رنج و راحت، بھوک پیاس محسوس کرتی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ویروکرماجیت کی کہانی اور نہ جانے کتنے ہی جادوگر، سادھو، سنیاسیوں کی کہانیاں تفصیل سے کہہ سنائی تھیں۔ اور کہا تھا یہ خیال بھی مت کرنا کہ وقت اور موقعہ ملنے پر وہ نظر نہیں آتیں یا بات نہیں کرسکتیں یا نہیں کرتی ہیں۔ تمہیں اس جگہ پھر کبھی جانے کے لیے میں نہ کہتا۔ لیکن جو لوگ یہ کام کرسکتے ہیں۔ ان لوگوں کو کبھی تکلیف نہیں ہوتی اس بات پر کبھی یقین نہ کرنا۔''

اس وقت صبح کی روشنی میں جن کہانیوں نے محض دفع الوقتی اور ہنسی مذاق کا سامان مہیا کیا تھا۔ اس وقت وہی کہانیاں اس گہری تاریکی میں کچھ اور ہی قسم کی شکلیں اختیار کرکے نظر آئیں۔ دل میں آیا کہ دنیا میں اگر کوئی ظاہری حقیقت ہے تو وہ صرف موت ہی ہے۔ بھلی بری، سکھ دکھ کی یہ حالتیں گویا آتش بازی ہیں۔ جو طرح طرح کے ساز سرانجام کی طرح محض کسی ایک خاص دن جل کر راکھ ہو جانے کے لیے ہی اتنی کوشش اور صفائی کے ساتھ بن کر تیار ہوئی ہیں۔ مابعد موت کا حال اگر کسی طرح سن لیا جاسکے تو اس سے بڑی ایجاد اور کیا ہوسکتی ہے۔ پھر اسے کوئی بھی کہے اور کوئی بھی سنے۔

اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ سے خیالات کا تار ٹوٹ گیا۔ مڑ کر دیکھا ہر سو تاریکی محیط ہے اور کوئی نہیں۔ میں جسم جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گزشتہ رات کو بات یاد کرکے دل ہی دل میں بولا...... ''نہیں اب یہاں اور نہیں بیٹھ سکتا۔ کل دائیں کان پر ٹھنڈی سانس چھوڑ کر گیا تھا آج آکر بائیں کان پر سانس پھینکنا شروع کردے تو کچھ ناممکن نہیں۔''

بیٹھے بیٹھے کتنی دیر ہوگئی تھی اور اب کتنی رات ہے اس بات کا میں اچھی طرح فیصلہ ہی نہ کرسکا۔ معلوم ہوا کہ تقریباً یہ آدھی رات کا عمل ہوگا۔ لیکن ارے یہ کیا؟ چلا جارہا ہوں تو چلا ہی جارہا ہوں۔ اس تنگ سی پگ ڈنڈی کا کہیں اختتام ہی نہیں ہوتا۔ اتنے بے شمار خیموں میں سے ایک دیئے کی روشنی بھی نظر نہیں آتی۔ بہت دیر سے سامنے کانس کا ایک درخت نظر رو کے کھڑا تھا۔ دفعتاً خیال آیا کہ اسے تو جاتی بار دیکھا نہیں تھا۔ راستہ بھول کر کسی اور طرف تو نہیں چل دیا۔ کچھ اور چلنے پر معلوم ہوا کہ وہ کانس کا درخت نہیں ہے بلکہ املی کے کچھ درخت ایک دوسرے سے ملے ہوئے اطراف کو ڈھانپ کر قطار باندھے کھڑے ہیں اور ان ہی کے نیچے سے راستہ گھوم کر غائب ہوگیا تھا۔ یہ مقام اس قدر تاریک تھا کہ اپنا ہاتھ بھی خود اپنے آپ کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ چھاتی دھڑکنے لگی۔ ارے میں کہاں جارہا ہوں؟ آنکھیں اور کان بند کرکے بصد مشکل املی کے ان درختوں کے پار جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے تیرہ تار آسمان، جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے پھیلا ہوا ہے۔ مگر سامنے وہ اونچی سی جگہ کیا ہے۔ ندی کے کنارے کا سرکاری باندھ تو نہیں۔ دونوں پاؤں ٹوٹنے سے لگے پھر بھی انہیں کسی طرح گھسیٹ کر میں اس کے اوپر چڑھ گیا جو سوچا تھا ٹھیک وہی ہوا۔ اس کے عین نیچے ہی وہ مہا شمشان تھا۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ سامنے سے ہو کر نیچے شمشان میں جاکر ناپید ہوگئی۔ اس مرتبہ میں لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ اور اسی ریت اور مٹی پر بے ہوش کی طرح دھم سے بیٹھ گیا۔ اب مجھے ذرا سا بھی شک نہ رہا۔ کہ کوئی مجھے ایک مہا شمشان سے لے کر دوسرے مہا شمشان تک میری راہنمائی کرکے پہنچا گیا ہے۔ جس کے قدموں کی چاپ سن کر اس بھوٹے گھاٹ پر جسم جھاڑ کر میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں کی آواز اتنی دیر بعد اس جگہ سامنے کی طرف فضا میں مل گئی۔

ہر ایک وجہ معلوم کرنے کی ضد انسان کو جس حالت میں ہوتی ہے۔ میں اس حالت سے گزر چکا ہوں۔ اس ہولناک تاریکی سے معمور آدھی رات کے وقت میں اکیلا، راستہ جاننے کے باوجود تالاب کے اس ٹوٹے گھاٹ سے اس مہاشمشان کے پاس کس طرح پہنچ گیا اور کس کے پاؤں کی وہ آواز اس جگہ سے بلاتی ہوئی اور اشارہ کرتی ہوئی کچھ ہی دیر میں غائب ہو گئی۔ ان سب گتھیوں کو سلجھانے کے قابل میری عقل بھی نہیں یہ راز آج بھی میرے لیے اسی طرح معمہ ہے۔ لیکن اس لیے بھوت پریت کا قائل ہونا بھی صحیح معنوں میں قائل ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ میرا چشم دید واقعہ ہے...... ہمارے گاؤں میں ایک پاگل تھا۔ وہ دن کے وقت گھر گھر گھوم کر، بھیک مانگ کر راستے کے باغیچے کی جھاڑیوں کے سایہ میں گھومتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر بے شمار آدمیوں کی گھگھی بندھ گئی۔ اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد نہ تھا۔ تاہم یہ اس کا اندھیری رات کا معمول تھا۔ انسان کو خوف زدہ کرنے کیلئے وہ اور بھی کئی قسم کے عجیب وغریب طریقے اختیار کیا کرتا تھا۔ خشک لکڑیوں کے گٹھے کو کسی درخت کی شاخ سے باندھ کر اس میں آگ لگا دیتا تھا۔ منہ پر کالی سیاہی کا لیپ کر کے وشالکشی دیوی کے مندر میں کافی تکلیف برداشت کرتے ہوئے کھڑا رہتا اور اٹھا بیٹھا کرتا۔ گہری رات کے وقت گھر کے پچھواڑے بیٹھ کر ناک کے سر میں کسانوں کے نام لے لے کر پکارا کرتا...... لیکن پھر بھی کوئی اسے کسی دن نہ پکڑ سکا۔ دن کے وقت اس کا چال چلن اس کا مزاج اور رویہ وغیرہ دیکھ کر کسی کو بھی اس پر شک نہ ہوتا۔ اور یہ صرف ہمارے ہی گاؤں میں نہیں، گرد و نواح کے آٹھ دس گاؤں میں اسی طرح کرتا پھرتا تھا۔ مرتے وقت وہ اپنی بدذاتی خود ہی تسلیم کر گیا۔ اور اس کے مرنے کے بعد بھوت کی وہ کارستانیاں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔ اس میدان میں بھی شاید ویسا ہی کچھ تھا۔ شاید نہ بھی ہو لیکن جانے دو اس بات کو۔

ہاں کہہ رہا تھا کہ مٹی اور ریت سے بھرے ہوئے باندھ کے اوپر جب میں حواس باختہ سا ہو کر بیٹھ گیا تھا تو پاؤں کی صرف دو ہلکی ہلکی آوازیں اندر جا کر آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ خیال آیا کہ اس

نے صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے..... "رام رام، تو نے یہ کیا کیا؟ تجھے اتنی دور تک راستہ بتا کر لے آیا تو کیا وہاں بیٹھ جانے کے لیے؟ آ آ۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں کے اندر چلا آ۔ اس طرح ناپاک اچھوتوں کی طرح صحن کی تنہائی میں نہ بیٹھ۔ ہم سب کے درمیان بیٹھ"۔ یہ بات میں نے کانوں سے سنی تھی یا دل میں محسوس کی تھی۔ یہ تو اب یاد نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے جو ہوش باقی تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوش کو زبردستی پکڑ رکھنے سے وہ اسی طرح بچا رہتا ہے۔ بالکل ہی جاتا نہیں رہتا۔ یہ میرا تجربہ ہے اس لیے اگرچہ میری آنکھیں کھلی رہیں، لیکن وہ گویا عالم رویا کا سا دیکھنا تھا وہ نہ تو خواب کا عالم تھا نہ بیداری کا۔ اس میں خواب کا سکون بھی نہیں رہتا اور بیداری کا شور وغل بھی نہیں ہوتا۔

تاہم اس بات کو نہ بھولا کہ رات بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ اور مجھے واپس اپنے خیمہ میں لوٹنا ہے۔ اس کے لیے کم از کم ایک مرتبہ کوشش تو کرنی چاہئے۔ پھر خیال آیا یہ سب فضول ہے۔ میں یہاں اپنی حسب مرضی تو آیا نہیں ہوں۔ آنے کا تصور تک بھی نہیں کیا۔ اس لیے جو مجھے اس پرخطر راستہ میں میری راہنمائی کرتا ہوا لے آیا اس کا کچھ خاص مقصد ہے۔ وہ مجھے یونہی لوٹ کر جانے نہ دے گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اپنی مرضی سے ان کے ہاتھ سے چھٹکارا نہیں ملتا خواہ کتنا ہی زور کرو۔ خواہ کسی راستے سے نکلنے کی کوشش لیکن سب راستے گورکھ دھندے کی طرح گھما پھرا کر وہ اپنی پرانی جگہ ہی لا کر حاضر کر دیتے ہیں۔

اس لیے بے قرار ہو کر چھپٹانا مکمل طور پر غیر ضروری سمجھ کر اور بلا حیل وحرکت خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ تو جس پر میری اچانک نظر پڑی وہ مجھے کسی دن بھی نہیں بھولی!

رات کو بھی علیحدہ ہستی ہوا کرتی ہے۔ اور اس کو کرہ ارض، اس کی سردی گرمی، پہاڑ پربت وغیرہ جس قدر بھی نظر آنے والی اشیاء ہیں ان سب سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آئی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ لامحدود نیلگوں آسمان کے نیچے تمام زمین پر اپنا اقتدار جمائے سنجیدہ رات آنکھ موند کر کسی کے تصور میں محو ہے۔ اور تمام متحرک دنیا منہ بند کئے سانس روکے نہایت احتیاط سے خاموش ہو کر اس مکمل سکون کی حفاظت کر رہی ہے یکایک آنکھوں کے سامنے حسن کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دل میں خیال آیا کہ کس بے وقوف نے اس خیال کی اشاعت کی ہے کہ محض روشنی کی ہی شکل ہوا کرتی ہے تاریکی کی نہیں۔ عجیب حیرت ہے کہ اتنے بڑے غلط خیال کو دنیا نے چپ چاپ کس طرح تسلیم کر لیا۔ یہ تو عرش سے لے کر فرش تک کی ہر شے کو معمور کر کے نظر کے اندر باہر سے تاریکی کا طوفان بڑھا آ رہا ہے۔ واہ واہ حسن و جمال کا یہ سرچشمہ تو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کائنات میں جو جتنا سنجیدہ، جتنا بے ہوش اور جتنا ہی وسیع اور لامحدود ہے وہ اسی قدر زیادہ تاریک ہے۔ بحر ناپیدا کنار سا ہی

کی مانند کالا ہے۔ بے پایاں اور لامحدود آسمان بھی خطرناک طور پر تاریک ہے۔ تمام دنیاؤں کی پشت و پناہ، نور کا بھی نور، حرکت کی بھی حرکت، زندگی کی بھی زندگی، مکمل حسن کا خالق بھی انسان کی نگاہ میں ہولناک تاریک ہے۔ لیکن کیا اس کا باعث حسن کی کمی ہے؟ جس کو سمجھتے نہیں، جس کو جانتے ہیں، جس کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا، وہ اتنا ہی زیادہ تاریک ہے۔ موت اسی لیے انسان کی نظروں میں کالی ہے۔ اور اس لیے عقبیٰ کی منزل اس قدر زبردست تاریکی میں مستور ہے۔ اسی لیے رادھا کی دونوں آنکھوں میں سما کر جس صورت نے پریم کے طوفان میں دنیا کو بہا دیا وہ گھنشام (بادلوں کی مانند سیاہ فام) ہے۔ میں نے کبھی یہ بات سوچی نہیں۔ کسی دن بھی اس راہ پر گامزن نہیں ہوا پھر بھی نامعلوم کسی غیبی طاقت سے خوف و خطر سے بھرے اس مہاشمشان کے نزدیک بیٹھ کر، اپنی بے بس تنہائی کو بھول کر آج میرے دل میں بلاوجہ ہی حسن و جمال کی مسرت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اور بالکل یکایک یہ بات جی میں آئی کہ سیاہی میں اتنا حسن ہے یہ تو پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔ پھر تو شاید موت بھی کالی ہونے کی وجہ سے ہیبت ناک نہیں ہے۔ ایک دن جب وہ مجھے لینے آئے گی تو شاید اس کی اس قسم کی دلفریب شکل و صورت کو دیکھ میری دونوں آنکھیں بیخودی میں بند ہو جائیں گی اور اگر وہ دن آج ہی آ گیا ہو تو اے میرے کالے، او میری قریبی پاؤں کی آہٹ، اے مجھے تمام دکھوں سے نجات دلانے والے لامحدود جلوہ گر ہو جاؤ۔ میں تمہاری اس تیرگی سے محصور سنسان موت کے مندر کے دروازے پر تمہیں بے خوف ہو کر حاصل کر کے کمال مسرت سے تمہارے نقش پا پر چلتا ہوں۔ اچانک میرے دل میں یہ بات آئی کہ پھر کس لیے اس کی خاموش دعوت کو نظر انداز کر کے اور، کسمپرسی کے عالم میں یہاں باہر کس غرض سے بیٹھا ہوں؟ ایک مرتبہ اندر جا کر کیوں نہ بیٹھوں؟

نیچے اتر کر میں شمشان کے عین بیچوں بیچ اچھی طرح جم کر بیٹھ گیا۔ کتنی دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کا مجھے اس وقت تک ہوش نہ تھا۔ ہوش آنے پر دیکھا کہ پہلے کی طرح تاریکی اب نہیں ہے۔ آسمان کا ایک حصہ کچھ صاف ہو گیا ہے۔ اور اس کے پاس ہی شکر تارا چمک رہا ہے۔ کچھ دبی ہوئی سی بات چیت کا شور میرے کانوں میں پہنچا۔ اچھی طرح غور کر کے دیکھا کہ دور فاصلے پر سمیر کے درخت کے آڑ میں، باندھ کے اوپر سے ہو کر کچھ لوگ چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کی دو چار لالٹینوں کی روشنی بھی آس پاس ادھر ادھر پھیل رہی ہے۔ دوبارہ پل پر چڑھ کر اس روشنی ہی میں میں نے دیکھا کہ دو بیل گاڑیوں کے آگے پیچھے کچھ لوگ اسی طرف بڑھے آ رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ کچھ لوگ اس راستہ ہو کر اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔

مجھے اس وقت تجویز سوجھ گئی کہ راستہ چھوڑ کر میرا دور کھسک جانا ضروری ہے کیونکہ اجنبیوں کا

گروہ خواہ کتنا ہی عقلمند اور دلاور کیوں نہ ہو۔ اس تاریک رات میں اس قسم کی جگہ میں مجھے تنہا بھوت کی طرح کھڑا دیکھ کر خواہ اور کچھ نہ کرے لیکن ایک خوفناک چیخ و پکار ضرور ہی مچاوے گا اس میں کوئی شک نہیں۔

☆☆☆

میں لوٹ کر اپنی پرانی جگہ پر جا کھڑا ہوا اور کچھ ہی دیر بعد چٹائی لگی ہوئی بیل گاڑیاں پانچ چھ آدمی میری طرف دیکھ کر لمحہ بھر کے استقلال سے کھڑے رہے اور زیادہ سے زیادہ آہستہ آواز میں کچھ کہہ سن کر آگے بڑھ گئے۔ اور تھوڑی سی ہی دیر میں وہ تمام مجمع باندھ کر کنارے کی ایک جھاڑی کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ یہ اندازہ کر کے رات اب زیادہ نہیں رہی جب میں لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ عین اسی وقت ان درختوں کی اوٹ میں سے خوب بلند آواز میرے کانوں میں آئی..... ''شری کانت بابو''۔

میں نے جواب دیا..... ''کون ہے، رتن؟''

''ہاں بابو، میں ہی ہوں۔ ذرا آگے بڑھ کر آیئے۔'' جلدی سے باندھ کے اوپر چڑھ کر پکارا۔ ''رتن تم لوگ کیا گھر جا رہے ہو؟''

رتن نے جواب دیا۔ ''ہاں گھر جا رہے ہیں..... ماں گاڑی میں ہیں۔''

میرے قریب پہنچتے ہی پیاری نے پردے میں سے منہ باہر نکال کر کہا ''دربان کی بات سن کر میں سمجھ گئی تھی کہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ گاڑی پر آؤ کچھ بات کرنی ہے۔''

میں نے اور قریب آ کر پوچھا..... ''کیا بات ہے؟''

''کہتی ہوں اوپر آ جاؤ۔''

''نہیں ایسا نہیں کر سکتا۔ وقت نہیں ہے۔ صبح ہونے سے پیشتر ہی مجھے اپنے خیمہ میں واپس پہنچنا ہے۔''

پیاری نے ہاتھ بڑھا کر میرا داہنا ہاتھ پکڑ لیا اور پر اصرار لہجہ میں کہا..... ''نوکر چاکروں کی موجودگی میں چھینا جھپٹی مت کرو۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ چپ چاپ اوپر چڑھ آؤ۔''

اس کی خلاف معمول بیقراری سے قدرے متاثر ہو کر میں بیخودی میں گاڑی پر چڑھ گیا.....

''پیاری نے گاڑی ہانکنے کا حکم دے کر کہا..... ''آج پھر یہاں کیوں آئے؟''

میں نے سچ سچ بات کہہ دی۔ ''نامعلوم کیوں چلا آیا۔''

پیاری نے اب تک بھی میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا بولی۔ ''تمہیں معلوم نہیں، اچھا ٹھیک لیکن تم چھپ کر کیوں آئے تھے؟''

میں بولا..... ''یہ درست ہے کہ میرے یہاں آنے کی بات کسی کو معلوم نہیں لیکن چھپ کر میں

نہیں آیا ہوں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"نہیں۔"

"اس کا مطلب؟"

"مطلب اگر کھول کر بتا دوں گا تو یقین کرو گی؟ نہ تو میں چھپ کر یہاں آیا ہوں اور نہ ہی میری خواہش ہی آنے کی تھی۔"

پیاری نے طنزیہ انداز میں کہا...... "تو پھر تمہیں خیمہ سے کوئی بھوت اڑا لایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہی کہنا چاہتے ہو، کیوں؟"

"نہیں یہ تو کہنا نہیں چاہتا۔ اڑا کر کوئی نہیں لایا، خود بخود ہی اپنے پاؤں سے چل کر آیا ہوں۔ یہ بھی سچ مچ ہے مگر کیوں آیا، کب آیا یہ نہیں کہہ سکتا۔"

پیاری خاموش ہو رہی ہے۔ میں بولا...... "راج لکشمی میں نہیں جانتا تم یقین کر سکو گی یا نہیں۔ لیکن درحقیقت جو کچھ ہوا ہے وہ ایک حیرت افزا معاملہ ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے تمام واقعہ الف سے ی تک سنا دیا۔

سنتے سنتے میرے ہاتھ میں رکھا ہوا اس کا ہاتھ کئی مرتبہ لرز اٹھا۔ لیکن اس نے ایک بھی بات نہ کہی۔ پردہ اٹھا ہوا تھا۔ پیچھے نظر ڈال کر دیکھا۔ مطلع صاف ہو چکا تھا بولا...... "اب میں جاؤں؟"

پیاری نے محویت کے عالم میں کہا...... "نہیں۔"

"نہیں کیسے؟ اس طرح چلے جانے کا مطلب کیا ہوگا؟ یہ جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں...... سب جانتی ہوں۔ مگر یہ لوگ تمہارے نگران یا سرپرست تو نہیں ہیں۔ جو محض اپنے فخر کے لیے جان دے دیں گے۔" اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ چھوڑ کر پاؤں پکڑ لیے۔ اور بھرائے لہجہ میں بولی...... "کانت دادا، وہاں لوٹ کر جاؤ گے تو زندہ نہ بچو گے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں مگر وہاں بھی واپس لوٹنے نہ دوں گی۔ تمہارا ٹکٹ خرید دیتی ہوں تم گھر لوٹ جاؤ۔ وہاں ایک گھڑی بھر کے لیے بھی مت ٹھہرو۔"

میں نے کہا...... "میرے کپڑے، بستر وغیرہ جو وہاں پڑے ہیں۔"

پیاری بولی...... "پڑے رہنے دو۔ ان کی مرضی ہوگی تو بھیج دیں گے ورنہ جانے دو۔ ان کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا...... "ان کی قیمت زیادہ نہیں ہے یہ سچ ہے لیکن جو میری جھوٹی بدنامی ہوگی اس

کی قیمت تو کم نہیں ہے۔"

پیاری میرے پاؤں چھوڑ کر خاموش ہو رہی۔ گاڑی اس وقت موڑ پر پھری جس سے میرے پیچھے کا منظر میرے سامنے آ گیا۔ یکایک یاد آیا کہ مقابل کے اس مشرقی آسمان کے ساتھ اس چہرے کی ایک مشابہت ہے۔ دونوں کے ہی اندر آگ کا ایک عظیم گولا تاریکی پھاڑ کر آ رہا ہے۔ اسی کا احساس مجھے ہوا۔ میں نے کہا...... "چپ کیوں ہو گئی ہو؟"

پیاری ایک روکھی ہنسی ہنس کر بولی...... "تم کیا جانو کانت بابو! کہ جس قلم سے زندگی بھر محض جعلی خط لکھتی رہی ہوں۔ اسی قلم دان سے آج دان پتر (وصیت نامہ) لکھنے کے لیے ہاتھ نہیں چلتا۔ جاتے ہو؟ اچھا جاؤ لیکن وعدہ کرو کہ آج بارہ بجے سے پیشتر ہی وہاں سے چل دو گے۔"

"اچھا وعدہ کرتا ہوں۔"

"کسی کے بے حد اصرار سے آج کی رات وہاں بسر نہ کرو گے، بولو؟"

"نہیں نہیں بسر کروں گا۔"

پیاری نے اپنی انگوٹھی اتار کر میرے پاؤں پر رکھ دی۔ گلے میں کپڑا ڈال کر پرنام کیا اور قدموں کی خاک اپنے سر پر لے کر اس انگوٹھی کو میری جیب میں ڈال دیا۔ بولی "تو جاؤ، میرا خیال ہے کہ ڈیرہ ایک کوس سے زیادہ فاصلہ تمہیں طے نہ کرنا ہوگا۔"

بیل گاڑی سے اتر پڑا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی۔

پیاری نے التجا آمیز لہجہ میں کہا...... "میری ایک اور بات بھی تمہیں رکھنی پڑے گی۔ گھر پہنچتے ہی مجھے ایک خط لکھنا ہوگا۔"

میں منظور کر کے چل دیا۔ ایک دفعہ بھی لوٹ کر پیچھے کی طرف نہ دیکھا کہ وہ لوگ کھڑے ہیں یا آگے چل دیئے ہیں۔ لیکن کافی دور تک محسوس کرتا رہا کہ ان دو آنکھوں کی پرنم اور درد بھری نگاہ میری پشت پر بار بار پچھاڑ کھا کھا کر گر رہی ہے۔

ڈیرہ پر پہنچتے ہی تقریباً آٹھ بج گئے۔ راہ کے کنارے پیاری کے ٹوٹے ہوئے خیمے کی بکھری ہوئی غیر ضروری اشیاء پر میری نگاہ پڑتے ہی ایک بیکار تاسف سینے میں ہاہا کار اٹھا۔ منہ پھیر کر جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے اپنے خیمے میں داخل ہوا۔

پرشوتم نے پوچھا...... "کیا آپ تڑکے ہی گھومنے کے لیے باہر چلے گئے تھے؟"

ہاں نہ کسی طرح کا جواب دیئے بغیر ہی میں آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ رہا۔

پیاری سے جو وعدہ کیا تھا اس کی میں نے پوری پوری حفاظت کی، گھر لوٹتے ہی میں نے یہ اطلاع دے کر اسے ایک خط لکھ دیا۔ جواب بھی جلد ہی آ گیا۔ میں ایک بات پر متواتر خیال کر رہا تھا کہ کسی بھی دن پیاری نے مجھے اپنے پٹنہ کے مکان پر آنے کے لیے زور ڈالنا تو دور رہا، معمولی طور پر زبانی دعوت بھی نہ دی۔ اس خط میں بھی اس کا اشارہ تک نہ تھا۔ صرف اختتام پر ایک التجا تھی۔ جس کو آج بھی میں نہیں بھولا ہوں...... ''سکھ کے دنوں میں نہیں تو دکھ کے دنوں میں مجھے نہ بھولئے یہی آپ سے میری درخواست ہے۔''

دن کٹنے لگے۔ پیاری کی یاد دھندلی ہو کر تقریباً معدوم ہو گئی۔ لیکن ایک حیرت افزا بات گاہے گاہے نظر آنے لگی۔ کہ اب کی دفعہ شکار سے واپس لوٹنے کے بعد میرا دل کچھ ان منا سا رہنے لگا۔ گویا کسی خلا کا احساس، دبی ہوئی سردی کی مانند جسم کے عضو عضو میں سرایت کر گیا ہے۔ بستر پر جاتے ہی اس کی کسک معلوم ہوتی ہے۔

یاد آتا ہے کہ وہ ہولی کی رات تھی۔ پیشانی پر سے عبیر کا رنگ صابن سے دھو کر صاف نہیں کیا تھا۔ تھکان سے چور جسم کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ پاس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے سامنے کے پیپل کے پتوں کی پھانکوں میں سے آسمان میں پھیلنے والی چاندنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بس اتنا ہی یاد آیا ہے لیکن کیوں دروازہ کھول کر سیدھا سٹیشن کی طرف چل دیا اور پٹنہ کا ٹکٹ لے کر گاڑی پر بیٹھ گیا۔ یہ یاد نہیں آتا۔ رات گزر گئی لیکن صبح ہوتے ہی جونہی میں نے سنا، باڑھ، سٹیشن ہے اور پٹنہ آنے میں زیادہ دیر نہیں تو یکا یک وہیں اتر پڑا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو گھبرانے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ ایک دونی اور دس پیسے اس وقت بھی موجود تھے۔ خوش ہو کر دوکان کی تلاش میں سٹیشن سے باہر نکلا۔ دوکان مل گئی۔ چڑوا، دہی اور شکر کو ملا کر خوب لذیذ کھانا کھانے سے تقریباً آدھا خرچ ہو گیا۔ ہو جانے دو۔ زندگی میں اس طرح کتنا ہی خرچ ہوا کرتا ہے۔ اس کے لیے رنج کرنا بزدلی ہے۔

گاؤں میں گھومنے کے لیے باہر ہوا۔ گھنٹہ بھر بھی نہ گھوما تھا کہ محسوس ہوا کہ اس گاؤں کا دہی اور چڑوا جس حد تک مفید ہے اسی حد تک پینے کا پانی نقصان دہ ہے۔ میری اتنی ثقیل غذا کو اتنے تھوڑے عرصہ میں اس طرح ہضم کر کے تباہ کر دیا کہ ایسا معلوم ہونے لگا گویا دس بیس دن سے اناج کا ایک دانہ بھی منہ میں نہیں پڑا ہے۔ ایسی خراب جگہ میں ٹھہرنا لمحہ بھر کے لیے بھی مناسب نہیں ہے یہ سوچ کر نقل مکانی کا تصور کر ہی رہا تھا کہ دیکھتا ہوں۔ قریب ہی آم کے ایک باغیچے کے اندر سے دھواں نکل رہا ہے۔

میں قیافہ شناس تھا۔ دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے یقین کا اندازہ کر لیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آگ کی وجہ کا اندازہ کرتے بھی مجھے دیر نہ لگی۔ اس لیے سیدھا اسی طرف چل دیا۔ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ پانی یہاں کا بہت خراب ہے۔

☆☆☆

واہ یہی تو چاہئے۔ سچے سنیاسی کا آشرم مل گیا۔ بڑی بھاری دھونی کے اوپر لوٹے میں چائے کے لیے پانی چڑھا ہے۔ بابا، نیم موندی آنکھوں سے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کے ارد گرد گانجے کا سامان رکھا ہے۔ ایک سنیاسی بچہ بکری دوہ رہا ہے۔ خدمت کے لیے، چائے، چاہئے۔ دو اونٹ، دو ٹٹو اور ایک بچھڑے والی گائے پاس پاس درختوں کی شاخوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا خیمہ ہے۔ ٹھوک کر دیکھا تو اندر میری ہی عمر کا ایک چیلا دونوں پاؤں کے درمیان پتھر کا کونڈا دبائے نیم کے سونٹے سے بھنگ تیار کر رہا ہے۔

دیکھ کر میں بھگتی سے شرابور ہو گیا۔ اور آن کی آن میں بابا جی کے قدموں میں لوٹ گیا۔ ان کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگا کر اور ہاتھ باندھ کر دل ہی دل میں کہا...... کیسی مہر ہے بھگوان تمہاری۔ کیسی جگہ مجھے لے آئے۔ چولہے میں جائے پیاری...... راہ نجات کے اس صدر دروازے کو چھوڑ کر تل کے آدھے حصے کے برابر بھی اگر اور کہیں جاؤں تو میرے لیے دائمی نرگ میں بھی جگہ نہ رہے۔

سادھو جی بولے...... ''کیوں بیٹا؟''

میں نے عرض کیا...... ''میں تارک دنیا، متلاشی نجات، بدنصیب بندہ ہوں۔ مجھ پر کرم فرما اور اپنے قدموں کی خدمت کا حق دیجئے۔''

سادھو جی نے شیریں ہنسی ہنس کر دو دفعہ سر ہلا کر مختصراً کہا...... بیٹا، گھر لوٹ جا، یہ راستہ نہایت دشوار گزار ہے۔''

میں نے التجا آمیزہ لہجہ میں فوراً جواب دیا۔'' بابا، مہا بھارت میں مرقوم ہے، جگائی اور

مادھائی دوسیہ کاروشٹ منی کے پاؤں پکڑ کر سورگ میں چلے گئے تھے۔تو کیا میں آپ کے قدم پکڑ کر نجات بھی حاصل نہ کروں گا۔یقیناً حاصل کروں گا۔"

سادھو جی مسرور ہو کر بولے......"بات تیرا سچا ہے۔اچھا بیٹا، رام جی کی کٹھوتی۔" جو دودھ دوہ رہا تھا۔اس نے آ کر چائے تیار کر کے بابا کو دی۔اس کی خدمت ہوگئی۔ہم لوگوں نے پرساد پایا۔

بھنگ تیار ہو رہی تھی شام کے لیے۔لیکن ابھی شام ہونے میں دیر تھی۔اس لیے دوسری مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے 'بابا' نے اپنے چیلے کو گانجے کی چلم اشارہ سے دکھا دی اور اسے بھرنے میں دیر نہ ہو۔اس کے لیے خاص ہدایت کر دی۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔روشن ضمیر بابا نے مجھ سے مطمئن ہو کر کہا......"ہاں بیٹا، تم میں بے شمار خوبیاں ہیں۔تم میرا چیلا بننے کے اہل ہو۔"

میں نے کمال خوشی کے ساتھ اور ایک دفعہ بابا کے پاؤں کی خاک سر پر لگا لی۔

دوسرے دن صبح میں نہا کر آیا۔دیکھا کہ گورو جی کی عنایت سے کمی کسی شے کی نہیں۔بڑے چیلے نے نیا گیروے کپڑوں کا سوٹ، دس جوڑی رودراکش کی مالائیں اور ایک چوڑا پیتل کے کڑے باہر نکال دیئے۔جہاں جو شے پہننے کی تھی اسے اس جگہ آراستہ کر کے دھونی کی تھوڑی سی راکھ منہ اور سر پر مل لی۔آنکھیں میچ کر میں نے کہا......"بابا جی، آئینہ وغیرہ کچھ ہے۔ایک دفعہ چہرہ دیکھنے کی زبردست خواہش ہو رہی ہے۔"میں نے دیکھا کہ ان کی طبیعت میں کیف موجود ہے تاہم انہوں نے کچھ سنجیدہ ہو کر کہا۔

"ہے ایک ٹھو۔"

"تو پھر چھپا کر لے نہ آیئے ایک دفعہ۔"

دو منٹ کے بعد آئینہ لے کر میں ایک درخت کی آڑ میں چلا گیا۔پچھم کے نائی جس قسم کا آئینہ ہاتھ میں دے کر حجامت کیا کرتے ہیں۔اسی طرح کی یہ چھوٹی ٹین میں مڑھی ہوئی آرسی تھی۔خیر جو بھی میں نے دیکھا کہ وہ خاص تردد کیے جانے اور ہمیشہ استعمال میں آنے کی وجہ سے صاف ستھری تھی۔چہرہ دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہا گیا۔کون کہہ سکتا ہے کہ میں وہی شری کانت ہوں جو کچھ ہی دن پیشتر راجکمار کی مجلس میں بیٹھ کر بائی جی کا گانا سنا کرتا تھا۔خیر جانے دو۔

گھنٹہ بھر بعد گورو مہاراج کے روبرو دکھشنا کے لیے لایا گیا۔مہاراج میرا چہرہ دیکھ کر نہایت ملائمت کے ساتھ بولے......"بیٹا ایک آدھ مہینہ ٹھہر جاؤ۔"

میں آہستہ سے"بہت اچھا" کہہ کر اور ان کی خاک پا لے کر ہاتھ باندھ کر اور عقیدت سے

معمور ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

آج باتوں ہی باتوں میں انہوں نے روحانیت کے متعلق کئی لیکچر دیئے۔اس کی مشکلوں کے متعلق، ریاضت شاقہ اور سنجیدہ ضبط کے متعلق آج کل کے بھانڈ اور پاکھنڈی لوگ کس طرح اسے بدنام کرتے پھر رہے ہیں۔اس کا بالتفصیل ذکر اور بھگوان کے چرنوں میں لو لگانے کے لیے کیا کیا کرنا ضروری ہے۔اس سلسلہ میں ایک خاص درخت کی خشک لکڑی کے دھوئیں کو منہ کے ذریعے کھانے اور ناک کے ذریعے نکالنے کا کیسا حیرت انگیز انجام ہوتا ہے وغیرہ سب انہوں نے اچھی طرح ذہن نشین کر دیا۔اور اس سلسلہ میں میری حالت نہایت امید افزا ہے۔یہ بات اشارے سے ظاہر کر کے انہوں نے میرے جوش کو خوب بڑھایا۔اس طرح اس دن نجات کی منزل بیشمار سربستہ راز سمجھ کر میں گورو مہاراج کے تیسرے چیلے کی شکل میں بحال ہو گیا۔

ریاضت شاقہ اور سنجیدہ ضبط کے لیے مہاراج کی ہدایت کے مطابق ہم لوگوں کی خدمت کا پروگرام سخت قسم کا تھا۔جیسا کہ اس کا ذائقہ تھا انجام بھی اس کا ویسا ہی تھا۔چائے، روٹی، گھی، دودھ، دہی، چڑا شکر وغیرہ نہایت اچھی غذا اور انہیں ہضم کرنے کے وسائل۔بھگوان کے چرنوں سے بھی ہماری لو لگی رہے اس طرح بھی ہم لوگوں کی ذرا سی بھی لاپرواہی نہ تھی۔اس کے نتیجہ کے طور پر میری خشک ڈالیوں میں پھل لگ گئے۔اور کچھ تو ند بڑھنے کے آثار بھی دکھائی دینے لگے۔

ایک کام تھا۔بھکشا کے لیے باہر جانا۔سنیاسی کے لیے یہ کام مقدم نہ ہوتے ہوئے بھی نہایت اہم کام تھا۔کیونکہ اس غذا کے ساتھ اس کا گہرا تعلق تھا۔مگر مہاراج خود بھی یہ نہیں کرتے تھے۔ان کے چیلے ہی باری باری یہ کیا کرتے تھے۔سنیاسی کے دیگر فرائض میں تو ان کے دیگر چیلوں کو بھی جلد پار کر گیا۔لیکن محض اس کام میں متواتر لنگڑاتا رہا۔اس کام کو کسی بھی آسان اور خواہش کے مطابق نہ بنا سکا۔تاہم ایک آسانی یہ بھی تھی کہ ہندوستانیوں کا علاقہ تھا۔میں نیک و بد کی بات نہیں کہتا۔میں صرف یہی کہتا ہوں کہ بنگال کی طرح وہاں کی عورتیں بابا ہاتھ جوڑتی ہوں اور ایک گھر آگے جا کے دیکھو، کہہ کر ہدایت نہیں کرتیں اور مرد بھی، نوکری نہ کر کے تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ یہ کیفیت طلب نہیں کرتے۔امیر، غریب بلاکسی امتیاز کے ہر ایک، ہر گھر سے بھیک دیتے ہیں۔کوئی محروم نہیں جاتا۔اسی طرح دن گذرنے لگے۔پندرہ دن تو اس آم کے باغیچے میں ہی کٹ گئے۔دن کے وقت تو کوئی آفت مصیبت نہ تھی۔مگر رات کو مچھروں کے کاٹنے کی جلن سے دل چاہتا تھا کہ بھاڑ میں جائے نجات کی خواہش۔اگر جسم کے چمڑے کو کچھ اور موٹا نہ کیا جائے گا تو اب جان نہ بچے گی۔دیگر کئی معاملات میں بنگالی لوگ خواہ کتنے بھی پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔لیکن بنگالی چمڑے کی نسبت ہندوستانی چمڑا اس سلسلہ میں سنیاسی کے لیے بہت زیادہ

مناسب ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ اس دن صبح نہا کر کھانا حاصل کرنے کی کوشش میں باہر جا ہی رہا تھا کہ گورو مہاراج نے بلا کر کہا۔

بھاردواج منی، بسیں پریاگا
جن ہیں رام پداتی، انوار گا

یعنی Strike The Tent (خیمے اکھاڑ لو)...... پریاگ کا سفر کرنا ہوگا۔ لیکن یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ سنیاسی کا سفر جو ٹھہرا۔ سدھائے ہوئے ٹٹوؤں کی تلاش کرتے اور ان پر سامان لادتے، اونٹ پر مہاراج کی زین کستے، گائے بکریاں کو ساتھ لیتے، گٹھے گٹھڑیاں باندھتے، سلسلہ وار لگاتے ایک پہر گزر گیا۔ اس کے بعد کھانا کھا کر دو کوس دور شام سے پیشتر ہی بھورا گاؤں کے باہر ایک بہت بڑے برگد کے نیچے ڈیرہ جمایا گیا۔ جگہ نہایت دلفریب تھی۔ گورو مہاراج کو خوب پسند آئی۔ لیکن بھاردواج منی کے اس مقام تک پہنچتے پہنچتے کتنے مہینے صرف ہو جائیں گے۔ اس کا میں اندازہ ہی نہ کر سکا۔

اس بھورا کا نام آج تک مجھے یاد رہنے کی ایک خاص وجہ ہے، اس دن پورنماشی تھی۔ لہٰذا گورو مہاراج کے ارشاد کے مطابق ہم تینوں چیلے تین مختلف سمتوں میں بھکشا کے لیے گئے۔ اکیلا ہوتا تو شکم پری کے لیے کم کوشش نہ کرتا۔ مگر آج میری وہ چال نہ تھی۔ اس لیے بہت کچھ بیکار ہی ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک مکان کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر مجھے ایک بنگالی لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا لباس اگرچہ دیسی کھڈی کا بنا ہوا ٹاٹ کی مانند موٹا تھا لیکن پہننے کے خاص ڈھنگ نے میرے اضطراب کو مشتعل کر دیا۔ سوچا پانچ چھ دن سے اس گاؤں میں ہوں۔ تقریباً تقریباً ہر گھر میں ہو آیا ہوں۔ لیکن بنگالی عورت تو کجا بنگالی مرد کی شکل دکھائی نہیں دی۔ سادھو سنیاسیوں کے لیے کہیں روک ٹوک نہیں اندر داخل ہوتے ہی وہ عورت میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی شکل وصورت آج بھی مجھے یاد ہے۔ کیونکہ دس گیارہ سال کی لڑکی کی آنکھوں میں اضطراب، اتنی بے چینی، اتنی ویرانی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے بشرے سے، اس کے ہونٹوں سے، اس کی آنکھوں سے غرضیکہ اس کے ایک ایک عضو سے غم اور مایوسی پھوٹی پڑتی تھی۔ میں نے یکبارگی بنگالی میں کہا۔ ''کچھ بھکشا دنیا ماں''۔ پہلے تو وہ کچھ نہ بولی اس کے بعد اس کے ہونٹ ایک دو مرتبہ کانپ کر پھول اٹھے اور وہ رونے لگی۔

میں دل ہی دل میں کچھ شرما کر رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ سامنے کوئی نہ تھا تاہم پڑوس کے گھروں میں بہاری عورتوں کی بات چیت صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی یکا یک باہر آ کر اس حالت میں ہم دونوں کو دیکھ لے تو وہ کیا سوچے گی۔ کیا کہے گی یہ میں کچھ بھی سوچ نہ سکا۔ کھڑا رہوں یا واپس چلا جاؤں یہ فیصلہ کر سکنے کے پہلے ہی اس لڑکی نے روتے روتے ایک سانس میں ہی ہزار سوالات

پوچھ ڈالے۔ ''تم کہاں سے آ رہے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ تمہارا گھر کیا بردوان ضلع میں ہے؟ تم وہاں کب جاؤ گے؟ کیا تمہیں راجہ پور معلوم ہے؟ وہاں کے گوری تیواری کو جانتے ہو؟''

میں بولا...... ''تمہارا گھر کیا بردوان ضلع کے راجہ پور میں ہے؟''

اس لڑکی نے ہاتھوں سے آنکھوں کا پانی پونچھتے ہوئے کہا...... ''ہاں، میرے پتا کا نام گوری تیواری ہے اور بھائی کا نام رام لال تیواری ہے۔ انہیں کیا تم جانتے ہو؟ تین مہینے ہوئے سسرال میں آئی ہوں...... ابھی تک ایک بھی خط مجھے نہیں ملا۔ پتا، بھائی، ماں، گری بالا اور بابو کیسے ہیں کچھ بھی نہیں جانتی۔ وہ جو پیپل کا درخت ہے اس کے نیچے میری بہن کے سسرال کا مکان ہے۔ اس سوموار کو جیجی گلے میں پھانسی لگا کر مر گئیں...... لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ...... نہیں وہ بیٹھے سے مری ہیں۔''

حیرت واستعجاب سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ بات کیا ہے؟ یہ لوگ، دیکھتا ہوں کہ پورے ہندوستانی ہیں۔ لیکن لڑکی بالکل خالص بنگالن ہے۔ اتنی دور، ان گھرانوں میں ان لڑکیوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں اور ان کے شوہر، ساس سسر وغیرہ یہاں کیا کرنے آئے؟

میں نے پوچھا...... ''تمہاری بہن نے گلے میں پھانسی کیوں لگائی؟''

وہ بولی...... ''جیجی راجہ پور میں جانے کے لیے دن رات روتی تھیں۔ کھاتی نہیں تھیں۔ سوتی نہیں تھیں۔ اس لیے ان کے بال چھت سے باندھ کر انہیں تمام دن اور تمام رات کھڑا رکھا جاتا تھا۔ اس لیے جیجی گلے میں رسی ڈال کر مر گئیں۔''

میں نے پوچھا...... ''تمہارے ساس سسر بھی کیا ہندوستانی ہیں؟''

اس لڑکی نے ایک بار پھر رو کر کہا...... ''ہاں! میں ان لوگوں کی بات چیت کچھ بھی سمجھ نہیں سکتی۔ ان لوگوں کا کھانا بھی منہ میں نہیں ڈال سکتی۔ میں تو دن رات رویا کرتی ہوں۔ لیکن پتا نہ تو ہمیں خط ہی لکھتے ہیں اور نہ لینے ہی آتے ہیں۔''

میں نے پوچھا...... ''اچھا تمہارے پتا نے تمہاری شادی اتنی دور کی ہی کیوں؟''

لڑکی بولی...... ''ہم لوگ تیواری جو ہیں ہماری برادری میں قابل شادی لڑکے وہاں تو ملتے نہیں۔''

''تمہیں کیا وہ زدوکوب بھی کرتے ہیں؟''

اور نہیں تو کیا؟ یہ دیکھو نا۔'' اتنا کہہ کر اس لڑکی نے بازوؤں میں، پیٹھ کے اوپر مار کے نشانات دکھائے اور سسک سسک کر روتے ہوئے کہا...... ''میں بھی جیجی کی طرح ہی گلے میں پھانسی لگا کر مر جاؤں گی۔''

اس کی گریہ وزاری دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہو اٹھیں، سوال و جواب اور بھیک کا خیال کیے بغیر ہی میں باہر نکل آیا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور کہنے لگی۔ ''میرے پتا کے پاس جا کر تم کہو گے نا؟ وہ مجھے ایک دفعہ یہاں سے لے جائیں...... ورنہ میں......'' میں بمشکل تھوڑا سا سر ہلا کر تیز چال سے غائب ہو گیا۔ اس لڑکی کا دل ہلا دینے والا اصرار میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

راستے کے موڑ پر ہی بنیے کی دکان تھی۔ داخل ہوتے ہی دوکاندار نے میرے خیر مقدم کیا کھانے پینے کی کسی شے کی بھیک کے عوض جب میں چٹھی لکھنے کا کاغذ اور قلم دوات مانگ بیٹھا تو اسے کچھ حیرت تو ہوئی لیکن انکار نہ کیا۔ اسی جگہ بیٹھ کر میں نے گوری تیواری کے نام خط لکھ کر ڈال دیا۔ تمام حالات بلاکم وکاست لکھنے کے بعد آخر میں یہ بات لکھنا بھی میں نہ بھولا کہ ''لڑکی کی بہن حال ہی میں پھانسی لگا کر مر گئی ہے۔ اور وہ خود بھی مار پیٹ، ظلم وستم برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے اسی راہ چلنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ تم خود آ کر کوئی انتظام نہ کرو گے تو کیا ہو جائے گا۔ یہ کہا نہیں جا سکتا۔ بہت ممکن ہے تمہاری خط وکتابت یہ لوگ تمہاری لڑکی کو نہ دیتے ہوں۔'' اس پر پتہ لکھا ضلع بردوان میں راجہ پور گاؤں۔ معلوم نہیں ہو خط گوری تیواری کو پہنچا یا نہیں لیکن وہ واقعہ میرے دل پر اس طرح نقش ہو چکا ہے کہ اتنے عرصے کے بعد بھی اس کی یاد بدستور قائم ہے اور ہندو سماج کی نہایت لطیف ذات پات کی تفریق کے خلاف بغاوت کا جذبہ آج بھی میرے دل میں موجزن ہو اٹھتا۔

☆☆☆

ممکن ہے ذات پات کی تفریق کا یہ اصول بہت ہی اچھا ہو۔ کیونکہ اس کی بدولت ہی قدیم ہندو قوم آج تک بچی ہوئی ہے اور اس کی اہمیت کے متعلق شک وشبہ یا اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ کہیں کوئی دو چار بدنصیب لڑکیا غم وآلام کا مقابلہ نہ کر کے گلے میں پھانسی لگا کر مر جائیں گی اسی خوف کے ڈر سے اس کی قیود کو رتی بھر بھی کمزور کرنے کا تصور تک بھی پاگل پن ہے۔ مگر اس لڑکی کی نالہ وفریاد جو انسان بچشم خود دیکھ کر آیا ہو۔ اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس سوال کو اپنے پاس آنے سے روک سکے کہ کسی طرح ٹکے رہنا...... اپنی ہستی کو قائم رکھنا ہی کیا زندگی کا حقیقی معیار ہے۔ اس قسم کی تو بہت سی قومیں اپنی ہستی کو قائم رکھے ہوئے موجود ہیں۔ کور کو ہیں، کول، بھیل، سنتھال ہیں۔ جزائر غرب الہند میں بے شمار چھوٹی موٹی قومیں انسانی دنیا کے آغاز سے ابھی تک ویسی ہی بنی ہوئی ہیں۔ افریقہ میں ہیں، امریکہ میں ہیں۔ ان قوموں میں بھی اس طرح کے تمام سخت آئین قانون موجود ہیں۔ جنہیں سن کر جسم کا خون پانی ہو جاتا ہے۔ قدامت کے لحاظ سے وہ قومیں یورپ کی کئی قوموں سے بھی قدیم ہیں۔ اور ہم سے بھی زیادہ پرانی ہیں لیکن اس لیے وہ قومیں ہماری نسبت تہذیب وتمدن میں، اخلاق اور چال

چلن میں ہم سے زیادہ افضل ہیں۔ ایسا عجیب وغریب وہم میں سمجھتا ہوں کہ کسی کے دل میں نہ اٹھتا ہو گا۔ مجلسی برائیاں مجموعی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتیں۔ شاذ ونادر ہی کبھی کبھار کسی ایک آدھ پر میری توجہ جاتی ہے۔ اپنی دونوں بنگالی لڑکیوں کو ہندوستانیوں کے گھر بیاہتے وقت گوری تیواری کے دل میں شاید اس طرح کا خیال آیا تھا مگر وہ بیچارہ اس الجھن سے نجات حاصل کرنے کا کوئی علاج نہ ملنے پر ہی بالآخر سماج کے کھونٹے پر دونوں لڑکیوں کو قربان کر دینے پر مجبور ہوا تھا۔ جو سماج ان دونوں بے بس لڑکیوں کے لیے بلیدان کے لیے بھی جگہ نہ دے سکا جو سماج اپنے آپ کو اتنا وسیع اور فراخ بنانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس لنگڑے اور مردہ سماج کے لیے میں اپنے دل میں کسی فخر کا احساس نہیں کر سکا۔ کہیں بڑے بھاری منصب کی تصنیف میں پڑھا تھا کہ ہمارے سماج نے جس ایک اہم مجلسی سوال کا جواب دنیا کے سامنے ''ذات پات کی تمیز'' کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کا آخری فیصلہ آج تک بھی نہیں ہوا...... ایسا ہی کچھ اس میں مرقوم تھا۔ مگر اس تمام بحث وتمحیص کا جواب دینے اور ان دلائل کی تردید کرنے کی میری خواہش نہیں ہوتی۔ ہوا نہیں ہے اور ہوگا نہیں، گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کرنے والے جو لوگ اپنے ہی سوال کے جواب کو خود ہی دبا دیتے ہیں۔ ان کو جواب دینے کا بھی حوصلہ نہیں ہوتا۔ خیر جانے دیجیے اس ذکر کو۔

دوکان سے اٹھ کر اور ڈھونڈ کھوج کر اس خط کو بیرنگ ہی لیٹر بکس میں ڈال کر جب میں اپنے ڈیرے پر واپس پہنچا۔ تو میرے دیگر ہمعصر آٹا، دال وغیرہ جمع کر کے ابھی لوٹے نہ تھے۔

میں نے دیکھا کہ سادھو بابا آج کچھ گرم مزاج ہیں۔ وجہ بھی انہوں نے خود ہی بتا دی بولے...... ''یہ گاؤں سادھو سنیاسیوں کے متعلق اتنا وفادار نہیں۔ سیوا خدمت کا انتظام بھی قابل اطمینان نہیں۔ اس لیے کل ہی اس جگہ کو چھوڑ دینا ہوگا۔'' جوار شاد کہہ کر میں نے ان کی تائید کر دی۔ دل میں پٹنہ دیکھنے کا جو اضطراب تھا۔ اس کو اور زیادہ ڈھانپ کر آج میں رکھ نہ سکا۔

اس کے علاوہ باہر کے ان مواضعات میں کسی طرح کشش بھی نہ تھی۔ اس سے پیشتر میں بنگال کے گاؤں میں گھوما پھرا ہوں لیکن ان کے ساتھ ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ مرد وزن، پیٹر پتے، آب وہوا...... کوئی بھی شے مانوس معلوم نہیں ہوتی۔ دل صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک 'بھاگوں بھاگوں' کیا کرتا تھا۔

شام کے وقت گھر گھر اور محلے محلے میں اس طرح جھانجھ اور کرتال کے ساتھ کیرتن کا سر کانوں میں نہیں آتا۔ دیو مندروں میں آرتی کے کانس کے گھنٹے وغیرہ بھی اس طرح کی دلکشی پیدا نہیں کرتے۔ اس جگہ کی عورتیں شنکھ کو ویسی میٹھی طرح سے بجانا نہیں جانتیں۔ تو یہاں انسان کس آرام کے

لیے بستے ہیں۔ دل ہی دل میں معلوم ہونے لگا کہ اگر ان تمام گاؤں میں نہ آ پڑا ہوتا تو اپنے گاؤں کی قدر و قیمت کبھی محسوس ہی نہ ہوتی۔ ہمارے وہاں کے پانی میں کائی بھری رہتی ہے۔ ہوا میں ملیریا ہے۔ عموماً سبھی باشندوں کی پیٹ میں تلی بڑھی ہوئی ہے۔ گھر گھر مقدمے بازی ہوا کرتی ہے محلے محلے میں دل بندیاں ہیں۔ یہ سب رہنے دیجئے لیکن اس کے باوجود بھی وہاں کیسا لطف اور کیسی تسکین تھی۔ اس وقت اس کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ جاننے لگا۔

دوسرے دن خیمے اکھاڑ کر سفر شروع کر دیا۔ اب سادھو بابا حسب طاقت بھاردداج منی کے آشرم کی طرف پوری پوری کوشش سے بڑھنے لگے۔ مگر خواہ اس خیال سے کہ راستہ سیدھا ہے یا منی جی نے میرے دل کی بات جان لی۔ اس وجہ سے ہو۔ پٹنہ کے دس کوس کے اندر انہوں نے پھر کہیں خیمے نصب نہ کئے۔ دل میں ایک حسرت تھی۔ خیر اسے اس وقت رہنے دو۔ گناہ تو میں نے جی بھر کر لیے۔ سادھوؤں کی صحبت سے ہی چند دن کے لیے پاکیزگی حاصل کر لوں۔

ایک دن شام سے کچھ پیشتر جس جگہ ہمارا ڈیرہ پڑا اس کا نام تھا چھوٹی بگیا۔ آرہ سٹیشن سے یہ جگہ آٹھ کوس دور ہے۔ اس گاؤں کے ایک مشہور بنگالی صاحب سے میرا تعارف ہو گیا تھا۔ ان کا مجمل طور پر ذکر کروں گا۔ ان کے اصلی نام کو پوشیدہ رکھ کر، رام بابو، کہنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اب تک وہ زندہ ہیں اور بعد ازاں اگرچہ کسی جگہ میری ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے تھے۔ اس میں کچھ حیرت بھی نہیں۔ ان کا مزاج میں جانتا ہوں۔ پوشیدہ طور پر جو نیک کام انہوں نے کئے ہیں۔ ان کا اگر ذکر دیا جاتے تو ان کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اس لیے ان کا نام ہے، رام بابو، کس طرح رام بابو اس گاؤں میں آئے تھے۔ اور کس طرح انہوں نے زمین جائیداد جمع کر کے کھیتی باڑی شروع کی تھی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ انہوں نے دوسری شادی کی تھی اور تین چار بیٹے بیٹیوں کے ساتھ وہ چین اور آرام سے رہتے تھے۔

صبح کے وقت سنا گیا کہ ان ہی چھوٹی بگیا اور بڑی بگیا نام کے گاؤں میں اس وقت چیچک کی بیماری خطرناک طور پر پھیل رہی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مصیبت اور قہر کے موقعہ پر ہی سادھ سنیاسیوں کی خاطر تواضع بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔ اس لیے سادھو بابا نے غیر متزلزل ارادہ سے وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

اچھی بات ہے۔ سنیاس کی زندگی کے متعلق ایک بات میں یہاں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ زندگی میں میں نے لاتعداد سنیاسی دیکھے ہیں۔ چار ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ ایسے ہی

گہرے تعلقات سے گھل مل کر بھی رہا ہوں۔ برائیاں جوان میں ہیں وہ ہیں ہی۔ میں خوبیوں کا ہی ذکر کروں گا۔ محض پیٹ کے لیے سادھو جی، تو باہم کئی باتیں جانتے ہوں گے۔ لیکن ان میں بھی یہ دو خرابیاں میری نگاہ سے نہیں گزری...... میری نظر میں بہت زیادہ موٹی نہ تھی۔ عورتوں کے متعلق ان لوگون کا ضبط سمجھئے یا حوصلہ کی کمی خوب زیادہ ہے۔ اور موت کا خوف بھی ان لوگوں میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست ہی تو ہے۔ مگر کیا کرنے سے 'بہت دن زندگی ملتی ہے، یہ خیال نہیں ہوتا۔ ہمارے سادھو بابا بھی ایسے ہی تھے۔ پہلی شے یعنی عیش کے لیے دوسری یعنی زندگی کو انہوں نے بیچ کر رکھا تھا۔

تھوڑی سی دھونی کی راکھ اور دو بوند کمنڈل کے پانی کے عوض جو تمام چیزیں دنادن ڈیرہ میں آنے لگیں۔ وہ کیا سنیاسی اور کیا گرہستی کے لیے بھی نامرغوب نہیں ہو سکتیں۔

رام بابو معہ اپنی بیوی کے روتے ہوئے آئے۔ چار روز بخار کے بعد آج صبح بڑے لڑکے کو چیچک دکھائی دی تھی اور چھوٹا بچہ کل رات سے بخار میں بے ہوش پڑا ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ بنگالی ہیں۔ میں نے خود ان کے قریب جا کر ان سے تعارف حاصل کیا۔

اس کے بعد اس داستان کے سلسلہ میں مہینہ بھر کا وقفہ ڈالنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ کس طرح ہماری واقفیت کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ کس طرح دونوں بچے تندرست ہوئے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ کہتے کہتے ہی اکتا جاؤں گا پھر قارئین کی بات تو دور رہی۔ تاہم درمیان کی ایک بات عرض کرتا ہوں۔ تقریباً دو ہفتہ بعد جب بیماری خوب زور سے پھیل رہی تھی۔ سادھو جی نے اپنا ڈیرہ اٹھانے کی تجویز کی۔ رام بابو کی بیوی رو کر بول اٹھی...... ''سنیاسی بھیا، تم تو سچ مچ کے سنیاسی نہیں ہو۔ تمہارے دل میں تو درد اور رحم ہے۔ نویں اور جیون کو اگر تم چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو وہ کبھی نہ بچیں گے، کہاں؟ جاؤ دیکھوں کیسے جاتے ہو؟'' اتنا کہہ کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ رام بابو بھی اپنی بیوی کی تائید میں منت سماجت کرنے لگے۔ اسی لیے میں نہ جا سکا۔ سادھو بابا سے کہا۔ ''پربھو'' آپ چلیں میں راستے میں نہیں تو پریاگ پر پہنچ کر ضرور ہی آپ کی قدم بوسی کروں گا پربھو قدرے ناراض ہوئے۔ آخر کار بار بار اصرار کر کے اور بلا وجہ کہیں تاخیر نہ کر دینا۔ اس کے متعلق بار بار محتاط کر کے وہ عازم سفر ہوئے۔ میں رام بابو کے گھر میں ہی رہ گیا۔ ان چند دنوں میں ہی میں پربھو کی مہر و محبت کا سب سے زیادہ حق دار ہو گیا تھا اور اگر اور بھی چند دن اسی طرح ان کے پاس رہ جاتا تو ان کے بعد، ان کی جانشینی کے سلسلہ میں اس ٹٹو اور دونوں اونٹوں کا مالک ہوتا۔ خیر جانے دو۔ ہاتھ کی دولت پاؤں سے دھکیل کر، گئی گزری بات پر افسوس کرنے سے اب کیا فائدہ؟

دونوں بچے اب راضی ہو گئے تھے۔ بیماری نے گھروں کے گھر اجاڑ دیئے۔ وہ کیا مہیب منظر تھا جس نے اپنی آنکھوں نہیں دیکھا۔ وہ پڑھ کر اس کا ذکر سن کر یا تصور سے اس کو ذہن نشین کر سکے یہ قطعی ناممکن ہے۔ اس لیے اس ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ لوگوں نے بھاگنا شروع کیا جس گھر میں انسان کا نشان نظر نہیں آتا۔ جھانک کر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف ماں اپنی بیمار اولاد کو لیے بیٹھی ہے۔

رام بابو نے بھی اپنے گھر کی بیل گاڑی میں اپنا سامان لاد دیا۔ وہ تو کئی دن پیشتر ہی ایسا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مجبور ہو کر ہی ایسا نہ کر سکے۔ پانچ چھ روز سے میرا جسم نہایت سست سا ہو رہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شب بیداریوں اور لگاتار محنت کے باعث ہی ایسا ہو رہا ہے۔ اس دن صبح ہی سے سر میں درد ہونے لگا۔ بالکل مجبوری کے طور پر اس دن دوپہر کو جو کچھ کھایا یا شام کے وقت اسے قے کر دیا۔ رات کے نو دس بجے معلوم ہوا کہ بخار چڑھ آیا ہے۔ اس دن تمام رات بحران کی تیاریاں جا رہی تھیں۔ سب جاگ رہے تھے۔ کافی رات گئے رام بابو کی بیوی باہر سے کمرے میں جھانک کر بولی...... ''سنیاسی بھیا! تم کیا ہمارے ساتھ ہی آرہ سٹیشن تک نہ چلو گے؟''

میں بولا...... ''ضرور چلوں گا۔ مگر تمہیں اپنی گاڑی میں تھوڑی سی جگہ مجھے ضرور دینی ہوگی۔''

بہن نے بیقرار ہو کر پوچھا...... ''یہ کیسے سنیاسی بھیا! گاڑیاں تو دو سے زیادہ مل نہیں سکیں۔ ان میں تو ہم لوگوں کے لیے بھی کافی جگہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا...... ''مجھ میں تو چلنے کی طاقت ہی نہیں بہن؟ صبح ہی سے خوب بخار چڑھ رہا ہے۔''

''بخار کہتے کیا ہو؟'' یہ کہہ کر اور جواب کا خیال کئے بغیر ہی میری نئی بہن اپنا منہ چھپا کر چلی گئی۔

کتنی دیر تک سوتا رہا یہ نہیں جانتا۔ جاگ کر دیکھا کہ کافی دن چڑھ آیا ہے مکان کے اندر سب کمروں میں تالے لگے ہوئے ہیں اور کسی انسان کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

باہر کے جس کمرے میں میں تھا اس کے سامنے سے ہی اس گاؤں کا کچا راستہ آرہ سٹیشن تک جاتا ہے۔ اس راستے سے روزانہ کم از کم پانچ چھ بیل گاڑیاں، موت سے دوڑ کر بھاگنے والے مرد اور عورتوں کا مال اسباب لاد کر سٹیشن تک جایا کرتی تھیں۔ دن بھر تک بے شمار کوشش کرنے کے بعد شام کو مجھے ایک گاڑی میں جگہ مل ہی گئی۔ جن بوڑھے بہاری مہربان نے رحم کھا کر مجھے اپنے ساتھ لے لیا تھا انہوں نے خوب تڑکے ہی مجھے سٹیشن کے قریب ایک درخت کے نیچے اتار دیا۔ اس وقت مجھ میں بیٹھنے کی

بھی سکت باقی نہ تھی۔ میں وہیں لیٹ گیا پاس ہی ٹین کا ایک شیڈ تھا۔ پہلے وہ مسافر خانہ کے کام آتا تھا لیکن آج کل بادل پانی کے دن گائے بچھڑوں کے استعمال میں آنے کے علاوہ اور کسی کام میں نہ آتا تھا۔ وہ بوڑھا مہربان سٹیشن سے بنگالی نوجوان کو بلا لایا۔ میں اسی کی عنایت سے کئی ایک قلیوں کی امداد سے اس شیڈ کے نیچے لایا گیا۔

میری بدقسمتی ہے کہ میں اس نوجوان کا کوئی تعارف نہیں دے سکتا کیونکہ میں اس وقت اس سے پوچھ ہی نہ سکا۔ پانچ چھ مہینے بعد جب کچھ دریافت کرنے کا موقعہ اور طاقت ملی تو معلوم ہوا کہ چیچک سے بیمار ہو کر وہ اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہے۔ اس کے متعلق دریافت کرنے پر صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ وہ مشرقی بنگال کا تھا اور پندرہ روپے ماہوار پر سٹیشن پر کام کرتا تھا۔ کچھ دیر ٹھہر کر اپنا سینکڑوں جگہ سے پھٹا ہوا بچھونا لا کر اس نے حاضر کیا اور وہ بار بار کہنے لگا کہ میں اپنے ہاتھ سے خود پکا کر کھاتا ہوں اور دوسرے کے گھر میں رہتا ہوں۔ دوپہر کے وقت ایک کٹورا گرم دودھ لا کر اس نے جبراً پلا کر کہا باہر کے جس کمرے میں میں تھا اس کے سامنے سے ہی اس گاؤں کا کچا راستہ آرہ سٹیشن تک جاتا ہے۔ اس راستے سے روزانہ کم از کم پانچ چھ...... ''ڈرنے کی بات نہیں ہے اچھے ہو جاؤ گے۔ لیکن اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا دوست احباب کو اطلاع دینی ہو تو پتہ بتا دینے پر میں تار دے سکتا ہوں۔

اس وقت تک میں خوب ہوش میں تھا۔ اس لیے یہ بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ حالت بہت دیر تک نہ رہے گی۔ اس طرح کا بخار اگر اور بھی پانچ چھ گھنٹے مسلسل رہا تو ہوش ضرور گنوانا پڑے گا اس لیے جو کچھ کرنا ہے وہ اتنے وقت کے دوران میں نہ کرنے پر پھر نہیں کیا جا سکے گا۔ یہ تو ٹھیک لیکن اطلاع دینے کی تجویز پر کچھ تذبذب میں پڑ گیا کیوں؟ اس کی تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوچا غریب کا پیسہ ٹیلیگرام میں خرچ کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔

شام کے بعد وہ شریف النفس اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایک گھڑا پانی اور مٹی کے تیل کی ڈبی لے کر آیا۔ اس وقت بخار کی شدت سے دماغ خراب ہو رہا تھا اسے پاس بلا کر میں نے کہا۔ ''جب تک مجھے ہوش ہے گاہے گاہے دیکھ جانا۔ اس کے بعد جو ہونا سو ہو۔ آپ اور کوئی تکلیف نہ اٹھائیں۔''

وہ نہایت کم گو اور نیک انسان تھا۔ بات کو بنا کر کہنے کی اسے عادت نہ تھی جواب میں محض، نہیں نہیں، کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا'' آپ نے فرمایا تھا کہ میں کسی کو اطلاع دے دوں۔ میں سنیاسی ہوں۔ درحقیقت میرا اپنا کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم پٹنہ میں پیاری بائی کے پتہ پر اگر ایک پوسٹ کارڈ لکھ دو گے کہ شری کانت آرہ سٹیشن کے باہر ایک'' میں ٹیڈ کے نیچے قریب المرگ پڑا ہے تو......''

وہ نوجوان بے قرار ہو کر بول اٹھا۔ ''میں ابھی اطلاع دیئے دیتا ہوں۔ چٹھی اور تار دونوں ہی بھیج دیتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھ چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ''بھگوان! اسے خبر ہو جائے۔''

☆☆☆

ہوش آنے پر پہلے تو میں اپنی حالت اچھی طرح سمجھ ہی نہ سکا۔ سر پر ہاتھ لے جا کر محسوس کیا کہ وہ تو آئس بیگ ہے۔ آنکھیں مل کر دیکھا کہ مکان کے اندر ایک کھاٹ پر پڑا ہوں۔ سامنے سٹول پر ایک دیئے کے پاس دو تین دوا کی شیشیاں ہیں اور اس کے پاس رسی کی ایک کھاٹ پر کوئی انسان سرخ چیک کار پر لپٹے ہوئے سو رہا ہے۔ بہت دیر تک کچھ بھی یاد نہ کر سکا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے یہ معلوم ہونے لگا گو نیند میں کتنے ہی خواب دیکھے ہیں۔ بے شمار لوگوں کا آنا جانا، اٹھا کر مجھے ڈولی میں ڈالنا، سر اٹھا کر دوائی پلانا۔ اس قسم کی کتنی ہی باتیں یاد آئیں۔

کچھ دیر بعد جب وہ شخص اٹھ گیا تو دیکھا کہ کوئی بنگالی صاحب ہے۔ عمر اٹھارہ انیس سے زیادہ نہیں۔ اس وقت میرے سرہانے کے قریب سے نہایت شیریں لہجہ میں جس نے مخاطب کیا اس کی آواز میں نے پہچان لی۔

پیاری نے کمال ملائمت سے پکارا۔ ''بنکو، برف کا بیگ بدل کیوں نہیں دیا بیٹا؟''

لڑکا بولا...... ''بدل دیتا ہوں۔ تم تھوڑا سا سو لو نہ ماں۔ ڈاکٹر صاحب جب کہہ گئے ہیں کہ شتیلا نہیں ہے تو ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں ہے ماں!''

پیاری بولی...... ''ارے بھیا، ڈاکٹر کے کہنے سے کو ڈرنے کی کوئی بات ہے عورتوں کا ڈر کہیں جاتا ہے؟ مجھے تشویش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بنکو۔ تو تو برف بدل کر سو جا...... پھر رات کو مت جاگنا۔''

بنکو نے آ کر برف بدل دیا اور لوٹ کر وہ پھر اسی کھاٹ پر جا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب اس کی ناک بجنی شروع ہوئی تو میں نے آہستہ سے پکارا۔ ''پیاری!''

پیاری نے منہ پر جھک کر اور سر پر بکھرے ہوئے پانی کے قطرات کو اپنے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا۔ مجھے کیا تم پہچان سکتے ہو؟ اب کیسے ہو؟ کل......''

''اچھا ہوں۔ کب آئی؟ یہ کیا آ رہا ہے؟''

''ہاں آ رہی ہے۔ کل ہم لوگ گھر چلیں گے۔''

''کہاں؟''

''پٹنے، سوائے اپنے گھر لے جانے کے ابھی کیا اور کہیں میں تمہیں چھوڑ کر جا سکتی ہوں؟''

''یہ لڑکا کون ہے راج لکشمی؟''

''میری سوت کا لڑکا ہے مگر بنکو میرے اپنے لڑکے کی طرح ہی ہے۔ میرے پاس رہ کر ہی پٹنہ کالج میں پڑھتا ہے۔ آج اب اور بات مت کرو۔ سو جاؤ۔ کل جی بھر کر باتیں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھ کر میرا منہ بند کر دیا۔

میں ہاتھ بڑھا کر راج لکشمی کے داہنے ہاتھ کو مٹھی میں لے کر کروٹ بدل کر سو رہا۔

☆☆☆

جس بخار میں مبتلا ہو کر بستر علالت پر دراز ہو گیا تھا وہ شتیلا کا نہیں تھا کچھ اور ہی تھا۔ ڈاکٹری کتابوں میں یقیناً ہی اس کا کوئی بڑا بھاری نام تھا لیکن مجھے وہ یاد نہیں رہا۔ اطلاع ملتے ہی پیاری، اپنے لڑکے اور دو نوکر اور نوکرانی کو لے کر آ حاضر ہوئی۔ اس دن ٹھہرنے کے لیے ایک جگہ کرائے پہ لے کر مجھے وہاں ٹھہرا دیا اور شہر کے بھلے برے سب ڈاکٹروں کو بلا کر وہاں اکٹھا کر دیا۔ اچھا ہی کیا ورنہ اور کوئی نقصان خواہ نہ ہوتا لیکن بھارت ورش کے ناظرین کا اشتیاق تو نامکمل ہی رہ جاتا۔

صبح پیاری نے کہا...... ''بنکو اب مزید دیر نہ کرو بیٹا، اسی وقت سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ ریزرو کرا آ۔ میں ایک لمحہ بھی انہیں یہاں رکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔''

بنکو اس وقت شیریں خواب کا لطف لے رہا تھا۔ اس نے اسی طرح نیم وا آنکھوں سے جواب دیا۔ تم پگلی ہو گئی ہو ماں، ایسی حالت میں کیا مریض کو یہاں سے وہاں لے جایا جا سکتا ہے؟''

پیاری نے کچھ ہنس کر کہا...... ''پہلے اٹھ۔ اور منہ پر چھینٹے مار اس کے بعد یہاں وہاں لے جانے کی بات سمجھ لی جائے گی۔ راجا بیٹا میرے اٹھ۔''

''بنکو اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر، چارپائی چھوڑ، منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل اسٹیشن پر چلا گیا۔ اس وقت بھی بہت جلدی تھی۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ آہستہ آہستہ پکارا...... پیاری۔'' میرے سرہانے کی طرف ایک کھاٹ پر بچھی ہوئی تھی۔ اسی پر تھکاوٹ سے چور ہو شاید اسی دوران میں وہ ابھی آنکھیں موند کر لیٹ گئی تھی۔ جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور میرے منہ پر جھک گئی۔ نازک لہجہ میں اس نے پوچھا...... ''نیند کھل گئی۔؟''

''میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔'' پیاری نے محبت بھری احتیاط سے میرے سر اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے کہا...... ''بخار اس وقت بہت کم ہے۔ آنکھیں بند کر کے تھوڑا سا سونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''یہ تو میں برابر ہی کرتا ہوں۔ آج بخار کو کتنے روز ہوئے پیاری؟''

''تیرہ روز'' کہہ کر بڑی بوڑھی بزرگ کی طرح سنجیدہ آواز میں کہا۔ ''دیکھو لڑکے بالوں کے سامنے مجھے یہ نام لے کر مت پکارا کرو۔ بہت دنوں تک 'دلکشمی' کہہ کر پکارتے رہے ہو۔ وہی نام لے کر کیوں نہیں پکارتے؟''

دو دن سے میں خوب ہوش میں تھا۔ مجھے بھی سب باتیں یاد آ گئی تھیں۔ میں نے کہا......

''اچھا۔'' اس کے بعد جس بات کے لیے بلایا تھا اسے دل ہی دل میں اچھی طرح ترتیب دے کر کہا......

''مجھے لے جانے کی کوشش کر رہی ہو، لیکن میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے۔ اب اور دینا نہیں چاہتا۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں سوچتا ہوں کہ اب جیسا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے تین چار دن میں ہی اچھا ہو جاؤں گا۔ تم لوگ خواہ اتنے دن اور ٹھہر کر کیا کرو گے اپنے گھر چلے جاؤ۔''

''تب تم کیا کرو گے؟ سنوں تو۔''

''جو کچھ ہونا ہوگا ہو ہی جائے گا۔''

''وہ تو ہو جائے گا۔'' کہہ کر پیاری کچھ ہنس دی۔ اس کے بعد سامنے آ کر، کھاٹ پر ایک طرف بیٹھ کر میرے منہ کی طرف دیکھ کر لمحہ بھر خاموش رہ کر پھر کچھ ہنس کر بولی...... ''تین چار دن میں تو نہیں دس بارہ دن میں یہ بیماری تو رفع ہو جائے گی۔ لیکن حقیقی بیماری کتنے دنوں میں رفع ہو گی؟ یہ میں جانتی ہوں۔''

''حقیقی بیماری اور کیا؟''

پیاری نے کہا...... ''سوچو گے کچھ، کہو گے کچھ اور کرو گے کچھ، ہمیشہ سے تمہیں یہی ایک مرض ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک سے پیشتر میں تمہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ کر سکوں گی...... پھر بھی تم کہو گے۔ ''تمہیں تکلیف دی، تم جاؤ، ارے او میرے ہمدرد تمہیں اگر میرا اتنا دور ہے تو اور خواہ جو ہو لیکن سنیاسی تو تم نہیں ہو، سنیاسی بن کر یہ کیا ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔ آ کر دیکھتی ہوں کہ زمین پر پھٹی کیتھری پر سخت بے ہوش پڑے ہو۔ کیچڑ مٹی میں جٹائیں آلودہ ہو چکی ہیں۔ گلے میں رودراکش کی مالائیں اور دونوں ہاتھوں میں پیتل کے کڑے ہیں۔ میاری میا۔ چہرہ دیکھ کر روئے بغیر نہ رہ سکی'' اتنا کہتے کہتے امڈے ہوئے آنسوؤں کا پانی آنکھوں میں چھلک آیا اسی وقت وہ اسے ہاتھ سے پونچھ کر...... ''بنکو بولا، یہ کون ہے ماں؟ دل ہی دل میں بولی...... تو بچہ ہے، تیرے سامنے وہ بات کیا کہوں بھیا۔ وہ دنیا بھر میں کسی نے کبھی کسی کو نہ دیا ہوگا۔ شہر میں چیچک کا زور پھیل رہا ہے۔ سب کو لے کر خیریت سے بھاگ سکوں تو جان میں جان آئے۔'' اتنا کہہ کر اس نے ایک طویل آہ بھری۔

اسی رات کو آرہ چھوڑ دیا۔ ایک کم عمر کا ڈاکٹر بہت سی دوائیاں لے کر ہم لوگوں کو پٹنہ تک پہنچانے کے لیے ساتھ گیا۔

☆☆☆

پٹنہ پہنچ کر بارہ تیرہ دن کے اندر ہی ایک طرح سے میں اچھا ہو گیا۔ ایک روز صبح اکیلا پیاری کے مکان کے ہر ایک کمرے میں گھوم آیا۔ اس کا مال و اسباب دیکھ میں کچھ دنگ رہ گیا میں نے اس سے پیشتر اس قسم کا ساز و سامان نہ دیکھا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ چیزیں سب عمدہ اور بیش قیمت تھیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس مارواڑی محلے میں ان سرمایہ داروں اور کم تعلیم یافتہ شوقین مزاجوں کی صحبت میں اتنی معمولی چیزوں سے وہ مطمئن کیسے رہتی تھی؟ اس سے پیشتر میں نے اس قسم کے جتنے مکان دیکھے تھے۔ ان کے ساتھ کسی بھی پہلو میں اس کی مناسبت نہ تھی۔ ان میں اندر گھستے ہی خیال آتا تھا کہ ان میں انسان لمحہ بھر بھی رہتا کس طرح ہوگا؟ ان مکانوں کے جھاڑ فانوس، تصاویر، دیوار گری، آئینہ اور شیشے کی الماریوں کو دیکھ کر مسرت کی بجائے پریشانی ہی ہوتی تھی۔ معمولی سانس تک کے لیے بھی معلوم ہوتا تھا کہ فرصت نہ ملے گی۔ بہت لوگوں کی مختلف طبائع اور مختلف پسند کے تحفے تحائف اس طرح ٹھسا ٹھس ایک پر ایک بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ کہ دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان محروم حیات تحفوں کی مانند ہی ان کے لانے والے بھی اس مکان کے اندر ایسی بھیڑ میں باہم دھکم پیل کر کے جد و جہد کر رہے ہیں۔ مگر اس مکان کے کسی بھی کمرے میں ضروری اشیاء کے علاوہ ایک بھی شے فالتو نظر نہ آئی۔ اور جو بھی شے نظر آئی وہ خود صاحب خانہ کے استعمال کے لیے لائی گئی ہے اور اس کی اپنی خواہش اور مزاج کی حد سے تجاوز کر کے جگہ گھیرے نہیں بیٹھی ہے۔ یہ بات بآسانی معلوم ہو گئی اور بھی ایک بات نے میری نگاہ کو کشش کیا۔ اتنی مشہور معروف ''بائی جی'' کے گھر میں گانے بجانے کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے۔ اس کمرے سے اس کمرے میں گھومتا ہوا دوسری منزل کے ایک کونے کے کمرے کے سامنے آ کر میں کھڑا ہو گیا۔ یہ بائی جی کی ذاتی خوابگاہ ہے۔ اس کے اندر جھانکتے ہی معلوم ہو گیا لیکن میرے خیالی تصور کے ساتھ اس کی کتنی تفاوت تھی۔ جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کمرے میں اس کا کچھ بھی نہ تھا۔ میز سفید پتھر کی تھی۔ دیواریں کچے دودھ کی طرح چمچما رہی تھیں۔ کمرے کے ایک کنارے ایک چھوٹے سے تخت پر بستر بچھے تھے۔ ایک لکڑی کی الگنی پر کچھ کپڑے پڑے تھے۔ اور اس کے پیچھے ایک آہنی الماری تھی اور کہیں کچھ نہ تھا۔ جوتے پہنے ہوئے مجھے اندر داخل ہوتے بھی جھجک محسوس ہوئی انہیں چوکھٹ کے باہر کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تھکاوٹ کی وجہ سے ہی اس کی سیج پر جا کر میں بیٹھ گیا تھا۔ اگر کمرے میں بیٹھنے کے قابل کوئی اور جگہ ہوتی تو میں اسی پر بیٹھتا۔ سامنے کی کھڑکی کو ایک بڑا سا نیم کا درخت ڈھانپ رہا تھا۔ اسی

میں سے چھن چھن کر ہوا آ رہی تھی۔ اس طرف دیکھتے ہوئے میں کچھ محو ہو گیا تھا۔ ایک شیریں الفاظ سے چونک کر میں نے دیکھا۔ گن گن گانا گاتی گاتی پیاری کمرے میں گھس آئی ہے۔ وہ گنگا جی میں اشنان کرنے کے لیے گئی تھی۔ اور اب وہاں سے لوٹ کر اپنے کمرے میں گیلے کپڑے اتارنے آئی ہے۔ اس لئے اس طرف ایک مرتبہ بھی نہ دیکھا۔ جب وہ سیدھی الگنی کے پاس جا کر سوکھے کپڑے ہاتھ ڈالنے لگی تو میں نے آواز دی...... ''گھاٹ پر کپڑے لے کر کیوں نہیں جاتیں؟''

پیاری نے چونک کر ہنس دیا بولی...... ''ایں چور کی طرح میرے کمرے میں گھسے بیٹھے ہو؟ نہیں نہیں، بیٹھے رہو...... جاؤ مت، میں اس کمرے میں کپڑے بدل آتی ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ ہلکے قدموں دھوتی ہاتھ میں لے کر باہر چلی گئی۔

پانچ ایک منٹ بعد وہ مسرور چہرے سے لوٹ آئی اور ہنس کر بولی...... ''میرے کمرے میں تو کچھ بھی نہیں تو کیا چرانے آئے ہو، بولو تو؟ مجھے تو چرانے نہیں آئے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''تم نے مجھے کیا اتنا احسان فراموش سمجھ رکھا ہے؟ تم نے میرے لیے اتنا کیا اور آخر کار میں تمہاری ہی چوری کروں گا۔ میں اتنا حریص نہیں ہوں۔''

پیاری کا چہرہ اداس ہو گیا۔ بولتے دقت میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ کہ اس بات سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ اس کا دل دکھانے کا نہ تو میرا ارادہ تھا اور نہ ایسی خواہش کرنا قدرتی ہی تھا۔ خاص طور سے جبکہ میں نے دو ایک دن میں ہی وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بگڑی ہوئی بات کو کسی طرح بنا لینے کی غرض سے میں نے زبردستی ہنس کر کہا...... ''اپنی چیز کی بھی کیا کوئی چوری کرنے جاتا ہے۔ تجھ میں اتنی بھی عقل نہیں ہے؟''

لیکن اتنی آسانی سے اس کو دھوکہ دیا نہ جا سکا۔ اس نے اداس چہرے سے کہا...... ''تمہیں اور زیادہ ممنون ہونے کی ضرورت نہیں۔ رحم کھا کر تم نے اس وقت جو اطلاع دے دی تھی۔ میرے لیے وہی بہت کافی ہے؟

اس کے پاکیزہ اور خندہ چہرے کو اس گرمی سے روشن پر بھات کے وقت میں نے حزیں بنا دیا۔ یہ دیکھ کر دل میں ایک دود پیدا ہوا اٹھا۔ اس خفیف سی ہنسی میں جو ایک دلآویزی تھی اس کے زائل ہوتے ہی نقصان کا اندازہ ہوا اٹھا۔ اسے واپس لانے کے ارادہ سے میں اسی وقت تاسفانہ لہجہ میں بول اٹھا...... ''لاشمی تم سے میرا کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ سب کچھ تو جانتی ہو۔ تم وہاں نہ ہوتیں۔ تو مجھے اسی ریت اور مٹی پر مر جانا پڑتا۔ کوئی اتنی دور جا کر ایک مرتبہ ہسپتال میں جانے کی بھی کوشش نہ کرتا۔ وہ بات جو تم نے اپنے خط میں لکھی تھی کہ سکھ کے دنوں میں نہ سہی تو دکھ کے دنوں میں مجھے یاد کر لینا۔ یہ بات میری

زندگی باقی تھی اس لیے یاد آ گئی۔ میں اسے اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں۔''

''کر رہے ہو۔''؟

''یقیناً''

''تو پھر کہو کہ میرے ہی لیے تم نے دوبارہ زندگی حاصل کی ہے؟''

''اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔''

تو کیا میں اس پر دعویٰ کر سکتی ہوں؟''

''کر سکتی ہو لیکن میری زندگی اتنی حقیر ہے کہ اس پر تمہیں لالچ کرنا زیب نہیں دیتا۔''

پیاری نے اتنی دیر بعد قدرے ہنس کر کہا...... ''یہ غنیمت ہے کہ اپنی قیمت کو اتنے دنوں میں تم نے سمجھ تو لیا۔'' مگر دوسرے ہی لمحہ سنجیدگی سے کہا...... دل لگی رہنے دو۔ بیماری کا تو ایک طرح سے آرام ہو گیا۔ اب جانے کی کب سوچ رہے ہو؟''

میں اس کے اس سوال کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا۔ میں نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔ کہیں جانے کی تو مجھے جلدی ہے نہیں۔ اس لیے یہی سوچتا ہوں کہ چند دن اور ٹھہر جاؤں؟''

پیاری بولی...... ''لیکن میرا لڑکا آج کل اکثر بانکی پور سے آیا کرتا ہے۔ بہت دن ٹھہرو گے تو وہ شاید کچھ خیال کرنے لگے۔''

میں نے کہا...... ''کرنے دو نا۔ اس سے ڈر کر تو کچھ چلتی نہیں تم؟ ایسا آرام چھوڑ کر یہاں سے جلد ہی تو میں کہیں جاتا نہیں۔''

پیاری نے فکر مند چہرے سے کہا...... ''یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے۔'' کہہ کر وہ یکایک وہاں سے اٹھ کر چل دی۔

دوسرے دن شام کے وقت میں اپنے کمرے کی پچھم کی طرف کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت بنکو آ پہنچا۔ ابھی تک اس کے ساتھ اچھی طرح کھل کر بات چیت کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے میں نے کہا ...... ''بنکو کیا پڑھتے ہو تم؟''

لڑکا نہایت سیدھا سادہ اور نیک تھا بولا...... ''گذشتہ سال میں نے انٹرنس پاس کیا ہے''

''تو اب بانکی پور کالج میں پڑھتے ہو؟''

''جی ہاں''

''تم کتنے بھائی بہن ہو؟''

"بھائی اور نہیں ہے، چار بہنیں ہیں۔"

"ان کی شادی ہوگئی؟"

"جی ہاں، ماں نے ہی ان کی شادیاں کی ہیں۔"

"تمہاری اپنی ماں زندہ ہے؟"

"جی ہاں وہ دیش کے مکان میں رہتی ہیں۔"

"تمہاری یہ ماں، کبھی دیش کے مکان میں گئی ہیں؟"

"بہت مرتبہ، ابھی تو پانچ چھ مہینے ہوئے آئی ہیں۔"

"اس پر وہاں کوئی گڑبڑی نہیں مچتی؟"

بنکو کچھ دیر خاموش رہ کر بولا...... "مچتی رہے، ہم لوگوں کو ذات برادری سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ تو کیا ہم اس ڈر سے اپنی ماں کو چھوڑ سکتے ہیں اور ایسی ماں بھی کتنے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔"

منہ میں آیا کہ پوچھوں۔ "ماں پر اتنی عقیدت ہوئی کیسے؟" لیکن دبا گیا۔ بنکو کہنے لگا۔ "اچھا آپ ہی بتایئے کہ گانے بجانے میں کیا کوئی برائی ہے۔ ہماری ماں محض وہی کرتی ہے کچھ غیروں کی غیبت یا برائی چرچا تو کرتی نہیں۔ بلکہ گاؤں میں جو لوگ ہمارے کٹر مخالف ہیں ان کے آٹھ دس لڑکوں کو پڑھائی لکھائی کا خرچ دیتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں کتنے ہی لوگوں میں کپڑے تقسیم کرتی ہیں۔ کمبل دیتی ہیں۔ یہ کیا برائی کرتی ہیں؟"

میں نے کہا...... "نہیں یہ تو بہت ہی نیک کام ہے۔"

بنکو نے استقلال سے کہا...... "تو کہیے کہ ہمارے گاؤں کی طرح پاجی گاؤں کیا اور کوئی ہوگا۔ یہی دیکھو نا، اس سال اینٹ پکوا کر ہم لوگوں نے مکان بنوایا۔ گاؤں میں پانی کی قلت اور تکلیف کو مدنظر رکھ کر میری ماں موسی سے بولیں...... "جیجی اور کچھ روپے خرچ کر کے اینٹ پکانے کے بھٹے کی جگہ ہی ایک تالاب بنوا دیا جائے۔ تین چار ہزار روپے خرچ کر کے تالاب بنوا دیا۔ گھاٹ بھی بندھوا دیا۔ لیکن گاؤں کے لوگوں نے ماں کو اس تالاب کی پرتشٹھا (رسم افتتاحی) نہ کرنے دی۔ ایسا عمدہ پانی مگر کوئی پیتا نہیں، کوئی چھوتا نہیں۔ ایسے بدذات آدمی ہیں۔ صرف اسی حسد کے مارے سب لوگ مرے جا رہے ہیں کہ ہمارا مکان پختہ بن گیا۔ آپ سمجھے نا؟"

میں نے حیرت سے کہا...... "کہتے کیا ہو جی۔ پانی کی اتنی سخت تکلیف کو برداشت کرتے ہیں لیکن ایسا عمدہ پانی پیتے نہیں۔"

بنکو نے ذرا ہنس کر کہا...... "وہی تو، مگر یہ کیا زیادہ دیر تک چل سکتا ہے؟ پہلے سال تو ڈر کے

مارے کسی نے پانی چھوا نہیں۔ لیکن اب چھوٹی ذات کے سب لوگ لیتے ہیں اور پیتے ہیں۔ برہمن اور کائستھ بھی چیت بیساکھ کے مہینے میں چھپ چھپا کر پانی لے جاتے ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے تالاب کی پرتشٹھا ہونے نہیں دی۔ یہ بات کیا ماں کے لئے کم تکلیف کی بات ہے؟"

میں نے کہا۔ 'اپنی ناک کاٹ کر غیر کی بدشگونی کرنا، جو کہاوت سنی جاتی ہے وہ یہی ہے؟

بنکو زور سے بول اٹھا...... "ٹھیک یہی بات ہے۔ ایسے گاؤں میں علیحدہ ایک گھر میں رہنا بددعا ہوتے ہوئے بھی دعا کی طرح ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟" جواب میں میں نے بھی صرف ہنس کر سر ہلا دیا۔ ہاں یا نہیں، صاف طور پر کچھ بھی نہ کہا لیکن اس سے بنکو کے جوش میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکا اپنی اس ماں کو سچ مچ ہی پیار کرتا ہے۔ معقول سننے والا ملنے پر عقیدت کے جوش میں وہ دیکھتے دیکھتے پاگل ہوا اٹھا۔ اس کی پیہم ثناخوانی نے مجھے تقریباً بے صبر بنا دیا۔

ناگاہ اسے ہوش آیا کہ اتنی دیر میں میں نے اس کی ایک بات میں ساتھ نہیں دیا تو وہ کچھ متفکر سا ہو کر کسی طرح سلسلہ کو بدل دینے کی غرض سے بولا...... "آپ ہاں اور بھی کچھ دن ہیں نا؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "نہیں کل صبح چلا جاؤں گا۔"

"کل ہی"

"ہاں کل ہی"

"لیکن آپ کا جسم تو ابھی تک کمزور رہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بیماری یکبارگی چلی گئی؟"

میں نے کہا...... "صبح تک تو میں یہی سمجھتا تھا کہ بیماری چلی گئی۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ نہیں، آج دوپہر سے ہی میرا سر درد کر رہا ہے؟"

"تو پھر کیوں اتنی جلدی جا رہے ہو۔ یہاں تو آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر وہ لڑکا فکرمند چہرے سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی کچھ دیر خاموش رہ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے اندرونی جذبات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جتنا بھی میں نے اسے پڑھا اس کی طرف سے حقیقت کو چھپانے کی کوئی بھی کوشش میں محسوس نہ کر سکا۔ اس لئے لڑکا ضرور شرما گیا اور اس شرم کو ڈھانپنے کی بھی اس نے کوشش کی وہ بولا...... "آپ یہاں سے مت جایئے۔"

"کیوں نہ جاؤں۔" بتاؤ

"آپ کی موجودگی میں ماں خوب سکون اور سکھ سے رہتی ہیں۔ یہ کہہ تو دیا لیکن اس کا چہرہ سرخ ہو اٹھا۔ وہ فوراً اٹھ کر چل دیا۔ میں نے دیکھا، لڑکا نہایت بھولا اور معصوم مزاج کا ضرور ہے لیکن

بے وقوف نہیں ہے۔ پیاری نے کہا تھا کہ ''اور زیادہ دن ٹھہرو گے تو میرا لڑکا کیا خیال کرے گا؟'' اس بات کے ساتھ اس لڑکے کے رویہ کا مقابلہ کرنے کا مطلب بھی گویا میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اور ماں کے احترام کی ایک نئی تصویر کو دیکھ کر ایک نیا تجربہ ہوا۔ پیاری کے دل کی یکسوئی کا اندازہ کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں اور وہ اس لامحدودیت کائنات میں ہر طرف سے آزاد ہے۔ یہ تصور کر لینا بھی میری رائے میں کوئی گناہ نہیں تاہم اس نے جس ساعت سے ایک غریب لڑکے کی ماں بننا بخوشی تمام منظور کیا ہے اسی وقت سے اس نے اپنے دونوں پاؤں کو آہنی زنجیروں سے جکڑ لیا ہے۔ وہ خود خواہ جو بھی ہو لیکن اسے اپنے تئیں ماں کے احترام کا ثبوت تو اب دنیا کو دینا ہی ہوگا۔ اس کی دلی آرزوئیں، ذہنی کاوشیں اسے خواہ گراوٹ کی طرف کیوں نہ دھکیلنا چاہیں لیکن یہ بات بھی تو اسے فراموش نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک لڑکے کی ماں ہے اور اس اولاد کی عقیدت بھری نگاہ کے سامنے تو وہ اس ماں کو کسی طرح بھی بے عزت نہ ہونے دے گی۔ اس کے بے قرار شباب کی پر کیف بہار کے ایام میں پیار کے ساتھ کس نے اس کا نام پیاری رکھا تھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ نام بھی وہ اپنے لڑکے کے سامنے چھپا رکھنا چاہتی ہے۔ یہ بات مجھے یاد آ گئی۔ دیکھتے دیکھتے آفتاب غروب ہو گیا۔ اس طرف تاکتے ہوئے میرا تمام دل پگھل کر سرخ ہو اٹھا۔ دل ہی دل میں کہا کہ راج لکشمی کو اب تو میں نیچی نظروں سے دیکھ نہیں سکتا۔ ہم دونوں کا ظاہرہ برتاؤ اتنے دنوں تک خواہ کتنی ہی ظاہرداری کی حفاظت کرتے ہوئے کیوں نہ گزرا ہو، ہماری محبت خواہ کتنا ہی کیف کیوں نہ ہو برسائے لیکن اس میں بھی تو کوئی گنجائش نہیں کہ ہم دونوں کے ارمان باہم ایک جا اکٹھے ہونے کے لیے ہر گھڑی ایک دوسرے کی طرف نہایت سرعت سے دوڑ رہے ہیں۔ مگر آج میں نے دیکھا کہ یہ ناممکن ہے۔ ناگہاں بنکو کی ماں، فلک بوس ہمالیہ کی طرح راستہ روک کر راج لکشمی اور میرے درمیان آ کھڑی ہے۔ دل ہی دل میں میں نے کہا کل صبح ہی تو میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل میں نفع اور نقصان کا حساب لگاتے ہوئے کچھ جمع رکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میری یہ دعا آخری دعا ہی ہو۔ دیکھ نہ سکنے کا بہانہ کر کے ایک لطیف جذبے کا بندھن میں یہاں نہ چھوڑ جاؤں جس کا سہارا لے کر پھر کبھی مجھے یہاں آنا پڑے۔

ہمہ تن محو اسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ شام کو دھوپ دانی ڈال کر اسے اپنے ہاتھوں میں لئے راج لکشمی اسی برآمدے میں سے ایک کمرے میں جا رہی تھی کہ دفعتہً چونک کر کھڑی ہو گئی اور بولی..... ''سر درد کر رہا ہے۔ اوس میں کیوں بیٹھے ہو؟ کمرے میں جاؤ۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا..... ''لاجواب کر دیا تم نے لکشمی، اوس کہاں ہے؟''

راج لکشمی بولی..... ''اوس نہ سہی، سرد ہوا تو چل رہی ہے۔ وہ کیا اچھی ہوتی ہے؟''

لیکن یہ تمہاری بھول ہے۔ سرد یا گرم کوئی بھی ہوا نہیں چل رہی ہے۔''

راج لکشمی بولی..... ''میری تو سب بھول ہی بھول ہے لیکن سر درد کر رہا ہے یہ تو میری بھول نہیں ہے۔ یہ تو سچ ہے نا؟ کمرے میں جا کر تھوڑی دیر سو رہو۔ رتن کیا کرتا ہے۔ وہ کیا تھوڑا سا ''اوڈ کولون'' سر میں نہیں لگا سکتا؟ اس گھر کے نوکر چاکروں کی طرح نواب نوکر دنیا بھر میں اور کہیں ہیں۔'' اتنا کہہ کر راج لکشمی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رتن جب گھبرا کر اور قدرے شرمسار ہو کر ''اوڈ کولون'' پانی وغیرہ لے کر حاضر ہوا اور اپنی غلطی کے لیے بار بار افسوس ظاہر کرنے لگا تو مجھ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رتن نے کچھ حوصلہ پا کر آہستہ آہستہ کہا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے بابو جی، اتنا بھی میں کیا نہیں جانتا؟ لیکن ماں سے یہ کہنے کا چارہ نہیں کہ جب تمہیں غصہ آتا ہے تو جھوٹ موٹ ہی گھر بھر کے لوگوں پر الزام لگانا شروع کر دیتی ہو۔''

بے قرار ہو کر میں پوچھ بیٹھا..... ''غصہ کیوں ہے؟''

رتن بولا..... ''یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں؟ بڑے لوگوں کو غصہ، بابو جی، یونہی آ جاتا ہے اور یونہی چلا جاتا ہے۔ اس وقت اگر اپنا منہ چھپا کر نہ رہا جائے تو نوکر چاکروں کی جان گئی سمجھو۔'' دروازے کے سامنے سے کسی نے کہا..... ''پھر تو میں تمہارے سر کاٹ لیتی ہوں، کیوں رتن؟ اور پھر بڑے لوگوں کے گھر میں اگر اتنی مصیبت ہے تو پھر اور کہیں کیوں نہیں چلا جاتا؟''

مالک کے استفسار سے رتن شرمندہ ہو کر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ راج لکشمی نے کہا..... ''تیرا کام کیا ہے؟ ان کا سر درد کرتا ہے۔ بنکو کی زبانی سن کر میں نے تم سے کہا۔ اس لیے جب رات کے آٹھ بجے یہاں آ کر میری تعریف کر رہا ہے۔ کل سے کہیں اور نوکری تلاش کر لینا..... اب یہاں کام نہیں ہے سمجھا؟''

راج لکشمی کے چلے جانے پر رتن، اوڈ کولون، پانی ملا کر میرے سر پر رکھ کر ہوا کرنے لگا۔ راج لکشمی نے اسی لمحہ لوٹ کر پوچھا..... ''کیا کل صبح ہی گھر جاؤ گے؟'' میرا جانے کا ارادہ ضرور تھا، لیکن گھر لوٹ جانے کا نہیں۔ اس لیے سوال کا جواب میں نے اور ہی طرح سے دیا۔

''ہاں کل صبح ہی جاؤں گا۔''

''صبح کتنے بجے کی گاڑی سے جاؤ گے؟''

''صبح ہی نکل پڑوں گا۔ پھر جو بھی گاڑی مل جائے۔''

''اچھا نہ ہو تو ٹائم ٹیبل کے لیے کسی کو اسٹیشن بھیج دیتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کے بعد رتن بروقت کام ختم کر کے چلا گیا۔ نیچے سے نوکر چاکروں کے بولنے کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں نے

سمجھ لیا کہ سب لوگ سونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

لیکن مجھے کسی طور نیند نہ آئی۔ گھوم پھر کر صرف ایک ہی بات بار بار دل میں آنے لگی کہ پیاری ناراض کیوں ہوگئی ہے ایسا میں نے کیا کیا ہے جس سے وہ مجھے روانہ کرنے کے لیے بے صبر ہو اٹھی ہے۔ رتن نے کہا تھا کہ بڑا آدمیوں کو غصہ یونہی آ جایا کرتا ہے یہ بات اور بڑے آدمیوں کے متعلق خواہ ٹھیک ہے یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن پیاری کے متعلق کسی طرح بھی ٹھیک نہیں اترتی۔ وہ تو نہایت نفس کش اور دانا عورت ہے۔

اس کا مجھے کئی بار تجربہ ہو چکا ہے اور مجھ میں خواہ اور کوئی عقل نہ ہو لیکن ضبط کے معاملہ میں ان سے کم نہیں ہوں اور میرا تو خیال ہے کہ کسی سے بھی کم نہیں ہوں۔ میرے دل میں خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اسے زبان سے نکالنا نہایت سخت قسم کی بے ہوشی میں بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ خود اس کے کسی فعل سے مجھے شرم محسوس ہوئی ہو یہ علیحدہ بات ہے لیکن اس کو مجھ پر غصہ ہونے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ اس لئے وداع کے وقت اس کی یہ بے اعتنائی مجھے نا قابل برداشت معلوم ہوئی۔

☆☆☆

بہت رات گزر جانے پر یکا یک نیند چٹ گئی اور میں نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ راج لکشمی چپ چاپ کمرے میں آئی اور میز کا لیمپ بجھا کر اسے دروازے کے کونے کی آڑ میں رکھ دیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اسے بند کر کے میری چارپائی کے نزدیک آ کر آن واحد کے لیے چپ کھڑی رہ کر اس نے کچھ سوچا۔ اس کے بعد مسہری کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے پہلے میرے سر کا بخار دیکھا پھر کرتے کے بٹن کھول کر چھاتی کے بخار کو بار بار دیکھنے لگی۔ خلوت میں آنے والی عورت کے اس پوشیدہ لمس سے پہلے تو میں کچھ شرمندہ سا ہوا لیکن اسی وقت دل میں آیا کہ مرض کی بے ہوشی کے دوران میں تیمارداری کر کے جس نے زندگی کو واپس لا کر دیا تھا اس کے نزدیک مجھ سے شرم کرنے کی بات ہی کیا ہے؟ اس کے بعد اس نے بٹن بند کر دیئے۔ اوڑھنے کا کپڑا کھسک گیا تھا۔ اسے گلے تک اوڑھا دیا اور بالآخر مسہری کے کناروں کو اچھی طرح درست کر کے نہایت احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کر کے وہ باہر چلی گئی۔

میں نے سب کچھ دیکھا اور سب کچھ سمجھا۔ جو چھپے چھپے آئی تھی اسے چھپے چھپے ہی جانے دیا لیکن اس سنسان آدھی رات کو وہ اپنا کتنا میرے پاس چھوڑ گئی۔ اس کا وہ کچھ بھی اندازہ نہ کر سکی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو بخار چڑھا ہوا تھا۔ آنکھیں اور منہ جل رہا تھا۔ سر اتنا بھاری تھا کہ بستر چھوڑتے مجھے کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر بھی جانا ہی ہوگا۔ اس گھر میں اب مجھے اپنے آپ پر ذرا سا بھی اعتبار نہ تھا۔ نامعلوم وہ کس گھڑی دھوکہ دے جائے اور یہ خوف مجھے اپنے لئے اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن راج لکشمی کے

لیے مجھے راج لکشمی کو چھوڑ جانا پڑے گا۔ اس میں اب پس و پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

دل ہی دل میں سوچ کر دیکھا کہ اس نے اپنی گنہگار زندگی کے بدنما داغوں کو بہت کچھ دھو کر صاف کر ڈالا ہے۔ آج لاتعداد لڑکے بچے ماں ماں کہتے ہوئے اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں۔ اس عقیدت اور پیار کی مسرت سے بھرپور مقام سے اسے بے عزتی کے ساتھ چھین کر باہر نکال لاؤں۔ اتنے عظیم پیار کی کیا یہی آخری نشانی میری زندگی میں مرقوم ہے۔

پیاری نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا...... ''اس وقت طبیعت کیسی ہے؟''

میں بولا...... ''ایسی کچھ خاص خراب نہیں ہے۔ جا سکوں گا۔''

''نہیں آج تو جانا ہی چاہئے۔''

''تو پھر گھر پہنچتے ہی خبر دینا۔ ورنہ ہم لوگوں کو بہت تشویش رہے گی۔''

اس کے بے پناہ استقلال کو دیکھ کر میں فریفتہ ہوا تھا۔ اسی لمحہ بولا ''اچھا میں گھر ہی جاؤں گا اور پہنچتے ہی تمہیں اطلاع دوں گا۔''

پیاری نے کہا...... ''ضرور دینا۔ میں بھی خط لکھ کر تم سے ایک دو باتیں دریافت کروں گی۔''

جب میں باہر پالکی میں بیٹھنے جا رہا تھا تو دیکھا کہ دوسری منزل کے برآمدے میں پیاری چپ چاپ کھڑی ہے۔ اس کے سینے کے اندر کیا ہو رہا ہے اس کا چہرہ دیکھ کر میں جان نہ سکا۔

مجھے اپنی ان داجیجی کی یاد آ گئی۔ بہت عرصہ پہلے ایک آخری دنوں بھی بالکل ایسی ہی سنجیدہ ایسی ہی خاموش کھڑی تھیں۔ اس وقت کی ان کی دونوں درد بھری آنکھوں کا نگاہوں کو تو میں آج تک بھی نہیں بھولا۔ لیکن اس نظر میں قریبی جدائی کی کتنی بڑی بے تابی ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ کیا جو آج بھی ان دو کالی آنکھوں میں اس طرح کا کچھ ہے یا نہیں۔

آہ بھر کر میں پالکی میں جا بیٹھا۔ دیکھا محبت صرف پاس ہی نہیں کھینچتی دور بھی دھکیل دیتی ہے۔ چھوٹی موٹی محبت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ عیش و نشاط سے معمور اس رشک فردوس سے مجھے، میری بہتری کے لیے میری بہبودی کے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھانے دیتی۔ کہار پالکی لے کر اسٹیشن کی طرف جلدی سے چل دیئے۔ دل ہی دل میں بار بار یہی کہنے لگا کہ لکشمی غم مت کرنا یہ اچھا ہی ہوا کہ میں یہاں سے چل دیا۔ تمہارا قرض اس زندگی میں ادا کرنے کی طاقت تو مجھ میں نہیں ہے لیکن جو زندگی تم نے عطا کی ہے اس زندگی کا غلط استعمال کر کے تمہاری توہین نہ کروں گا...... تم سے دور رہتے ہوئے میں اس عہد کو برقرار رکھوں گا۔

اس بدنصیب زندگی کے جس باب کو اس دن راج لکشمی کے پاس آخری وداع کے وقت آنکھوں کے پانی میں ختم کر کے آیا تھا...... یہ خیال نہیں تھا کہ اس ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو از سر نو جوڑنے کے لیے پھر میری طلبی ہوگی لیکن جب فی الحقیقت میری طلبی ہوئی تو سمجھ لیا کہ حیرت اور جھجک خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو لیکن اس دعوت کو سر تسلیم خم کر کے قبول کیے بغیر کام نہ چلے گا۔

اس لیے آج بھی میں اپنی ناکارہ زندگی کے منتشر واقعات کو سینکڑوں جگہ سے بکھری ہوئی باتوں کو پھر ایک بار باندھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آج مجھے یاد آتا ہے کہ گھر لوٹ آنے کے بعد میری رنج و راحت سے ملی جلی زندگی کو کس نے یکا یک کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وقت خیال ہوا تھا کہ میری اس زندگی کے دکھوں کا بوجھ صرف میرا ہی نہیں ہے۔ اس بوجھ کو لاد کر تو وہ گھومے جس کو اس کی خاص غرض ہو۔ یعنی میں ترس کھا کر اگر بچ گیا تو یہ راج لکشمی کی خوش نصیبی ہے۔ آسمان کا رنگ کچھ اور ہی نظر آنے لگا تھا۔ ہوا کا لمس کچھ اور ہی قسم کا معلوم ہونے لگا تھا۔

گویا اب اپنا پرایا، گھر بار کہیں بھی اپنا کوئی نہ رہا۔ اس قسم کی ایک بے لطفی اندر باہر محیط ہو رہی تھی۔ کائنات میں گھورتے ہوئے، کہیں کچھ کرتے ہوئے پس و پیش یا جھجک کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

یہ سب گزرے ہوئے زمانہ کی باتیں ہیں۔ وہ مسرت اب کہاں ہے؟ لیکن اس دن دل کی خلوتوں میں پوشیدہ اس مسرت انگیز کیف سے زندگی میں ایک دن کے لیے لطف اندوز ہو سکا۔ یہی میرے لئے سب سے بڑی خوشی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ میں نے اسے کھو دیا۔ اس کا بھی مجھے کسی دن غم نہ ہوا محض یہی بات گاہے بگاہے یاد آتی ہے کہ جس طاقت نے اس وقت دل کے اندر بیدار ہو کر اتنی جلد دنیا بھر کی بے لطفی کے اثر کو زائل کر دیا تھا وہ کتنی عظیم طاقت ہے۔ اور سوچتا ہوں کہ اس دن اپنی ہی طرح دوسرے دو کمزور اور خالی ہاتھوں پر اپنا بڑا اہم بار نہ ڈال کر اگر میں تمام مخلوق کی حفاظت کرنے والے ان ہاتھوں پر ہی اس دن اپنے لازوال اعتقاد کی تمام تر ذمہ داریاں سونپ دیتا تو آج مجھے فکر ہی کیا تھی؟ لیکن اب چھوڑیئے اس بات کو۔

راج لکشمی کو میں نے اپنی رسید کا خط لکھا تھا۔ اس خط کا جواب کافی دنوں بعد ملا۔ میرے کمزور اور مریض جسم پر غم اور ہمدردی کا اظہار کر کے گرہستی (خانہ دار) بننے کے لیے اس نے مجھے طرح طرح کی نصیحتیں کی تھیں اور اپنے مختصر خط کو یہ لکھ کر ختم کیا تھا کہ اگر وہ کام کاج کے جھنجھٹوں کی وجہ سے خط وغیرہ لکھنے کا موقعہ نہ پا سکے تو بھی میں گاہے گاہے اپنی خیریت کی اطلاع اسے دیتا رہوں اور اسے اپنا ہی سمجھوں۔

دنیائے تصور میں فردوس کے جو پھول جمع رکھے تھے وہ وہیں خشک ہو گئے اور جو دو ایک سوکھی پنکھڑیاں ہوا سے جھڑ پڑیں۔ انہیں اکٹھا کر کے گھر لے جانے کے لئے بھی میں جگہ ٹٹولتا نہیں پھرا۔ آنکھوں میں دو ایک بوند پانی آیا ہو بھی مگر وہ مجھے یاد نہیں۔ تاہم یہ یاد ہے کہ اور زیادہ دن میں نے خواب دیکھتے ہوئے نہ کاٹے پھر بھی پانچ چھ مہینے اسی طرح بسر ہو گئے۔

ایک دن صبح باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکا یک ایک عجیب و غریب خط آ پہنچا۔ اوپر نسوانی تحریر کے سے کچے الفاظ میں نام اور پتہ لکھا تھا۔ کھولتے ہی اندر سے ایک چھوٹا سا خط کھٹ سے زمین پر گر پڑا۔ اسے اٹھا کر اور اس کے الفاظ کی بناوٹ اور دستخط دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔ میری جو ماں دس سال قبل مر چکی تھیں۔ انہیں کے یہ دستخط تھے نام اور حروف کی بناوٹ بھی ان ہی کی تھی۔ پڑھ کر دیکھا۔ ماں نے اس خط میں اپنی گنگا جل کو ممکن الوقوع یقین دلایا تھا اور عہد کیا تھا۔ بات غالباً یہ تھی کہ بارہ تیرہ سال پہلے اس گنگا جل کے ہاں جب کافی زیادہ عمر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو پریشانی، گھبراہٹ، اور اپنی مشکلات بیان کر کے اس نے ماں کو خط لکھا ہوگا۔ اور اسی کے جواب میں انجہانی ماں نے اس گنگا جل کی لڑکی کے بیاہ کی تمام ذمہ داری لے کر جو خط لکھا تھا وہی یہ بیش قیمت دستاویز تھی۔ فوری دکھ اور ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر ماں نے لکھا تھا کہ اگر کوئی قابل لڑکا نہ ملے تو پھر خود ان کا بیٹا تو ہے ہی، ...... ٹھیک ہے، دنیا میں اگر قابل لڑکوں کا بالکل ہی فقدان ہو جائے تو پھر میں تو ہوں ہی۔ تمام خط اوپر سے نیچے تک دوبارہ پڑھ کر میں نے دیکھا کہ وہ منشیانہ طرز سے لکھا گیا ہے۔ ماں کو وکیل ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس قدر بھی گنجائش کی وجوہات ہو سکتی تھیں ان سب کی راہ بند کر کے اپنے آپ کو اور اپنے نام لیوا کو باندھ گئی ہیں۔ اس سے بچنے کے لیے دستاویز میں کہیں ذرا سی بھی جگہ، ذرا سی بھی کمی چھوڑی نہیں گئی ہے۔

وہ خواہ جو بھی ہو لیکن مجھے ایسا معلوم تو نہ ہوا کہ گنگا جل، ان طویل تیرہ سالوں تک اس پختہ

دستاویز کے بھروسہ پر ہی بے خوف ہو کر بیٹھی رہی ہے لیکن اس کے بالکل برعکس جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ کافی کوشش کرنے کے باوجود بھی روپیے اور اپنے نجی آدمیوں کی کمی کے باعث کوئی قابل لڑکا ملنا اسے مشکل ہو گیا اور کنواری لڑکی کی جسمانی ترقی کی طرف دیکھ کر ان کے دل کا خون دماغ میں چڑھنے کی تیاری کرنے لگا تو اس بدنصیب قابل لڑکے پر انہوں نے اپنا واحد برہم استر (حربہ) پھینکا ہے۔

ماں اگر زندہ ہوتیں تو اس خط کے لیے میں ان کا سر کھا جاتا۔ تو آج ان کے پاؤں کے تلوؤں پر زور سے سر پٹک کر اپنے دل کے شعلوں کو ٹھنڈا کروں...... یہ راستہ بھی میرے لیے بند ہے۔

اس لیے ماں کے لیے تو میں کچھ بھی کر نہ سکا مگر اب ان کے گنگا جل کے لیے بھی کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں اس کی آزمائش کرنے کے لیے میں ایک دن رات کو اسٹیشن پر جا پہنچا۔ تمام رات ٹرین میں گزار کر دوسرے دن جب ان کے گاؤں کے مکان پر پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ گنگا جل ماں پہلے تو مجھے پہچان نہ سکیں بالآخر میرا پتہ پا کر ان تیرہ سالوں کے بعد بھی وہ اس طرح رو پڑیں جس طرح ماں کی موت کے وقت ان کا کوئی اپنا آدمی بھی آنکھوں کے سامنے ان کی موت ہوتے دیکھ کر بھی نہ رو سکا ہوتا۔

وہ بولیں کہ دنیاوی نقطہ نگاہ اور دھرم کے خیال سے دونوں ہی طرح اب میں تمہاری ماں کی طرح ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے ذمہ داری سنبھالنے کے پہلے زینہ کی شکل میں میری دنیاوی پوزیشن کی نہایت باریکی کے ساتھ چھان بین شروع کر دی۔ باپ کتنا چھوڑ گئے ہیں؟ ماں کے پاس کون کون سے زیور ہیں اور وہ کس کے پاس ہیں میں ملازمت کیوں نہیں کرتا اور اگر کروں تو اندازاً کتنی ماہوار مل سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ...... ان کی صورت دیکھ کر خیال ہوا کہ اس تحقیقات کا نتیجہ ان کے لیے قابل اطمینان نہیں نکلا۔ وہ بولیں کہ ان کا ایک رشتہ دار برما میں نوکری کر کے مالا مال ہو گیا ہے۔ وہاں تو راہ گھاٹ میں دولت بکھری پڑی ہے۔ صرف سمیٹنے کی ضرورت ہے۔ وہاں تو جہاز سے اترتے ہی بنگالیوں کو صاحب لوگ کندھے پر اٹھا لے جاتا ہیں اور نوکری پر لگا دیتے ہیں...... اس قسم کی بہت سی باتیں کہیں بعد میں میں نے دیکھا کہ یہ غلط اندازہ محض اکیلے انہیں کا نہیں بلکہ بہت سے لوگ اس سراب میں پھنس کر نہایت سمپرسی کے عالم میں وہاں دوڑ گئے ہیں اور اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی انہیں واپس لوٹنے میں ہم لوگوں کو کم مصیبت برداشت کرنا نہیں پڑی لیکن اس ذکر کو اس وقت رہنے دیجئے۔ گنگا جل ماں کی زبانی برما کا تذکرہ مجھے تیر کی طرح لگا۔ مالا مال ہونے کی امید سے نہیں بلکہ میرے اندر کچھ عرصہ سے جو گھمکڑ پن محو خواب تھا وہ اپنی تھکاوٹ جھاڑ پونچھ کر آن واحد میں ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ جس سمندر کو اس سے پہلے صرف دور سے کھڑے دیکھ کر مسحور ہو جاتا تھا اس بحر بیکراں کا سینہ چیر کر میں جا سکوں گا...... اس خواہش نے ہی مجھے یکبارگی بے قرار کر دیا۔ تو پھر کسی طرح ایک بار چھٹکارا حاصل کرنا ہی ہو گا۔

ایک انسان دوسرے انسان سے جتنی قسم کی بھی جرح کر سکتا ہے ان میں سے کسی بھی قسم کی جرح سے گنگا جل ماں نے مجھے نہ چھوڑا اور بالآخر اپنی لڑکی کے قابل در کے نقطہ نظر سے مجھے نجات دے دی...... اور اس کے متعلق میں ایک طرح سے مطمئن ہو گیا۔ لیکن رات کو کھانا کھاتے وقت ان کی تمہید کا جھکاؤ دیکھ کر میں بے صبر ہو اٹھا۔ دیکھا کہ مجھے ہاتھ سے بالکل چھوڑ دینے کی ان کی خواہش نہیں انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ لڑکی کی قسمت میں سکھ نہ ہو تو دھن دولت، گھر بار، عزت آبرو کتنا ہی کیوں نہ دیکھا جائے سب بیکار ہے اور اس سلسلہ میں نام اور مقام دے کر تفصیل کے ساتھ بہت سی قابل اعتبار مثالیں دے کر انہوں نے اس بات کو ثابت بھی کر دکھایا، اتنا ہی نہیں اس کے برعکس ایسے بھی کتنے ہی لوگوں کا ذکر کیا کہ جو جاہل مطلق ہوتے ہوئے بھی محض بیوی کی خوش نصیبی کی بدولت اس وقت دولت کے انبار پر دن رات بیٹھے رہتے ہیں۔

میں نے التجا آمیز لہجہ میں کہہ دیا کہ روپے پیسے کی طرف میری رغبت تو ہے تاہم مجھے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ چوبیسوں گھنٹے ان پر بیٹھا رہوں۔ اور اس کے لیے بیوی کی خوش نصیبی آزمانے کو بے قراری بھی نہیں لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ انہیں میں قائل نہ کر سکا کیونکہ جو عورت تیرہ سال کی طویل اور صبر آزما مدت کے بعد بھی ایک خط کو دستاویز کی شکل میں پیش کر سکتی ہے اسے اتنی آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ بار بار کہنے لگیں کہ اس کو ماں کے قرض کی شکل میں قبول کرنا ہی مناسب ہے اور جو اولاد قابل ہوتے ہوئے بھی والدین کا قرض ادا نہیں کرتی وہ وغیرہ وغیرہ۔

جب میں بہت متفکر اور بے قرار ہو اٹھا تو باتوں ہی باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ قریب کے گاؤں میں اگرچہ ایک قابل لڑکا ہے لیکن پانچ سو سے کم روپے میں اس کا ملنا مشکل ہے۔

دھندلی سی امید کی ایک کرن نظر آئی۔ مہینے کے بعد جس طرح بھی ممکن ہوا کوئی چارہ کروں گا...... یہ وعدہ کر کے میں دوسرے ہی دن وہاں سے چل دیا لیکن چارہ کیا کروں گا کسی طرف بھی اس کا کوئی کنارا نظر نہ آیا۔

میں کئی طرح سے اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ اس طرح زبردستی لدا ہوا بوجھ میرے لیے کوئی حقیقی بوجھ نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی ماں کو اپنے کیے ہوئے عہد سے آزاد کیے بغیر چپ چاپ کھسک جانے کا مجھے کسی طرح خیال بھی نہ آ سکا۔

شاید ایک چارہ کار تھا...... میں یہ بات پیاری سے کہوں لیکن کئی دنوں تک میں خود اس کے متعلق اپنے دل کو مستحکم نہ کر سکا۔ ایک عرصہ سے اس کی کوئی اطلاع بھی نہ ملی تھی۔ رسید کی اس اطلاع کے علاوہ میں نے اسے اور کوئی خط بھی نہ لکھا تھا۔ اس نے بھی اس کے جواب کے سوا دوسرا خط نہ لکھا۔ اس

بات کو شاید وہ تسلیم نہ کرتی تھی کہ خط و کتابت کے ذریعے بھی دونوں کے درمیان ملاپ، کا یہ ایک رشتہ قائم رہتا ہے کم از کم اس کے اس خط سے تو میں یہی سمجھا لیکن تعجب کی بات ہے کہ دوسرے کی لڑکی کے لیے بھیک مانگنے کے بہانہ ایک دن میں سچ مچ پٹنہ جا پہنچا۔

☆☆☆

مکان میں داخل ہوتے ہی نچلی منزل کی بیٹھک کے برآمدہ میں میں نے دیکھا کہ وردی پہنے دو دربان بیٹھے ہیں۔ وہ یکا یک ایک عام اور اجنبی انسان کو دیکھ کر کچھ اس طرح دیکھتے رہ گئے کہ مجھے بلا جھجک اوپر چڑھ جانے کا حوصلہ نہ ہوا میں نے ان دربانوں کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پیاری کے قدیم اور بوڑھے دربان کی جگہ ان دو اور دربانوں کی کیا ضرورت لاحق ہوگئی۔ یہ میں سوچ نہ سکا۔ جو بھی ہو ان کی پرواہ کئے بغیر اوپر چلا جاؤں یا التجا کے ساتھ ان کی اجازت طلب کرو...... یہ فیصلہ کرنے سے پیشتر ہی میں نے دیکھا کہ رتن گھبرا کر نیچے اتر رہا ہے۔ معاً مجھے دیکھ کر وہ پہلے تو حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو گیا لیکن بعد میں پاؤں کی طرف جھک کر پرنام کر کے بولا...... ''آپ کب آئے؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''

''ابھی آ رہا ہوں۔ سب خیریت ہے نا؟''

رتن سر ہلا کر بولا...... ''خریت ہے بابو! اوپر چلیئے...... میں برف خرید کر ابھی آیا۔'' کہہ کر وہ جانے لگا۔

''تمہاری مالکن اوپر ہی ہیں؟''

''ہاں ہیں۔'' کہہ کر وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔

اوپر چڑھتے ہی بغل میں جو کمرہ ملتا ہے وہ نشست گاہ ہے۔ اندر سے ایک زور دار ہنسی اور بہت سے لوگوں کی آواز سنائی دی۔ میں قدرے حیران ہوا مگر دوسرے ہی لحہ دروازے کے نزدیک پہنچ کر میں حواس باختہ ہو اٹھا۔ پچھلی مرتبہ اس کمرے کو استعمال میں آتے نہ دیکھا تھا۔ اس کمرہ میں انواع و اقسام کے ساز و سامان میز کرسی وغیرہ بے شمار چیزیں ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں۔ اس کمرے میں عموماً کوئی آتا بھی نہ تھا۔ آج دیکھتا ہوں تمام کمرے میں بستر ہے اس سرے سے دوسرے سرے تک کارپٹ بچھا ہے اور اس پر سفید چادر چمک رہی ہے۔ تکیوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور ان کے سہارے بیٹھے ہوئے معزز انسان میری طرف غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لباس میں بنگالیوں کی طرح دھوتی ہونے پر بھی سر کی بیل بوٹے دار ٹوپی سے وہ بہاری سے ہی معلوم ہوتے تھے۔ طبلے کی جوڑی کے پاس ایک ہندوستانی طبلوی تھا اور اس کے پاس ہی خود پیاری بائی تھیں۔ ایک طرف چھوٹا ہارمونیم رکھا تھا۔ پیاری کے جسم پر اگرچہ مجرے کی پوشاک نہ تھی۔ تاہم بناؤ سنگار میں کوئی کمی نہ تھی۔ سمجھ

گیا کہ نغمہ کی محفل جمی ہوئی ہے۔ کچھ دیر کے لئے آرام لیا جا رہا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی پیاری کے چہرے کا تمام خون گویا کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے زبردستی کچھ ہنس کر کہا...... ''یہ کیا، شری کانت بابو! کب آئے؟''

''آج ہی''

''آج ہی؟ کب؟ کہاں ٹھہرے ہیں؟''

لحہ بھر کے لیے شاید میں ہوش و حواس گم کر بیٹھا تھا ورنہ جواب میں اتنی تاخیر نہ ہوتی لیکن اپنے آپ کو سنبھالنے میں بھی مجھے دیر نہ لگی۔ میں نے کہا...... ''یہاں کے سب لوگوں کو تو تم پہچانتی نہیں ہو اس لئے نام سن کر بھی تم کیا پہچان سکو گی؟''

جو صاحب سب سے زیادہ بنے ٹھنے بیٹھے تھے وہی شاید اس محفل کی روح رواح تھے بولے...... ''آیئے بابو جی، بیٹھئے'' اتنا کہہ کر اور ہونٹوں کو دبا کر وہ ذرا سا ہنسے اپنے اشاروں اور کنایہ سے انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ ہم دونوں کا تعلق وہ بخوبی طور پر تاڑ گئے ہیں۔ احترام کے ساتھ انہیں مخاطب کر کے میں نے جوتے کے فیتے کھولنے کے بہانے سر نیچا کر کے موقع اور حالات کا جائزہ لینا چاہا۔ غور کرنے کے لیے زیادہ وقت نہ تھا۔ تاہم ان تھوڑے سے لمحوں میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ دل کے اندر خواہ کچھ بھی ہو، ظاہر برتاؤ سے وہ کسی طرح بھی ظاہر نہ ہونا چاہیے۔ میری گفتگو سے، میری آنکھوں کی چتون سے میرے تمام برتاؤ کے کسی بھی سوراخ سے میری دلی پریشانی یا افتخار کی ایک بوند بھی باہر آ کر نہ گرنی چاہیے۔ آن واحد کے بعد جب میں سب کے درمیان جا کر بیٹھا تو اگرچہ یہ سچ ہے کہ اپنے چہرہ کو خود اپنی آنکھوں کو دیکھ نہ سکا لیکن اندر ہی اندر میں نے محسوس کیا اب اس پر ناراضگی کا ذرہ سا بھی نشان باقی نہیں رہا۔ راج لکشمی کی طرف دیکھ کر میں ہنستے ہوئے بولا...... ''بائی جی، اگر آج کہیں سے سکھد یونی کا پتہ پا جاتا تو انہیں تمہارے سامنے بیٹھا کر ایک دفعہ ان کے من کے سکون کی اتھاہ ضرور لیتا۔ ارے یہ کیا کیا ہے۔ حسن و جمال کا ایک سمندر ہی بہا دیا ہے۔''

تعریف سن کر وہ حضرت مسرور ہو کر سر ہلانے لگے۔ وہ پرنیا ضلع کے رہنے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بول نہ سکنے کے باوجود بھی وہ بنگالی اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔

لیکن پیاری کے کان تک سرخ ہو اٹھے۔ اور مجھے یہ سمجھنا بھی باقی نہ رہا کہ سب کچھ شرم و حیا کے مارے نہیں بلکہ غصے کی وجہ سے ہی ہوا ہے مگر اس طرف نگاہ کئے بغیر میں نے بابو صاحب کو مخاطب کر کے کہا...... ''میرے آنے کی وجہ سے آپ لوگوں کے شغل و تفریح میں کسی طرح کی رکاوٹ ہو گی تو مجھے نہایت افسوس ہو گا تو مجھے نہایت افسوس ہوگا رقص و نغمہ چلنے دیجئے۔''

بابو جی اس قدر مسرور ہوئے کہ جوش میں آ کر میری پیٹھ پر ایک دھول جما کر بولے......

''بہت اچھا بابو!......ہاں پیاری بی بی، ایک عمدہ سا گانا چلنے دو۔''

''شام کے بعد ہو گا......بس اب اور نہیں۔'' یہ کہہ کر پیاری ہارمونیم کھسکا کر دفعتہً اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی وقت بابو میرا تعارف حاصل کرنے کے لیے اپنا تعارف کرانے لگے۔ ان کا نام تھا رام چندر سنگھ۔ وہ پرنیا ضلع کے ایک زمیں دار تھے۔ وہ بھنگر مہاراج ان کے نزدیکی ہیں۔ پیاری بی بی کو وہ سات آٹھ سال سے جانتے ہیں وہ ان کے پرنیا کے مکان پر تین چار مرتبہ مجرا کر آئی ہیں۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ گانے سننے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کبھی کبھی دس بارہ دن تک بھی یہاں رہتے ہیں۔ تین مہینے پہلے ایک دفعہ آ کر وہ ایک ہفتہ تک یہاں رہ گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ لیکن میرے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی پیاری، وہاں آ موجود ہوئی۔ ان کی طرف دیکھ کر میں نے کہا......''بائی جی سے ہی پوچھئے نا کہ کیوں آیا ہوں؟''

پیاری نے میرے چہرے پر ایک تیز وار کیا لیکن نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا......''یہ ہمارے گاؤں کے ہیں۔''

میں نے ہنس کر کہا......''بابو جی، شہد ہو تو شہد کی مکھیاں خود بخود آ کر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ دیش بدیش کی پرواہ نہیں کرتیں۔'' لیکن اتنا کہتے ہی میں نے دیکھا کہ اس راز کو قبول نہ کر سکنے کی وجہ سے پرنیا ضلع کے زمیں دار نے اپنا چہرہ سنجیدہ بنا لیا ہے۔ اور ان کے نوکر نے جونہی آ کر اطلاع دی کہ سندھیا پوجا کے لیے تیار ہو گئی ہے وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ طبلچی اور دیگر دو اصحاب بھی ان کے ساتھ ہی باہر چلے گئے۔ ان کا دل یکایک اتنا بے قرار کیوں ہوا تھا اسے میں بالکل ہی نہ جان سکا۔

رتن نے آ کر پوچھا......''ماں بابو جی کے لیے بچھونے کہاں کرو؟''

پیاری نے جھنجلا کر کہا......''کیا اور کوئی کمرہ نہیں ہے رتن؟ مجھ سے پوچھے بغیر کیا اتنی سی عقل بھی تمہیں نہیں۔ چلا جا یہاں سے؟'' اتنا کہہ کر رتن کے ساتھ خود بھی باہر چلی گئی۔ میں نے خوب اچھی طرح سمجھا کہ میری بے موقعہ تشریف آوری سے اس گھر کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پیاری لوٹ آئی اور اس نے کچھ دیر تک میرے منہ کی طرف دیکھ کر کہا 'اچانک کس طرح آنا ہو گیا؟''

میں نے کہا......''تمہارے گاؤں کا آدمی ہوں۔ تمہیں بہت عرصہ سے دیکھ نہ سکنے کی وجہ سے بے صبر ہو اٹھا بائی جی!''

پیاری کا منہ اور بھی بھاری ہو گیا۔ میرے اس مذاق میں شریک نہ ہو کر پوچھا......''آج

رات یہاں ہی رہو گے نا؟''

''رہنے کے لیے کہو گی تو رہ جاؤں گا۔''

''میرے کہنے نہ کہنے سے کیا؟ یہاں تمہیں شاید کچھ تکلیف ہو جس کمرے میں تم سوتے تھے اس میں تو......''

''بابو سوتے ہیں، ٹھیک ہے۔ میں نیچے سو جاؤں گا۔ تمہارے نیچے کا کمرہ تو بہت عمدہ ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو، نیچے سوؤ گے؟ کیا تمہارے دل میں کچھ بھی پرہیز نہیں؟ وہ ہی دن میں اتنے بڑے پریم ہنس کس طرح ہو گئے؟''

دل ہی دل میں کہا......''پیاری تم نے مجھے اب تک بھی نہ پہچانا'' پھر کہا......''اس میں مجھے عزت بے عزتی کا خیال ذرہ بھر بھی نہیں ہے اور تکلیف کی بات کا اگر خیال کرو تو وہ بالکل ہی فضول ہے۔ میں گھر سے باہر نکلنے کے وقت کھانے سونے کے افکار کو بھی دور رکھ آتا ہوں۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔ بستر زیادہ ہوں تو ایک لے آنے کے لیے کہہ دو ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے کمبل کا بھروسہ ہے۔

پیاری نے سر ہلا کر کہا......''یہ تو میں جانتی ہوں لیکن اس سے دل میں کسی قسم کا افسوس تو نہ ہو گا؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا ''نہیں' کیونکہ سٹیشن پر پڑے رہنے کی نسبت تو یہ کہیں زیادہ اچھا ہے۔''

پیاری کچھ دیر چپ کھڑی رہی پھر بولی......''تمہاری جگہ میں ہوتی تو کسی درخت کے نیچے سو رہتی لیکن اتنی توہین برداشت نہ کرتی۔''

اس کے اضطراب کو دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کافی دیر سے میں خوب سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ میری زبان سے کیا سننا چاہتی ہے لیکن قدرتی اور پرسکون لہجہ میں میں نے جواب دیا......''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بات کو دل میں جگہ دوں کہ تم دیدہ دانستہ مجھے نیچے سونے کے لیے کہہ کر میری توہین کر رہی ہو۔ اگر ممکن ہوتا تو تم اس دفعہ کی طرح بھی میرے سونے کا انتظام کرتی۔ جانے دو ان معمولی باتوں پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم رتن کو بھیج دو کہ وہ مجھے نیچے کا کمرہ دکھا آئے میں کمبل بچھا کر سو رہوں گا۔ میں، بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔''

پیاری نے کہا......''تم گیانی آدمی ہو تم ہی میری اصلی پوزیشن کو نہ سمجھو گے تو اور جانے گا کون؟ چلو بچ گئی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل آہ دبا کر پوچھا......''اچانک چلے آنے کی وجہ تو ابھی تک

مجھے معلوم نہیں ہوئی۔"

میں نے جواب دیا...... "پہلی وجہ تو تم سن نہ سکو گی لیکن دوسری سن سکتی ہو۔"

"پہلی کیوں نہیں سن سکتی؟"

"غیر ضروری ہے اس لیے۔"

"اچھا دوسری ہی سناؤ؟"

"میں برما جا رہا ہوں۔ شاید پھر دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے۔ کم از کم یہ تو یقینی امر ہے کہ بہت دنوں تک ملاقات نہ ہو گی۔ جانے سے پیشتر ہی ایک مرتبہ تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔"

رتن کمرے میں آ کر بولا...... "بابو آپ کے بستر تیار ہیں آیئے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا "چلو۔" پیاری سے کہا...... مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ گھنٹہ بھر بعد اگر وقت ملے تو ایک مرتبہ نیچے آ جانا...... مجھے اور بھی بہت سی باتیں کرنی ہیں' اتنا کہہ کر اور رتن کو ساتھ لے کر میں باہر ہو گیا۔

پیاری کے سونے کے کمرے میں لے جا کر رتن نے جب مجھے میرا بستر دکھایا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں نے پوچھا...... میرے بستر نیچے کیوں نہیں کیے؟"

رتن نے متعجب ہو کر کہا...... "نیچے کے کمرہ میں؟"

میں نے کہا...... "یہی فیصلہ ہوا تھا۔"

وہ بدحواس سا ہو کر کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا اور بالآخر بول اٹھا...... "آپ مذاق کر رہے ہیں بابو؟' یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا جا ہی رہا تھا کہ میں نے اسے بلا کر پوچھا...... "تمہاری مالکن کہاں سوئیں گی؟"

رتن بولا...... "بنکو بابو کے کمرے میں ان کا بستر لگا آیا ہوں۔" میں نے قریب آ کر دیکھا...... یہ راج لکشمی کے اس ڈیڑھ ہاتھ چھوٹے تختے پر بچھایا ہوا بستر نہیں ہے۔ ایک بڑے پلنگ پر ایک خوب موٹا گدا بچھا کر شاہی بستر لگائے گئے ہیں۔ آئینے کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز پر سیج کے بیچوں بیچ لیمپ جل رہا تھا ایک طرف بنگالی کی کتابیں ہیں اور دوسری طرف گلدستے میں بیلا کے کچھ پھول ہیں۔ آنکھوں سے دیکھتے ہی میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ان میں کوئی شے نوکر کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی نہیں ہے۔ جو بہت پیار کرتی ہیں یہ سب چیزیں خود اس کے اپنے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ہیں اوپر کی چادر بھی راج لکشمی خود اپنے ہاتھوں سے بچھا گئی ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں خوب محسوس کر لیا۔

آج ان لوگوں کی موجودگی میں میرے یکا یک آ جانے کے باعث راج لکشمی نے حواس

باختہ ہو کر شروع شروع میں خود کیسا ہی برتاؤ کیوں نہ کیا ہو لیکن یہ بات بھی مجھ سے چھپی نہ رہی کہ میری اس افسردگی اور اداسی کا اندازہ کر کے وہ دل ہی دل میں متفکر ہو اٹھی تھی، اور یہ بھی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے اندر حسد کی آگ کو بھڑکانے کے لیے اتنی دیر سے بار بار وہ کیوں صدمہ پہنچا رہی تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے لاپرواہ مزاج کی مردانگی سمجھ کر میں نے اس کا غرور مٹی میں ملا دیا۔ اس کے ہر معمولی وار کو سوگنا زیادہ کر کے اسے واپس لوٹا دیا لیکن اب اس کے ساتھ کیا گیا میرا یہ سلوک خود مجھے تیز سوئی کی مانند چبھنے لگا۔ میں بستر پر لیٹ گیا مگر سو نہ سکا مجھے یقین تھا کہ وہ ایک بار ضرور آئے گی۔ اس لیے اس وقت کی راہ نہایت بے تابی سے دیکھنے لگا۔

تکان کے باعث شاید کچھ سو بھی گیا تھا۔ اچانک آنکھ کھول کر دیکھا کہ پیاری میرے جسم پر ایک ہاتھ رکھے بیٹھی ہیں۔ میرے اٹھ کر بیٹھتے ہی وہ بولی...... "برما گیا ہوا انسان پھر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ یہ بات کیا تمہیں معلوم ہے؟"

"نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"پھر"

"مجھے لوٹنا ہی ہو گا۔ اپنے سر کی یہ قسم تو مجھے کسی نے دے نہیں رکھی۔"

"دے نہیں رکھی، کیا تم دنیا میں ہر ایک کے دل کی بات جانتے ہو؟"

بات نہایت معمولی تھی لیکن دنیا میں یہ نہایت عجوبہ بات ہے کہ انسان کی کمزوری کب اور کس جگہ پر ظاہر ہو جائے گی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پہلے کتنے ہی اور اس سے بھی زیادہ اہم موقعے درپیش آئے لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو اس طرح پکڑا جانے نہ دیا...... اور آج اس کے منہ سے نکلی ہوئی نہایت معمولی سی بات کو بھی میں برداشت نہ کر سکا۔ دفعتاً منہ سے نکل گیا...... "سب لوگوں کے دل کی بات تو میں جانتا نہیں راج لکشمی، لیکن ایک انسان کے دل کی بات ضرور جانتا ہوں۔ اگر کسی دن لوٹ کر واپس آ ؤں گا تو محض تمہارے ہی لئے۔ تمہارے سر کی قسم کو میں کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

پیاری یکبارگی میرے قدموں پر الٹی ہو کر گری پڑی۔ میں نے خواہش ہوتے ہوئے بھی اپنے پاؤں پیچھے نہ کھینچے لیکن دس ایک منٹ گزر جانے پر بھی جب اس نے اپنا سر اوپر نہ اٹھایا تو اس کے سر پر میں نے اپنے داہنا ہاتھ رکھ دیا اور فوراً ہی ایک بار کانپ تو اٹھی پھر بھی وہ اسی طرح پڑی رہی۔ سر بھی نہ اٹھایا۔ بولی بھی نہیں۔ میں نے کہا...... "اٹھ کر بیٹھو، اس حالت میں اگر کوئی ہمیں دیکھے گا تو بھاری اچنبھے میں پڑ جائے گا۔"

لیکن پیاری نے جواب تک نہ دیا تو میں نے اسے زور سے اٹھایا۔ اٹھاتے ہی میں نے دیکھا

کہ اس کے آنسوؤں سے وہاں کی تمام چادر تر ہو چکی ہے۔ کھینچ تان کرنے پر وہ بھرائے گلے میں بول اٹھی...... ''پہلے میری دو تین باتوں کا جواب دو پھر میں اٹھوں گی۔

''کہو، کون سی باتیں ہیں؟''

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کے یہاں رہتے ہوئے تم نے میرے متعلق کوئی برا خیال تو نہیں کیا؟

''نہیں''

پیاری اور کچھ دیر چپ رہ کر بولی...... ''لیکن میں نیک عورت نہیں ہوں یہ تو تمہیں معلوم ہے پھر بھی تمہیں شک کیوں نہیں ہوا؟''

سوال نہایت مشکل تھا وہ نیک عورت نہیں ہے یہ میں جانتا ہوں لیکن وہ خراب ہے، بد ہے یہ خیال بھی میں نہ کر سکا۔ میں خاموش ہو رہا۔

یکا یک وہ اپنی آنکھیں پونچھ کر جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور بولی...... ''اچھا، تم سے پوچھتی ہوں، مرد کتنا ہی برا کیوں نہ ہو اگر وہ بھلا ہونا چاہتا ہے تو اسے کوئی نہیں روکتا مگر ہماری باری آنے پر سب راہیں کیوں بند ہو جاتی ہیں؟ غلطی سے مفلسی اور ناداری سے مجبور ہو کر ایک دن جو کر بیٹھی ہوں ہمیشہ کے لیے مجھے وہی کیوں کرنا پڑتا ہے؟ ہم لوگوں کو تم نیک بننے کیوں نہیں دیتے؟''

میں نے جواب دیا...... ''ہم لوگ تو کبھی روکتے نہیں ہیں اور اگر بالفرض محال ہم روکیں تو دنیا میں نیک بننے کی راہ میں کوئی کسی کو اٹکا کر روک نہیں سکتا۔''

پیاری بڑی دیر تک چپ رہ کر میری منہ کی طرف دیکھتی رہ کر آخر آہستہ آہستہ بولی......

''بہت اچھا، تو پھر تم بھی مجھے روک نہ سکو گے؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی رتن کی کھانسی کی آواز دروازے کے قریب سنائی دی۔

پیاری نے پکار کر کہا...... ''کیا ہے رتن؟''

رتن نے منہ آگے نکال کر کہا...... ''ماں رات بہت بیت چکی ہے...... بابو جی کے کھانے کے لیے لے نہ آؤں؟ رسوئیا مہاراج تو اونگھتے اونگھتے رسوئی گھر میں ہی سو گئے ہیں۔''

''ارے پھر تو تم میں سے کسی نے بھی ابھی تک نہ کھایا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر پیاری گھبرا کر اور شرمندہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے لیے کھانا وہ اپنے ہی ہاتھوں ہمیشہ لاتی تھی۔ آج بھی لانے کے لیے جلدی سے قدم بڑھاتی ہوئی وہ چلی گئی۔

کھانا ختم کر کے جب میں بستر پر لیٹا تو رات کا ایک بج گیا تھا۔ پیاری پھر آ کر میرے پاؤں

کے پاس بیٹھ گئی بولی...... ''تمہارے لیے بے شمار راتیں اکیلے ہی جاگ کر گزاری ہیں۔ آج تمہیں بھی جاگتا رکھوں گی۔'' اتنا کہہ کر میری رضامندی کی راہ دیکھے بغیر ہی میرے پاؤں کی طرف کا تکیہ کھینچ لیا اور بائیں ہاتھ کا سہارا لے کر وہ لیٹ گئی اور بولی...... ''میں نے خوب غور کر کے دیکھا ہے تمہارا اتنی دور غیر ملک میں جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟...... اسی طرح یہاں وہاں بھٹکتے پھرنا۔''

پیاری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا پوچھا...... ''اس کے علاوہ کس لیے برما جا رہے ہو، بتاؤ تو سہی؟''

''ملازمت کرنے کے لیے...... یہاں وہاں بھٹکتے پھرنے کے لیے نہیں۔''

میری بات سن کر پیاری اضطراب کے زیر اثر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی...... ''دیکھو دوسروں سے جو دل میں آئے کہنا لیکن مجھے دھوکہ مت دینا مجھے دھوکہ دو گے تو تمہاری یہ دنیا ہی نہیں آخرت بھی تباہ ہو جائے گی۔ یہ جانتے ہو؟''

''یہ تو خوب جانتا ہوں، لیکن اب کیا کرنا چاہیے یہ بتاؤ؟''

میری اس منظوری سے پیاری مسرور ہوئی ہنس کر بولی...... ''عورتیں ہمیشہ سے جو کچھ کہتی آئی ہیں وہی میں بھی کہتی ہوں۔ شادی کر کے دنیادار بن جاؤ۔ گرہستھ دھرم نبھاؤ۔''

میں نے پوچھا...... ''کیا سچ مچ ہی تم اس سے سکھی ہو جاؤ گی؟''

اس نے سر ہلا کر کانوں کے آویزے ہلاتے ہوئے جوش سے کہا...... ''یقیناً ایک دفعہ نہیں سو دفعہ، اس سے اگر مجھے سکھ نہ ملے گا تو پھر اور کس کو ملے گا؟ بتاؤ؟''

میں نے کہا...... ''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اس سے میرے دل کی ایک تشویش مٹ گئی درحقیقت میں یہی خبر دینے آیا تھا کہ اب شادی کیے بغیر میری گزر نہ ہوگی۔''

پیاری ایک مرتبہ پھر کانوں کے سنہری آویزے ہلاتی ہوئی بے انتہا مسرت سے بول اٹھی...... ''یہ ہوگا تو میں کالی گھاٹ جا کر پوجا دے آؤں گی مگر شرط یہ ہے کہ لڑکی میں خود دیکھ کر پسند کروں گی۔''

میں نے کہا...... ''اس کے لیے اب وقت نہیں ہے، لڑکی تو پسند کی جا چکی ہے۔''

میرے سنجیدہ لہجہ پر شاید پیاری نے توجہ نہ دی۔ یکا یک اس کے خندہ اور مسرور چہرے پر ایک مکدر سا سایہ پڑ گیا وہ بولی...... ''ٹھیک تو ہے، اچھا ہی ہوا پسند ہو گئی ہے تو نہایت ہی خوشی کی بات ہے۔''

میں نے کہا...... ''خوشی اور غمی تو میں سمجھتا نہیں راج لکشمی، جو بات ہو چکی ہے وہی تمہیں بتاتا ہوں۔''

پیاری فوراً غصے سے بول اٹھی...... ''جاؤ چالاکی مت کرو، تمام بات جھوٹ ہے۔''

''ایک بھی بات غلط نہیں ہے۔ خط دیکھتے ہی سمجھ جاؤ گی۔ یہ کہہ کر جیب میں سے میں نے دو خط باہر نکالے۔

''کہاں میں دیکھوں وہ خط؟'' اتنا کہہ کر اور ہاتھ بڑھا کر پیاری نے دونوں ہاتھوں میں خط لے لئے۔ انہیں ہاتھ میں لیتے ہی اس کے تمام چہرے پر ایک اندھیرا سا چھا گیا۔ دونوں خط ہاتھ میں لئے ہی وہ بولی...... ''دوسرے کے خط پڑھنے کی مجھے ضرورت ہی کیا ہے؟ بتاؤ بات کہاں پکی ہوئی ہے''؟

''پڑھ دیکھو۔''

''میں دوسرے کا خط نہیں پڑھتی۔''

''تو پھر دوسرے کی خبر جاننے کی بھی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔''

''میں نہیں جاننا چاہتی۔'' کہہ کر اور آنکھیں بند کر کے وہ لیٹ گئی مگر دونوں خط اس کی مٹھی میں ہی رہے۔ بہت دیر تک وہ کچھ نہ بولی اس کے بعد وہ آہستہ سے اٹھی، جا کر لیمپ تیز کیا اور میز پر دونوں خط رکھ کر اطمینان سے جا بیٹھی۔ ان میں جو کچھ لکھا تھا اس نے اسے شاید دو تین بار پڑھا اس کے بعد وہ اٹھ آئی اور اس طرح پھر لیٹ گئی۔ بہت دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی...... سو گئے کیا؟''

''نہیں۔''

''اس جگہ میں تمہیں کسی طرح بھی شادی کرنے نہ دوں گی۔ وہ لڑکی اچھی نہیں ہے۔ اس کو میں نے بچپن سے دیکھا ہے۔''

''ماں کا خط پڑھا؟''

''ہاں لیکن چاچی کے خط میں ایسا کچھ بھی نہیں لکھا تمہیں اس کو گلے میں ضرور ڈالنا ہی پڑے گا اور خواہ وہ اچھی ہو خواہ بری ہو لیکن اس لڑکی کو میں کسی طرح بھی گھر نہ لاؤں گی۔''

''کیسی لڑکی گھر میں لانا چاہتی ہو، بتا سکتی ہو؟''

''یہ میں اس وقت کیسے بتاؤں؟ غور کر کے دیکھنا ہوگا۔''

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد میں ہنس کر بولا...... ''تمہاری پسند اور تمہارے معیار پر انحصار رکھا جائے تو مجھے اپنا کنوارا پن اتارنے کے لیے شاید ایک جنم اور لینا پڑے اور ممکن ہے اس میں نہیں پورا نہ پڑے۔ جانے دو، نہ ہوا تو ضرورت پڑنے پر جنم لے لوں گا۔ مجھے کوئی خاص جلدی نہیں ہے لیکن اس لڑکی کا تم بیڑا پار کر دو۔

پانچ سو روپے ہوں تو یہ کام ہو جائے گا۔ میں انہیں کے منہ سے سن رہا ہوں۔''

پیاری جوش میں آ کر اٹھ بیٹھی اور بولی...... ''کل ہی میں روپے بھیج دوں گی۔ چاچی کی بات جھوٹی نہ ہونے دوں گی۔'' پھر کچھ دیر رک کر بولی...... ''سچ کہتی ہوں تم سے، یہ لڑکی اچھی نہیں اس لیے مجھے اعتراض ہے ورنہ......''

''ورنہ......؟''

''ورنہ اور کیا! جب تمہارے قابل لڑکی ڈھونڈ لوں گی اسی وقت اس بات کا جواب دوں گی۔ اس وقت نہیں۔''

سر ہلا کر میں نے کہا...... ''تم فضول کوشش مت کرو راج لکشمی، میرے قابل لڑکی تم کسی دن بھی تلاش نہ کر سکو گی۔''

وہ بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی پھر یکایک بول اٹھی...... ''اچھا، شاید تلاش نہ کر سکوں لیکن اگر تم برما گئے تو مجھے ساتھ لے چلو گے؟''

اس کی تجویز سن کر میں ہنسا، بولا...... ''میرے ساتھ چلنے کا تمہیں حوصلہ ہوگا؟''

پیاری میرے چہرے پر تیز نگاہ ڈال کر بولی...... ''حوصلہ! اسے کیا تم بہت مشکل بات خیال کرتے ہو؟''

''میں خواہ کچھ بھی خیال کروں مگر تمہارے اس تمام گھر بار، دھن دولت، زمیں کا کیا ہوگا؟''

پیاری بولی...... خواہ کچھ بھی ہو۔ تمہیں نوکری کی تلاش میں جب اتنی دور جانا پڑا...... اور یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کام نہ آیا تو اسے بنکو کو دے جاؤں گی۔''

اس بات کا جواب میں دے نہ سکا۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تاریکی میں دیکھتا ہوا چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس نے پھر کہا...... ''کیا اتنی دور گئے بغیر کام نہ چلے گا؟ یہ سب کیا کسی بھی دن تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا؟''

میں نے جواب دیا...... ''نہیں کبھی کسی دن بھی نہیں۔''

پیاری نے گردن ہلا کر کہا...... ''یہ میں جانتی ہوں لیکن لے چلو گے تم مجھے اپنے ساتھ یہ کہہ کر اس نے میرے پاؤں پر پھر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ایک دن جب پیاری نے مجھے اپنے مکان سے زبردستی رخصت کر دیا تھا تو اس دن کا اس کا غیر معمولی استقلال اور قوت ارادی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ آج

اس کی اتنی بڑی کمزوری، بے تاب دل کی یہ التجا ان سب کا مقابلہ کر کے میرا سینہ پھٹنے لگا۔ لیکن کسی طرح بھی رضامند نہ ہو سکا بولا...... ''میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا نہیں سکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی تم بلاؤ گی لوٹ آؤں گا۔ میں جہاں بھی رہوں گا ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا راج لکشمی!''

''کیا تم ہمیشہ اسی بدکردار کے بنے رہو گے؟''

''ہاں ہمیشہ ہی۔''

''تو پھر یہ کہو کہ تمہاری شادی ہی نہ ہوگی؟''

''ہاں نہیں ہوگی، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری رائے کے بغیر، تمہیں تکلیف پہنچا کر اس کام کو کرنے کی میری خواہش نہیں ہے۔''

پیاری نہ جھکنے والی نگاہوں سے کچھ دیر تک میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر کر ٹپ ٹپ، بوندوں کی شکل میں گرنے لگیں۔ آنکھیں صاف کر کے کثیف لہجہ میں وہ بولی...... ''اس بدقسمت کے لیے کیا تم زندگی بھر سنیاسی ہی بنے رہو گے؟''

میں نے کہا...... ''ہاں بنا رہوں گا۔ تمہارے پاس میں نے جو شے پائی ہے اس کے عوض سنیاسی بن کر رہنے میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ میں کہیں بھی کیوں نہ رہو میری اس بات پر تم کبھی شک نہ کرنا۔''

پل بھر کے لیے دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور دوسرے ہی لحہ وہ تکیے میں منہ چھپا کر الٹی لیٹ گئی۔ سسکیوں کے جوش میں اس کا تمام جسم کانپ کانپ کر اور پھول پھول کر اچھلنے لگا۔

میں نے منہ اٹھا کر دیکھا تمام گھر گہری نیند میں مدہوش تھا۔ کہیں کوئی بھی جاگ نہ رہا تھا۔ صرف ایک دفعہ خیال آیا کہ جھروکے کے باہر تاریک رات اپنے کتنے ہی جشن ہائے مسرت کی ہم نشین پیاری کے دل کے اضطراب کو آج چپ چاپ آنکھیں کھول کر نہایت افسوس کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔

بے شمار باتیں ایسی دیکھی ہیں کہ زندگی بھر انہیں بھولا نہیں جا سکتا۔ وہ جب کبھی یاد آ جاتی ہیں تو اس وقت کے الفاظ تک کانوں میں گونج اٹھتے ہیں۔ پیاری کے الوداعی الفاظ بھی اس قسم کے تھے۔ آج بھی میں گویا ان کی گونج سنا کرتا ہوں۔ وہ فطرتاً ہی بہت زیادہ بردبار اور جفاکش تھی۔ اور اس کا ثبوت وہ بچپن ہی میں بار بار دے چکی تھی اور اس کے علاوہ اب اسے دنیا کا کافی تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ پچھلی مرتبہ تو میرے رخصت ہونے کے وقت کسی طرح بھاگ کر اس نے اپنا آپ بچا لیا تھا لیکن اس مرتبہ وہ کسی طرح بھی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور نوکر چاکروں کے سامنے ہی رو پڑی۔ روندھے ہوئے گلے سے وہ بولی...... ''دیکھو میں ناسمجھ نہیں ہوں۔ اپنے گناہوں کی بھاری سزا مجھے بھگتنی ہی پڑے گی۔ یہ

میں جانتی ہوں لیکن پھر بھی کہتی ہوں کہ ہمارا یہ سماج نہایت بے رحم اور سنگدل ہے۔ اس کو بھی ایک نہ ایک دن اپنے اعمال کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ بھگوان اس ظالم سماج کو اس کے گناہوں کی سزا ضرور ہی دیں گے۔''

سماج کو اتنی بڑی بد دعا اس نے کیوں دی۔ یہ وہ جانے یا اس کا عالم الغیب پرماتما۔ میں نہیں جانتا یہ بات نہیں ہے مگر میں خاموش ہو رہا۔ بوڑھا دربان گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں آگے کی طرف قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ پیاری آنکھوں کے آنسوؤں میں سے میرے منہ کی طرف دیکھ کر مسکرائی بولی...... ''جہاں جا رہے ہو؟ پھر تو شاید درشت نہ ہوں گے، ایک بھیک دیتے جاؤ گے؟''

میں بولا...... ''دوں گا، کہو۔''

پیاری بولی...... ''بھگوان نہ کریں...... لیکن تمہارا سفر زندگی جس قسم کا ہے اس سے...... خیر جہاں بھی رہو ایسے موقعہ پر خبر دو گے؟ شرماؤ گے تو نہیں؟''

''نہیں شرماؤں گا نہیں...... اطلاع ضرور دوں گا'' اتنا کہہ کر آہستہ آہستہ میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ پیاری پیچھے پیچھے آئی اور اس نے اپنے آنچل میں میرے پاؤں کی خاک لے لی۔

''اجی سنتے ہو؟'' میں نے منہ اٹھا کر دیکھا کہ وہ اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو تمام تر طاقتوں سے قابو میں رکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دونوں کی نگاہ ایک ہوتے ہی اس کی آنکھوں سے جھر جھر پانی جھر پڑا۔ وہ ناقابل فہم روندھے ہوئے گلے سے آہستہ آہستہ بولی...... ''نا جا تو اتنی دور تو؟...... رہنے دو، مت جاؤ......''

چپکے سے میں نے اپنی نظر اس طرف سے پھرالی۔ گاڑی بان نے گاڑی ہانک دی۔ چابک اور چار پہیوں کی مشترکہ سپاسپ اور گھر گھر آواز سے شام کی فضا معمور ہو اٹھی مگر ان سب کو دبا کر صرف کسی روندھے ہوئے گلے کا دبا ہوا گریہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

پانچ چھ دن بعد میں، ایک دن صبح کے وقت، صرف لوہے کا ایک ٹرنک اور ہلکا سا بستر لے کر کلکتہ کے کوئلہ گھاٹ پر جا پہنچا۔ گاڑی سے اترتے ہی ایک خاکی کرتی پہنے ہوئے قلی نے دونوں چیزوں کو جھپٹ لیا۔ انہیں لے کر چشم زدن میں نامعلوم وہ کہاں غائب ہو گیا اور جب تک انہیں تلاش کرتے کرتے تشویش کے مارے میرے آنکھوں میں آنسو نہ آ گئے۔ تب تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

گاڑی پر سے آتے ہی میں نے دیکھا تھا کہ جیٹی اور شاہراہ کے درمیان کی زمین گونا گوں رنگ کی چیزوں سے لدی ہوئی ہے......، لال، کالے، گردے...... کچھ کہر بھی چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ بچھڑوں کا ایک جھنڈ شاید چالان کیے جانے کے لئے بندھا ہوا ہے۔ نزدیک آ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چالان تو ہوگا ضرور...... لیکن بچھڑوں کا نہیں...... انسانوں کا۔ وہ لوگ بڑی بڑی سی گٹھڑیاں لئے بیوی بچوں سمیت ہاتھ پکڑے تمام رات، اسی لیے اسی طرح اوس میں پڑے رہے ہیں کہ صبح سب سے پہلے جہاز میں گھس کر ایک اچھی سی جگہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اس لیے کس کی طاقت تھی کہ پیچھے سے آ کر انہیں پیار کر کے جیٹی کے دروازہ تک پہنچ جائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب یہ دل جاگ کر کھڑا ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ کابل کے مغرب سے لے کر راس کماری کے آخر تک کا کوئی بھی صوبہ ایسا نہیں ہے جو اپنا نمائندہ اس کوئلہ گھاٹ پر بھیجنا بھولا ہو۔

سبھی ہیں۔ کالی کالی گانجیاں پہنے ہوئے چینیوں کا گروہ بھی رہ نہیں گیا ہے میں بھی تو ڈیک (جس سے نیچے اور کوئی درجہ نہیں اس کا) مسافر تھا۔ اس لئے لوگوں کو دھکیل کر اپنے بیٹھنے کے لیے ایک جگہ مجھے بھی حاصل کرنی تھی لیکن اس کا تصور کرتے ہی میرا تمام جسم برف کی مانند ٹھنڈا ہو گیا تاہم جب جانا ہی ہے اور جہاز کے علاوہ جانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو جس طرح بھی ہو ان لوگوں کی تقلید کرنا فرض ہے یہ خیال کر کے میں اپنے دل کو جس قدر ہی مضبوط بنانے لگا گویا اس قدر ہی وہ ہمت ہارنے لگا۔ جہاز کب آ کر کنارے سے لگے گا یہ جہاز ہی جانے۔ یکایک آنکھ اٹھا کر دیکھا اس دوران میں ہی

یہ چودہ پندرہ سو لوگ بھیڑوں کے جھنڈ کی طرح قطاریں باندھ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہندوستانی آدمی سے میں نے پوچھا ”بھیا! سب لوگ آرام سے اچھی طرح تو بیٹھے تھے...... اب قطار باندھ کر کیوں کھڑے ہو گئے؟“

وہ بولا...... ”ڈاکٹری ہوگی“

”ڈاکٹری کیا ہوتی ہے بھائی؟“

اس آدمی نے پیچھے سے آئے ہوئے ایک دھکے کو سنبھالتے ہوئے کچھ جھنجھلاہٹ سے کہا...... ”ارے پلیگ کی ڈاکٹری۔“

بات کو سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا لیکن سمجھوں خواہ نہ سمجھوں...... اتنے انسانوں کے لیے جو ضروری ہے وہ میرے لیے بھی ہوگی لیکن کس ہوشیاری سے اپنے آپ کو اس جھنڈ میں گھسیڑ دوں، یہ ایک مشکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ گھسنے کے لیے کہیں ذرا سی خالی جگہ ہے یا نہیں۔ یہ تلاش کرتے کرتے دیکھا کہ کچھ دور کھدر پور کے کتنے ہی مسلمان سکڑ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ دیش بدیش میں نے ہر جگہ یہی دیکھا ہے کہ جن کاموں میں شرم کرنا ضرور ہوتا ہے بنگالی لوگ ضرور ان میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی دیگر اقوام کی طرح بلا جھجک دھینگا مشتی، دھکا مکی اور مارا ماری نہیں کر سکتے۔ اس طرح کھڑے ہونے میں جو ندامت ہے اس کی شرم کے مارے یہ سب اپنا سر نیچا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ رنگون میں درزی کا کام کرتے ہیں اور کئی مرتبہ آئے گئے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ سب احتیاط حفظ ماتقدم کے طور پر اس لیے ہے کہ یہاں سے کہیں برما میں پلیگ نہ چلی جائے۔ جب تک ڈاکٹر معائنہ کر کے پاس نہ کر دے کوئی جہاز پر سوار نہیں ہو سکتا۔ یعنی رنگون جانے کے لیے جو لوگ تیار ہوئے ہیں ان کا پہلے ہی معائنہ ہو جانا ہے کہ وہ پلیگ کے بیمار ہیں یا نہیں۔ انگریزی حکومت میں ڈاکٹروں کا خاص مرتبہ ہے۔ سنا ہے کہ ذبح خانہ کے مسافروں کو بھی اندر جا کر ذبح ہونے کا حق حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں کا منہ تاکنا پڑتا ہے لیکن رفتار زمانہ کے نقطہ نگاہ سے رنگون کے مسافروں کے ساتھ ان کی جو اتنی مشابہت ہے اس وقت کس نے سوچی تھی۔

رفتہ رفتہ پلیگ کی ڈاکٹری قریب آ پہنچی۔ اپنے پیادے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نظر آئے۔ قطار بندی کی حالت میں گردن ٹیڑھی کر کے دیکھنے کا موقعہ تو تھا نہیں تاہم آگے کھڑے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ کیا گیا ڈاکٹری کا معائنہ جتنا بھی نظر آیا اس سے میری تشویش کی حد نہ رہی اتنا بزدل بنگالیوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہ تھا جو جسم کے عضو نہانی کو ننگا کیے جانے پر بھی خوفزدہ ہو لیکن اپنے سامنے کے بہادروں کو بھی معائنہ کے وقت بار بار چونک اٹھتے دیکھ کر میں بری طرح متفکر ہوا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے

کہ پلیگ کی بیماری میں انسان کا عضو مخصوص سوج جایا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس طرح بے لوث دل سے محض فرض سمجھ کر اس مشکوک جگہ میں ہاتھ ڈال کر سوزش ٹٹولنے لگے اس سے کاٹھ کے پتلے کو بھی اعتراض ہوتا مگر ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن قدیم ہے اس لیے جس طرح بھی ہو ایک دفعہ چونک کر وہ اپنی قدرتی حالت میں آ جاتے اور اگر اور کوئی قوم ہوتی تو ڈاکٹر کا ہاتھ مروڑے توڑے بغیر نہ رہتی۔ پس جو بھی ہو جب پاس ہونا نہایت ضروری فرض تھا تو پھر اور چارہ ہی کیا تھا؟ اپنی باری آنے پر، آنکھیں بند کر کے عضو سکوڑ کر، ایک طرح سے بدحواس سا ہو کر میں نے اپنے آپ ڈاکٹر کو سونپ دیا اور پاس بھی ہو گیا۔

اسکے بعد جہاز پر سوار ہونے کا سوال تھا لیکن ڈیک پسنجروں کا یہ مرحلہ کس طرح طے ہوتا ہے۔ باہر کے لوگوں کے لیے اس کا تصور بھی ناممکن ہے جنہوں نے کل کارخانوں میں بڑے بڑے پہیوں کا گھومنا دیکھا ہے۔ ان کے لیے اس کا سمجھنا کچھ کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ جس طرح آگے کے کھنچاؤ اور پیچھے کے دھکے سے آگے بڑھ کر چلتے ہیں اسی طرح ہماری ہی کابلی پنجابی مارواڑی، مدارسی، مرہٹی، بنگالی، چینی، اڑیا لوگوں کی ملی جلی اور پر جوش فوج صرف باہمی کشش اور رگڑ کے زور سے زمیں سے جہاز کے ڈیک پر از خود سوار ہو گئی اور ان کی رفتار وہاں بھی نہ رکی۔ سامنے دیکھا ایک گڑھے کے منہ پر سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ جہاز کے پیٹ میں (اندر) اترنے کا یہی راستہ تھا۔ جس طرح کسی برساتی نالے کا بندھ کھول دینے سے جمع شدہ پانی نہایت زور سے نیچے گرتا ہے اسی طرح یہ فوج بھی اپنی اپنی جگہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے زندگی اور موت کی فکر سے بے پرواہ ہو کر نیچے اترنے لگی۔

مجھے جہاں تک یاد آتا ہے میری خواہش نیچے جانے کی نہیں تھی پاؤں سے چل کر اترا ابھی نہیں۔ لمحہ بھر کے لیے میں بے ہوش سا ہو گیا تھا اس لیے میرے اس بیان پر اگر کسی کو شک ہو تو قسم کھا کر شاید میں اس کو نامنظور بھی نہ کر سکوں گا۔ ہوش آنے پر دیکھا کہ جہاز کے اندر وسط سے بہت دور ایک کونے میں تنہا کھڑا ہوں۔ پاؤں پر نظر ڈالی تو دیکھتا ہوں کہ اسی دوران میں جادو کے کھیل کی طرح پل بھر میں کمبل بچھا کر اور صندوق وغیرہ سے گھر کو اپنے اپنے لیے محفوظ جگہ بنالی ہے اور اطمینان سے بیٹھ کر اپنے پڑوسی کا تعارف حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اتنی دیر بعد اب کہیں میرے اس نمبر والے قلی نے آ کر اپنی شکل دکھائی اور کہا...... ''ٹرنک اور بستر اوپر رکھ آیا ہوں اگر آپ کہیں تو نیچے لے آؤں؟''

میں نے جواب دیا...... ''نہیں بلکہ کس طرح ممکن ہو تو یہاں سے نجات دلا کر مجھے بھی اوپر لے چلو۔'' کیونکہ وہاں اتنی سی جگہ بھی مجھے کہیں خالی نظر نہ آئی کہ دوسروں کے بستر لپیٹے بغیر یا ان سے ہاتھا پائی کی نوبت آئے بغیر میں کہیں اپنا قدم رکھ سکو۔ اس سے تو یہ کہیں اچھا تھا کہ بارش ہو تو اوپر بھیگ

جاؤں مگر یہاں تو ایک ٹھہرنا ممکن نہیں۔ زیادہ پیسوں کے لالچ سے قلی کافی کوشش اور بحث مباحثے کے بعد کمبلوں اور شطرنجیوں کے کناروں کو الٹا پلٹتا ہوا مجھے اپنے ساتھ لیے اوپر آیا اور میرا سامان دکھا کر انعام لے کر چلتا بنا۔ یہاں بھی وہی حال تھا۔ بستر بچھانے کے لیے جگہ نہ تھی اس لیے مجبور ہو کر اپنے ٹرنک کے اوپر ہی بیٹھنے کا انتظام کر کے میں نہایت یکسوئی سے ماتا گنگا کے دونوں کناروں کی شان دیکھنے لگا۔

سٹیمر نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ بہت دیر سے پیاس لگ رہی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں جو طوفان سر سے گزر گیا اس سے جن کا سینہ خشک نہ ہو جائے ایسے سخت دل دنیا میں کم ہی ہوں گے مگر مصیبت یہ ہوئی کہ پاس نہ گلاس نہ لوٹا۔ ساتھ کے سافروں میں اگر کوئی بنگالی ہو تو کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں باہر نکلا نیچے اترنے کے اس گڑھے کے نزدیک پہنچتے ہی ایک ہنگامہ سا سنائی پڑا۔ میری واقفیت کا دائرہ اتنا محدود ہے کہ اس ہنگامے کی تشبیہ نہیں دے سکتا۔ گئوشالہ میں آگ لگا دینے سے ایک قسم کے ہنگامے کی بات ضرور کہی جاتی ہے لیکن اتنا بڑا ہنگامہ ہونے کے لیے جتنی بڑی گئوشالہ کی ضرورت ہے اتنی بڑی گئوشالہ مہا بھارت کے زمانہ میں راجہ دراٹ کے ہاں ہو تو علیحدہ بات ہے مگر اس کلجگ میں اس کا وجود تصور سے بھی بعید ہے۔

خوف اور دھڑکتے ہوئے دل سے دو ایک سڑھیاں اتر کر میں نے جھانکا تو معلوم ہوا کہ مسافروں نے اپنا نیشنل (قومی) گانا شروع کر دیا ہے۔ کابل سے لے کر برہم پتر اور کینا کماری سے لے کر چین کی سرحد تک جتنی بھی طرح کی سریں اور سرگم ہیں۔ جہاز کے اس بند پیٹ کے اندر ان کا عجیب و غریب ملاپ ہوا تھا۔ ایسے عظیم الشان گانے سننے کا موقعہ خوش نصیبی سے ملتا ہے اور گانا ہی فنون لطیفہ میں سب سے افضل ہے۔ یہ بات اس جگہ کھڑے کھڑے ہی میں نے کمال عقیدت کے ساتھ قبول کر لی لیکن سب سے بڑی حیرت تو یہ تھی کہ وہاں اتنے زیادہ ماہرین فن جمع کیسے ہوئے؟

میں یکا یک اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ میرا نیچے اترنا مناسب ہے یا نہیں۔ سنا ہے انگریزوں کے شاعر اعظم شکسپیئر نے کہا کہ ''نغمہ جس انسان کو بیخود نہیں بنا سکتا وہ خون تک کر سکتا ہے۔'' مگر صرف منٹ بھر سن لینے سے ہی جو نغمہ انسانی خون کو سرد کر دیتا ہے ایسا نغمہ شاید انہوں نے اپنی زندگی میں سنا نہ ہو گا۔ جہاز کی یہ جگہ کوئی سنگیت مہاودیالہ ہے یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اگر نہ ہوتا تو یہ کون سوچ سکتا کہ کابلی لوگ بھی گانا گاتے ہیں۔

ایک طرف یہ عجیب و غریب نظارہ تھا اور میں منہ کھولے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ قریب ہی کھڑا ایک شخص اپنی پوری طاقت سے ہاتھ ہلا ہلا کر میری توجہ اپنی طرف کشش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کافی تکلیف اور پریشانی سے بیشمار لوگوں کی لال سرخ آنکھیں سر پر رکھ کر میں اس کے

پاس جا پہنچا۔ اس نے برا ہمن سمجھ کر مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور بتایا کہ میں رنگون کا مشہور مستری نند ہوں۔ پاس ہی ایک موٹی سی عورت بیٹھی ہوئی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کسی انسان کی اتنی بڑی بڑی فٹ بال کی سی آنکھیں اور اتنی موٹی جڑی ہوئی بھوئیں پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

نند مستری اس عورت کی تعریف کرتے ہوئے بولا...... ''بابو جی یہ میری گھروا...... '' بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ پھنکار کر گرج اٹھی...... ''گھروالی! ...... یہ میرے سات، بھانور کے مالک کہتے ہیں گھروالی! خبردار، کہے دیتی ہوں مستری! ہر کسی کے سامنے جھوٹ بول کر مجھے بدنام مت کیا کرو! ...... ہاں۔''

میں تو حیرت کے مارے دیکھتا رہ گیا۔

نند مستری کچھ مرعوب سا ہو کر بولا...... ''آہا، ناراض کیوں ہوتی ہو ٹگر؟ گھروالی اور کسے کہتے ہیں؟ بیس سال......''

ٹگر نہایت غصے سے بول اٹھی...... ''بیس سال ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ پھوٹے نصیب! ویشنو ذات کی لڑکی ہو کر میں کیوٹ کی گھروالی کہلاؤں۔

''کیسے، کس طرح؟ بیس سال سے تمہارے گھر میں ضرور ہوں لیکن کیا کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ میں نے ایک دن میں تمہیں اپنے چوکے میں گھسنے دیا ہے؟ ٹگر ویشنو ہی مر جائے گی لیکن اپنی ذات نہ کھوئے گی جانتے ہو''؟ اتنا کہہ کر وہ ویشنو ذات کی لڑکی اپنی ذات کے غرور سے میرے منہ کی طرف دیکھتی ہوئی اپنی دونوں فٹ بال کی سی آنکھیں گھمانے لگی۔

نند مستری شرمندہ ہو کر بار بار کہنے لگا...... ''دیکھا بابو جی دیکھا؟ ابھی تک اسے جاتی کا غرور ہے۔ دیکھا آپ نے میں ہوں اسی لیے برداشت کر لیتا ہوں اور کوئی ہوتا تو......'' بیس سال کی اس گھروالی کی طرف دیکھ کر وہ بے چارہ اپنی بات بھی مکمل نہ کر سکا۔ میں اور کچھ نہ بولا اور اس سے ایک گلاس لے کر وہاں سے چل دیا۔ اوپر پہنچ کر اس ویشنوی کی باتیں یاد کر کے میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا لیکن لمحہ بھر بعد ہی سوچا یہ تو ایک عام اور معمولی ان پڑھ عورت ٹھہری لیکن گاؤں اور شہروں میں بھی کیا ایسے بے شمار تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہیں جو آئے دن اسی قسم کے مضحکہ خیز فعل کیا کرتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی کرتے رہو لیکن کھانا چھونا بچا لینے سے کوئی پاپ نہیں ہوتا، تب ممکن ہے کہ اس ملک کے مردوں کا حال دیکھ کر ہنسی نہیں آتی ہنسی آتی ہے صرف عورتوں کی حالت دیکھ کر۔ آج سر شام ہی آسمان میں تھوڑے بادل جمع ہو رہے تھے۔ رات ایک بجے کے بعد معمولی سی بارش ہوئی اور ہوا بھی

چلی۔ جس کے سبب جہاز خوب ہلا جلا مگر دوسرے ہی دن صبح سے وہ پرسکون انداز سے چلنے لگا۔ جس کو سمندری بیماری کہتے ہیں میری وہ خرابی تو شاید بچپن میں ہی کشتی پر ہی رفع ہو چکی تھی اس لیے مجھے بالکل کوئی تکلیف نہ ہوئی البتہ نند مستری کے کنبہ کے ساتھ کیا حالت ہوئی...... رات کس طرح کٹی یہ معلوم کرنے کے لیے میں نیچے جا پہنچا۔ کل کے گویوں میں سے بیشتر اس وقت تک بھی اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ رات کی خرابی کی وجہ سے ہی یہ لوگ ابھی تک گانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ نند مستری اور اس کی بیس سال کی گھروالی دونوں سنجیدہ بنے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پرنام کیا۔ ان کے چہرے کے جذبہ سے معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے ہی دونوں میں کچھ لڑائی جھگڑا ضرور ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا...... ''رات کیا حال رہا مستری جی؟''

نند بولا...... ''اچھا رہا''

اس کی گھروالی گرج اٹھی...... ''خاک اچھا رہا! میاری میا، کیسا ہنگامہ ہو گیا۔'' قدرے بے تاب ہو کر میں نے پوچھا...... کیسا ہنگامہ۔''

نند مستری نے میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر جمائی لی، چٹکیاں بجائیں اور آخر کار کہا...... ''ہنگامہ تو کچھ ایسا نہیں تھا بابو جی، کہتا ہوں، کلکتے کی گلیوں کے موڑوں پر ساڑھے بیس طرح کا چبینا بیچتے ہوئے آپ نے کسی کو دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہو تو ہم لوگوں کی حالت کو آپ بخوبی سمجھ سکیں گے۔ وہ جس طرح انگوٹھے کے نیچے دو تین انگلیوں کی چوٹ مار کر بھنے ہوئے چاول، دال مٹر، مسور، چنے سیم کے بیج وغیرہ سب کو ملا کر دیتا ہے۔ دیوتا کی مہر سے ہم سب بھی عین اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب کوئی اپنے اپنے کپڑے پہچان کر پھر اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹگر کی طرف دیکھ کر بولا...... ''بابو جی، قسمت سے اصل ویشنوی کی جاتی نہیں جاتی ورنہ میری ٹگر......''

ٹگر بھوکے شیر کی طرح گرج اٹھی...... ''اب پھر وہی''

''نہیں، تو جانے دو'' کہہ کر نند مستری اداس ہو کر دوسری طرف دیکھتا ہوا خاموش ہو گیا۔

ایک کابلی میاں بیوی جو نحوست کا مجسمہ تھے سر سے پاؤں تک زمین کی تمام گندگی لادے ہوئے نہایت رغبت کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ مشتعل ٹگر ان بدنصیبوں کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر شعلہ زیر ہو رہی تھی۔ نند نے اپنی گھروالی کو مخاطب کر کے پوچھا...... ''تو پھر آج کھانا پینا کچھ نہ ہوگا، کیوں؟''

گھروالی نے کہا...... 'موت اور کسے کہتے ہیں، ہوگا کیسے سنوں تو؟''

معاملہ نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے میں نے پوچھا...... ''ابھی تو کافی سویرا ہے...... کچھ دن چڑھ

آنے پر......"

نند میری طرف دیکھ کر بولا...... "کلکتے سے ایک ہانڈی میں عمدہ رس گلے لایا تھا بابو جی جہاز پر سوار ہونے تک کہتا رہا، آدٹگر کچھ کھا لیکن۔ روح کو ایذا نہ دیں، لیکن نہیں...... لیکن نہیں......" میں رنگون لے جاؤں گی، (ٹگر سے) لے اب لے جا رنگون، کیا لے جاتی ہے!"

ٹگر نے اس سخت الزام کا صاف طور سے کوئی جواب نہ دے کر غرور سے میری طرف دیکھا اور پھر اس بدنصیب کابلی کو اپنی نظر سے پہلے کی مانند جلانے لگی۔

میں نے آہستہ سے پوچھا...... "رس گلوں کا کیا ہوا؟"

نند ٹگر کو مخاطب کر کے طنز سے بولا...... "ان کا کیا ہوا یہ کہہ نہیں سکتا وہ دیکھیئے چھوٹی ہانڈی اور وہ دیکھیئے چھونے پر گرا ہوا رس۔ اس سے زیادہ کچھ جاننا چاہو تو پوچھو اس حرامزدے سے اتنا کہہ کر ٹگر کی نگاہوں کا تعاقب کر کے وہ بھی تیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکتے ہوئے منہ نیچا کر کے کہا...... "تو جانے دو، کیا تمہارے پاس چڑوا تو ہے؟"

نند بولا...... اس طرف سے بھی چھٹی مل گئی ہے۔ بابو جی کو ایک دفعہ دیکھا تو دو ٹگر!"

ٹگر نے ایک چھوٹی سی پوٹلی کو پاؤں سے ٹھکراتے ہوئے کہا" دکھا دو نہ تم ہی۔"

نند بولا...... "جو بھی کہو بابو، کابلی قوم نمک حرام نہیں کہی جا سکتی۔ یہ لوگ جس طرح رس گلے کھا جاتے ہیں اسی طرح اپنے کابل کی موٹی موٹی روٹیاں بھی باندھ دیتے ہیں۔ پھینکنا نہیں ٹگر، رکھ چھوڑ، تمہارے ٹھاکر جی کے بھوگ کے کام میں آجائیں گی۔"

نند کے اس مذاق پر میں زور سے ہنس پڑا مگر دوسرے ہی لحہ ٹگر کے منہ کی طرف دیکھ کر ڈر گیا۔ غصہ کے مارے اس کا تمام چہرے سیاہ پڑ گیا۔ بلند لہجہ میں جہاز کے تمام مسافروں کو چونکا کر وہ چلا اٹھی...... "جاتی تک مت جانا بھلا مستری! کہے دیتی ہوں...... اچھا نہ ہوگا، ہاں!"

اس کی چلاہٹ سے جن لوگوں نے منہ اٹھا کر اس طرف دیکھا، ان کی حیران نگاہوں کے روبرو، شرم کے مارے نند کا چہرے ذرا سا نکل آیا۔ ٹگر کر وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اپنی بے موقعہ اور واہیات دل لگی کی وجہ سے پیدا ہوئے اس کے غصے کو کسی طرح فرو کرنے میں ہی اس کی خیریت تھی۔ شرمندہ ہو کر وہ فوراً بول اٹھا...... سر کی قسم ٹگر، غصے مت ہو میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔"

ٹگر نے گویا یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ پتلیاں اور بھوئیں ایک دفعہ بائیں طرف اور ایک دفعہ دائیں طرف گھما کر اور گلے کے لہجہ پر ایک اور پردہ چڑھا کر وہ بولی...... "مذاق کیسا؟ جاتی کے متعلق بھی

کوئی مذاق کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی روٹیوں سے بھوگ لگایا جائے گا؟ کیوٹ کے منہ میں آگ۔ ضرورت ہو تو تم ہی رکھ چھوڑو۔ باپ کے نام پر ان کا پنڈ دان کرا دینا۔"

رسی کھول دینے سے کمان جس طرح سیدھی ہو جاتی ہے نند اسی طرح سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ٹگر کا جھونٹا، پکڑ لیا...... "حرامزادی تو باپ تک جاتی ہے۔"

ٹگر کمر کا کپڑا سنبھالتے ہوئے ہانپتے ہانپتے بولی...... "اور حرامزادے تو جاتی تک جائے گا۔"

اتنا کہہ کر کانوں تک منہ پھاڑ کر اس نے نند کے بازو کے ایک حصہ میں کاٹ کھایا۔ چشم زدن میں ہی نند مستری اور ٹگر ویشنوی کی کشتی گہری ہو اٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ جمع ہو گئی۔ سمندر کی بیماری کی تکلیف کو بھول کر ہندوستانی واہ واہ کرنے لگے۔ پنجابی چھپی چھپی کرنے لگے اڑیا چیں چیں کرنے لگے ایک طرح سے مکمل لنکا کانڈ، مچ گیا۔ میں سناٹے میں آ گیا اور میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اتنی معمولی سی بات پر شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اس قسم کا برہنہ ناچ ہو سکتا ہے اس کا میں تصور تک بھی نہ کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ وہ ایک بنگالی شوہر اور بیوی کی طرف سے یہ سب کچھ جہاز بھر کے لوگوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں زمین میں گڑا جانے لگا۔ قریب ہی ایک جونپوری دربان نہایت اطمینان کے ساتھ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولا...... "بابو جی، بنگالن تو خوب اچھی لڑنے والی ہے، ہٹتی ہی نہیں۔"

میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ چپ چاپ گردن جھکائے کسی طرح بھیڑ کو چیرتا ہوا اوپر بھاگ آیا۔

اس دن پھر میرا دل نہ چاہا کہ نیچے جاؤں اس لیے نند اور ٹگر کی لڑائی کا خاتمہ کس طرح ہوا۔ صلح نامہ میں کون کون سی شرطیں طے ہوئیں میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن بعد میں میں نے دیکھا کہ شرائط خواہ کچھ بھی ہوں مصیبت کے وقت وہ سکریپ آف پیپرز کاغذ کا ردی ٹکڑا کسی کام نہیں آتا۔ جب جسے ضرورت ہے کھیل کی طرح اسے پھاڑ ڈالتا ہے اور دوسرے کے گھر میں گھس جاتا ہے بیس سالوں سے وہ اسی طرح کرتے آئے ہیں اور خود پرماتما بھی اس بات کی قسم نہیں لے سکتے کہ آئندہ بیس سال تک ایسا نہ کرتے رہیں گے۔

تمام دن بھر تو ابر کے ٹکڑے ادھر ادھر گھومتے رہے لیکن اب شام کو تقریباً ایک گہرا اور سیاہ بادل تمام فضائے آسمانی کو ڈھانپ کر آہستہ آہستہ سر اٹھا کر اوپر آنے لگا۔ معلوم ہوا کہ خلاصیوں کی آنکھوں اور چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہویدا ہو اٹھے ہیں۔ ان کی نقل و حرکت میں بھی ایک قسم کی پریشانی نظر آنے لگی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی۔

ایک بوڑھے سے خلاصی کو بلا کر پوچھا...... ''اجی چودھری جی، آج رات کو بھی کل کی طرح طوفان آئے گا کیا؟

التجا ہے چودھری بھی قابو میں آ گئے کھڑے ہو کر بولے...... آقا، نیچے چلے جایئے، کپتان نے کہا ہے سائی کلون (طوفان) اٹھ سکتا ہے۔''

پندرہ منٹ بعد ہی دیکھا کہ اس کی بات غلط نہ تھی جتنے بھی مسافر اوپر تھے ان سب کو خلاصی لوگ جبراً ہولڈر میں اتارنے لگے۔ دو چار لوگوں کے اعتراض کرنے پر سیکنڈ آفیسر نے خود آ کر انہیں دھکے مار کر اٹھا دیا اور ان کے بستر وغیرہ کو لاتوں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا ٹرنک بستر تو خلاصی لوگ جھٹ پٹ نیچے اٹھا لے گئے۔ مگر میں خود ایک طرف کھسک گیا۔ میں نے سنا کہ سب کو...... یعنی جو بد قسمت دس روپے سے زیادہ کرایہ نہ دے سکتے تھے انہیں جہاز کے پیٹ میں (اندر) بھر کر اس کا منہ بند کر دیا جائے گا۔ ان کی اور جہاز کی خیریت کے لیے یہی ایک طریقہ تھا۔

لیکن مجھے خود اپنے لئے خیریت کا یہ طریقہ بالکل ہی پسند نہ آیا۔ اس سے پیشتر سائی کلون جیسی شے کو سمندر تو کیا خشکی پر بھی کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے اس بات کا اندازہ کر لیا کہ اس کی شکل وصورت کیا ہوتی ہے اور اس میں تباہی کرنے کی کتنی طاقت ہوتی ہے۔ یہ بالکل ہی مشکل امر تھا۔ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگر میری قسمت میں اس مصیبت سے دوچار ہونا لکھا ہی ہے تو میں اسے اچھی طرح دیکھے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے ہو کر ہی رہے گا اور طوفان میں اگر غرق ہونا ضروری ہی ہے تو پلیگ کے چوہے کی طرح پنجرے میں قید ہو کر اوپر سر پٹک پٹک کر کھارے پانی میں کیوں مروں؟ اس کی نسبت تو جہاں تک ہو سکے ہاتھ پاؤں ہلا کر، لہروں کے جھولے پر جھومتے اتراتے ہوئے ایک غوطہ لگا کر پاتال کے شاہی محل کا مہمان ہونا کہیں زیادہ اچھا ہے۔ مگر یہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ راجا کا جہاز اپنے آگے پیچھے لاکھوں کروڑوں پیروؤں کو ساتھ لئے بغیر کالے پانی میں ایک قدم بھی نہیں چلتا اور انہیں لوگوں کا ناشتہ کر ڈالنے میں گھڑی بھر کی دیر بھی نہیں لگتی۔

بہت دیر سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی شام کے قریب ہوا اور بارش دونوں کا ہی زور بڑھ گیا یہ حالت ہو گئی کہ بھاگ نکلنے کا بھی کوئی راستہ نہ رہا۔ جہاں بھی ممکن ہو آسانی سے پناہ کی کوئی جگہ تلاش کئے بغیر تو کام نہیں چل سکتا۔ شام کی تاریکی میں جب میں اپنی جگہ پر واپس آیا تو اوپر کا ڈیک خالی ہو چکا تھا۔ مستول کے پاس اچک کر دیکھا کہ عین سامنے ہی بوڑھا کپتان ہاتھ میں دوربین لیے ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ اس خوف سے کہ یکا یک اس کی نگاہ مبارک پڑ کر اتنی مصیبت کے بعد بھی دوبارہ اسی گڑھے میں نہ گھسنا پڑے نے ایک ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں آرام سے بیٹھ سکوں۔ تلاش کرتے کرتے آخر

کار ایک ایسی جگہ مل گئی جس کا میں نے پہلے تصور ہی نہ کیا تھا۔ ایک کنارے بہت سی بھیڑوں، مرغیوں اور بطخوں کے پنجرے ایک کے اوپر دوسرے پڑے ہوئے تھے۔ اچھل کر میں انہیں کر اوپر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ ایسی محفوظ جگہ شاید تمام جہاز بھر میں کہیں نہیں ہے مگر ابھی تک بہت سی باتوں کا جاننا باقی تھا۔

بارش، ہوا، تاریکی اور جہاز کا جھولنا رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ تر ہونے لگے۔ سمندر کی لہروں کی شکل وصورت دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں سوچا شاید یہی وہ سائی کلون ہے لیکن وہ سمندر کے مقابلہ میں صرف گائے کے کھر کے گڑھے کی مانند ہی تھا اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مجھے کچھ دیر اور بھی ٹھہرنا پڑا۔ اچانک سینے میں کپکپی پیدا کرتا ہوا جہاز بھول پول بج اٹھا اوپر دیکھا تو معلوم ہوا کسی سحر کے اثر سے آسمان کا چہرہ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ بادل اب نہیں رہے۔ ایسا معلوم ہوا کہا چاروں طرف سے پھٹ کر اور ہلکا ہو کر آسمان اوپر کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ سمندر کے ایک حصہ سے ایسی خوفناک گرج سنائی دی کہ اس کو ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں۔

لڑکپن میں، اندھیری راتوں دادی کی چھاتی سے لگ کر ایک کہانی سنا کرتا تھا کسی راجہ کے بیٹے نے ڈبکی لگا کر تالاب کے اندر سے چاندی کی ایک ڈبیا نکالی تھی اور اس نے سات سو راکششوں کی جان سونے کے ایک بھونرے کو چٹکی سے مسل کر مار ڈالا تھا اور اس کے بعد ان راکششوں کی سات سو بیویاں موت کے غم سے نڈھال ہو کر چیختی چلاتی اور تمام روئے زمین کو پاؤں کے بوجھ سے کچل کر چور چور کرتی ہوئیں دوڑ آئی تھیں۔ ایسا ہی کوئی یہ انقلاب بھی تھا لیکن فرق اتنا تھا کہ اب ان سات سو کی بجائے کروڑوں راکشش عورتیں تھیں...... وہ مضطرب و بے قرار ہو کر ہنگامہ کرتی ہوئی اسی طرف دوڑی آ رہی تھیں۔ آ بھی گئیں۔ راکشش عورتیں ہی نہیں بلکہ طوفانی ہوائیں...... تب میں نے سوچا کہ ان کی نسبت تو وہ راکشش عورتیں ہی آ جاتیں تو اچھا تھا۔

اس لرزہ خیز طوفان کی طاقت کا ذکر کرنا تو دور کی بات ہے۔ ہوش بجا کر اس کو محسوس کرنا بھی انسانی طاقت سے بعید ہے۔ تمام تر قوت تمیز گم کر کے صرف ایک ہی خیال میرے دل میں جا گزین ہو چکا تھا۔ کہ دنیا کی معیاد ختم ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میرے پاس ہی لوہے کا ایک کھونٹا تھا اور میں نے اپنے آپ کو گلے کی چادر سے اس کے ساتھ خوب کس کر باندھ رکھا تھا ہر آن میرے دل میں یہی خیال اٹھنے لگا کہ بس یہی طوفان مجھے کھونٹے سے چھڑا دے گا اور سمندر کی لہروں پر اڑا کر پھینک دے گا۔

اچانک معلوم ہوا کہ سیاہ رنگ کا پانی اندر کے دھکوں سے اچھل اچھل کر آہستہ آہستہ جہاز کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ دور نظر دوڑانے پر نگاہ پھر واپس نہ لوٹ سکی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی پہاڑ ہے لیکن

دوسرے ہی لمحہ وہم جاتا رہا تو ہاتھ جوڑ کر میں نے کہا بھگوان جس طرح تم نے یہ آنکھیں عطا کی ہیں اس طرح ان کو مبارک بھی کر دیا۔ اتنے دنوں تک تو دنیا میں ہر جگہ آنکھیں کھولے گھومتا پھرا ہوں مگر تمہاری یہ دنیا تو میں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے ایک جسم اور کوہ آسا لہر سر پر چاندی کا تاج زیب کئے تیز رفتار سے آگے بڑھتی آ رہی ہے۔ دنیا میں اتنا بڑا اعجوبہ اور بھی کہیں ہے؟

سمندر کی راہ نا معلوم کتنے لوگ آیا جایا کرتے ہیں۔ میں خود بھی تو کتنی ہی مرتبہ اس راستے آیا گیا ہوں مگر ایسا منظر تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ جس انسان نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اسے سمجھا کر بتانا تصور کے باپ کی بھی طاقت میں نہیں کہ پانی کی لہر اتنی بڑی ہو سکتی ہے۔

دل ہی دل میں کہا اے لہروں کے سرتاج، تمہاری ایک ٹکر سے ہمارا جو کچھ ہوگا اسے تو ہم جانتے ہی ہیں لیکن ابھی تو تمہارے یہاں پہنچنے میں آدھے منٹ کی دیر ہے کم از کم اتنی دیر تک تو میں جی بھر کر تمہارا دیدار کر لوں۔"

یہ جذبہ کسی شے کی غیر معمولی بلندی اور وسعت دیکھ کر ہی اس طرح دل میں پیدا نہیں ہوا کرتا کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کے لیے ہمالیہ کا ہر ایک حصّہ کافی ہے مگر جو شے اس طرح مجسم ہو کر بھاگی چلی آ رہی تھی اس کی بے مثل طاقت نے مجھے فریفتہ کر ڈالا۔

سمندر کے پانی کے ٹکرانے سے ایک قسم کا شعلہ بار بار چمک اٹھتا ہے وہ شعلہ عجیب و غریب خطوط میں اگر اس کے سر پر نہ کھیلتا ہوتا تو سنجیدہ اور سیاہ لہروں کی تیزی میں اس تاریکی میں شاید اس طرح نہ دیکھ سکتا۔ اس وقت جتنی دور تک بھی میری نظر جاتی تھی اتنی دور تک اس روشنی نے چھوٹے چھوٹے جزیروں کو جلا کر اس خوفناک خوبصورتی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔

جہاز کا بھول پون بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لگا تار کانپتی ہوئی آواز میں بجنے لگا اور خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے ملاحوں کا گروہ اللہ کے کانوں تک اپنی فریاد پہنچانے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر ایک ساتھ چلانے لگا۔

جس کی تشریف فرمائی سے اتنا خوف، اتنی چیخ و پکار، اتنی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی وہ عظیم لہر آخر آ پہنچی۔ ایک خوفناک قسم کی الٹ پلٹ کے درمیان ہر دلبھ کی طرح ہمیں معلوم ہو کہ ہم ڈوب گئے ہیں اس لیے درگاہ کا نام جپنے سے اب کیا حاصل ہوگا؟ آس پاس اوپر نیچے چاروں طرف سیاہ پانی ہی پانی ہے۔ جہاز کے ہمراہ سب لوگ پاتال کے شاہی محل میں دعوت کھانے جا رہے ہیں۔ اس میں اب کوئی شک نہ رہا۔ اس وقت فکر صرف یہی تھا کہ دعوت کا سامان اور کھانا پینا وہاں کس قسم کا ہوگا؟

تقریباً ایک منٹ بعد ہی دکھائی دیا...... "نہیں...... ڈوبے نہیں ہیں۔ جہاز کے ساتھ ہم سب

صرف پانی کے اوپر تیر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لہر پر لہر آنے کا سلسلہ بھی ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اتنی دیر بعد اب معلوم ہوا کہ کپتان صاحب نے سب لوگوں کو جانوروں کی طرح گڑھے میں بند کر کے تالا لگوا دیا تھا۔ ڈیک کے اوپر سے گاہے گاہے پانی کی دھار بہنے لگی۔ میرے نیچے کی بطخیں اور مرغیاں کتنی ہی مرتبہ پھڑ پھڑا کر اور بھیڑیں کئی بار میں میں، کر کے مر گئیں۔ صرف میں ہی ان کے اوپر پناہ لیے ہوئے لوہے کے کھونٹے کو زور سے پکڑے ہوئے سانس کی آمد و رفت کو قائم رکھ سکا۔

اسی وقت ایک اور آفت آ سوار ہوئی۔ صرف پانی کے چھینٹے ہی جسم میں سوئی کی طرح نہیں چبھ رہے تھے بلکہ تمام کپڑے اور دھوتی تک کے بھیگ جانے کی وجہ سے نہایت تیز ہوا سے اتنی سخت سردی لگنے لگی کہ دانت کٹا کٹ بجنے لگے۔ خیال آیا کہ فی الحال پانی میں ڈوبنے سے تو کسی طرح بچ بھی سکتا ہوں لیکن نمونیا کے ہاتھوں کس طرح نجات پاؤں گا اور یہ تو میں نے بلا شک و شبہ محسوس کر لیا کہ اسی طرح اگر اور بھی کچھ دیر بیٹھا رہا تو نجات پانا سچ مچ ہی ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا جس طرح بھی ہو اس جگہ کو چھوڑ کر کسی اور جگہ پناہ لینی چاہیے جہاں پانی کے چھینٹے برچھی کی نوک کی طرح میرے جسم میں نہ چبھیں۔ ایک بار سوچا کہ بھیڑوں کے پنجرے میں گھس جاؤں تو کیسا ہو؟ لیکن وہ بھی کتنا محفوظ ہے؟ اس کے اندر اگر کھارے پانی کی لہر داخل ہو جائے تو میں میں کر کے نہ سہی لیکن بالآخر ماں ماں، کر کے تو ضرور ہی اپنا قصہ ختم کرنا ہی پڑے گا۔

صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ جہاز جب اپنی چال تبدیل کرتا ہے تو بھاگنے کا کچھ موقع مل جاتا ہے اس لیے اس وقت اگر اور کہیں جا کر گھس سکوں تو شاید جان بچ جائے۔ جو سوچا تھا وہی کیا مگر پنجروں پر سے نیچے اتر کر تین بار دوڑ کر اور تین بار بیٹھ کر جب کسی طرح سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے لوہے کے دروازے نے ہزار دھکا مشتی کرنے پر بھی راستہ نہ دیا۔ اس لئے راستہ پھر طے کر کے اسی طرح فسٹ کلاس کے دروزے پر آ حاضر ہوا۔ اس دفعہ قسمت نے خوش ہو کر اس نرالے کمرہ میں پناہ دے دی اور ذرا سا بھی پس و پیش کئے بغیر میں دروازہ بند کر کے پلنگ پر جا سویا۔

رات کے بارہ بجے سے پہلے ہی طوفان تو تھم گیا لیکن سمندر کا غصہ اگلے دن صبح تک بھی فرد نہ ہوا۔

میرے سامان اور دیگر ہمراہی مسافروں کا کیا حال ہوا اور خصوصاً بیوی کے ساتھ مستری جی نے رات کس طرح گزاری۔ یہ جاننے کے لیے میں صبح نیچے اتر گیا۔ کل نند مستری نے ذرا سی دل لگی کرتے ہوئے کہا تھا کہ بابو جی ساڑھے بتیس قسم کے چیتے کی طرح ہم لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے

تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے سب لوگ اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھے ہیں۔ آج کا گھتم گتھا ساڑھے بتیس قسم میں شمار ہوسکتا ہے یا نہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں مگر اس وقت کوئی بھی اپنی اصلی جگہ پر لوٹ کر جانے نہ پایا تھا یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ان لوگوں کی حالت دیکھ کر سچ مچ ہی رونا آ گیا۔ ان تین چار سو مسافروں میں سے کسی کی طاقت کی بات تو کجا...... شاید صحیح و سالم بھی کوئی نہیں بچا تھا۔ عورتیں جس طرح سل پر بٹے سے مصالحہ رگڑتی ہیں کل کا سائی کلون تمام رات بھر اسی طرح ان لوگوں کا مصالحہ رگڑتا رہا۔ ساز و سامان کے ساتھ صندوق پیٹیوں وغیرہ کے ساتھ یہ سب لوگ رات بھر جہاز کے اس کنارے سے اس کنارے تک لڑھکتے پھرتے رہے تھے اور دوسری دوحاجات اس کثرت سے ہو گئیں کہ بدبو کے مارے کھڑا ہونا بھی دوبھر ہو رہا تھا اور اس وقت ڈاکٹر بابو جہاز کے مہتر اور ملاحوں کو ساتھ لیے ان لوگوں کی صفائی کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اوپر سے نیچے تک بار بار میرا ملاحظہ کر کے شاید مجھے سیکنڈ کلاس کا مسافر خیال کئے بیٹھے تھے۔ نہایت استعجاب کے ساتھ بولے جناب تو خوب تازہ نظر آ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آرام فرمانے کے لیے کوئی ہیماک (جہاز پر رہنے والا ایک طرح کا جھولن کھٹولا (Hamock) مل گیا ہوگا، کیوں نا؟''

''ہیماک'' کہاں سے ملتا صاحب! ملا تھا بھیڑوں کا ایک پنجرہ۔ اس لیے تر و تازہ معلوم ہو رہا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب منہ پھاڑ کر میری طرف دیکھتے رہ گئے میں بولا...... ''یہ ناچیز بھی اسی جہنم کا مسافر ہے لیکن کمزور ہونے کے باعث یہاں گھس نہ سکا در شروع ہی سے ڈیک کے اوپر رہا۔ کل سائی کلون کی اطلاع پا کر کچھ دیر بھیڑوں کے پنجروں پر بیٹھ کر اور رات کو فرسٹ کلاس کے کمرے میں زبردستی قبضہ کر کے جان بچائی کیا فرماتے ہیں آپ؟ میں نے کچھ ناجائز تو نہیں کیا؟''

تمام کہانی سن کر ڈاکٹر صاحب اس قدر خوش ہوئے کہ باقی دو دن کاٹنے کے لیے اپنے ذاتی کمرہ میں رہنے کی دعوت انہوں نے اس وقت دے دی۔ میں ان کی دعوت کو قبول نہ کر سکا لیکن اتنا فائدہ ضرور اٹھایا کہ صرف ایک کرسی میں ان سے لے لی۔

دوپہر کے وقت بھوک سے بے تاب ہو کر مردوں کی طرح دنیا کی تمام کھانے پینے والی چیزوں کا تصور باندھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح اور کہاں جا کر کھانے کو کچھ مل سکتا ہے؟ عین اسی وقت جب کہ میں اس تشویش میں مبتلا تھا۔ کھدر پور کے مسلمان درزیوں میں سے ایک نے آ کر کہا......

''بابو صاحب ایک بنگالی عورت آپ کو بلا رہی ہے۔''

عورت، سمجھا کہ ٹگر ہوگی، کیوں بلا رہی ہے یہ بھی اندازہ کر لینا مشکل نہ تھا۔ یقیناً ہی مستری کے ساتھ شوہر اور بیوی کے حقوق ثابت کرنے کے سوال پر اختلاف رائے ہو گیا ہوگا مگر میری ضرورت کیوں آ پڑی۔

(آ گئی پریکشا) کے سوا کسی بھی غیر آدمی نے آ کر کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو یہ سوچنا بھی مشکل ہے۔

میں نے کہا...... ''گھنٹہ بھر بعد آؤں گا کہہ دینا۔''

اس نے مغموم ہو کر کہا...... ''نہیں بابو صاحب بڑی منت سے بلا رہی ہے......''

''منت سے'' لیکن ٹگر تو منت کرنے والی عورت نہیں ہے پوچھا۔ اس کا ساتھی مرد کیا کر رہا ہے؟''

وہ بولا...... ''اسی کی بیماری کی وجہ سے تو وہ آپ کو بلا رہی ہے۔''

بیماری ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس لیے میں اٹھ کھڑا ہوا وہ مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ کافی دور ایک کونے میں لپیٹے ہوئے کچھ موٹے موٹے رسے رکھے تھے۔ ان کی آڑ میں ایک بائیس تیئس سال کی بنگالی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کو دیکھا نہ تھا۔ پاس ہی ایک نیلی شطرنجی پر تقریباً اسی عمر کا ایک نہایت کمزور اور لاغر جوان مردے کی طرح آنکھیں بند کیے پڑا تھا...... یہی بیمار تھا۔

میرے پاس پہنچتے ہی اس عورت نے آہستہ آہستہ اپنے سر کا کپڑا آگے کھینچ لیا لیکن میں اس کا چہرہ دیکھ چکا تھا۔

اس چہرے کو اگر حسین کہا جاتے تو بحث اٹھ سکتی ہے لیکن نظر انداز کر دینے کے قابل بھی نہ تھا۔ بلند پیشانی عورتوں کے حسن میں کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ تاہم اس حسینہ کی فراخ پیشانی پر سلیم عقل اور فہم و فراست کا وہ نقش دیکھا جو زندگی میں شاذ و نادر ہی دیکھا تھا۔ میری ان داجیجی کی پیشانی بھی خوب فراخ تھی۔ اس کی پیشانی بھی اس سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی مانگ میں سیندور جھلک رہا تھا۔ ہاتھ میں لوہے کی چوڑیاں اور شنکھ کی مالا کی علاوہ اور کوئی زیور نہ تھا جسم پر ایک سیدھی سادھی رنگین ساڑھی تھی۔

کوئی تعارف نہ ہونے کے باوجود بھی اتنے قدرتی لہجہ میں اس نے بات کی کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ بولی...... ''آپ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی جان پہچان ہے کیا آپ انہیں ایک دفعہ بلا سکتے ہیں؟''

میں نے کہا...... ''آج ہی ان سے جان پہچان ہوئی ہے۔تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نیک انسان ہیں لیکن انہیں بلاتی کیوں ہو؟''

اس نے جواب دیا...... ''اگر بلانے پر فیس دینی پڑتی ہو تو پھر ضرورت نہیں جس طرح بھی ہوگا یہ کچھ تکلیف اٹھا کر خود ہی اوپر چلے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے اس مریض کو دکھا دیا۔

میں نے سوچ کر کہا...... ''جہاز کے ڈاکٹر کو شاید کچھ بھی دینا نہیں ہوتا مگر انہیں ہو کیا گیا ہے؟''

میں نے سوچا تھا کہ مریض ان کا شوہر ہے لیکن بات چیت سے کچھ شک پیدا ہوا۔ اس کے منہ پر جھک کر اس نے پوچھا...... ''گھر سے چلتے وقت ہی تمہیں پیٹ کی شکایت تھی نا؟''

مریض نے سر ہلا دیا تو اس نے سر اٹھا کر کہا...... ''ہاں انہیں گھر پر ہی پیٹ کی بیماری تھی لیکن کل سے بخار آ گیا ہے۔اس وقت دیکھتی ہوں کہ بخار تیز ہو گیا ہے کچھ دوائی دیئے بغیر کام نہ چلے گا۔''

میں نے بھی خود ہاتھ ڈال کر اس کے جسم کا بخار دیکھا۔درحقیقت بخار تیز تھا۔ڈاکٹر کو بلانے کے لیے میں اوپر چلا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نیچے آئے مریض کا ملاحظہ کر کے اور دوائی کا پرزہ دے کر بولے، چلو شری کانت بابو، کمرے میں چل کر کچھ گپ شپ کریں۔''

ڈاکٹر صاحب خوب رنگین مزاج تھے اپنے کمرے میں لے جا کر بولے...... ''چائے پیتے ہیں؟''

میں نے کہا ''ہاں پیتا ہوں۔''

''اور بسکٹ؟''

''وہ بھی کھاتا ہوں''

''اچھا''

کھانا پینا ختم ہونے کے بعد دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے...... ''آپ اس عورت سے کیسے جا ٹکرائے؟''

میں نے کہا ''اس نے خود ہی مجھے بلا بھیجا تھا۔''

ڈاکٹر صاحب اس طرح سر ہلا کر بولے گویا سب کچھ جانتے ہو بولے...... ''بلانا ہی چاہئے۔ شادی وغیرہ کی ہے یا نہیں؟''

میں نے کہا...... ''نہیں''

ڈاکٹر صاحب بولے...... ''تو بس ٹکرا جاؤ ایسی کوئی بری بھی نہیں ہے۔اس آدمی کی شکل دیکھی تھی؟ اس پر ٹائیفائیڈ کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ممکن نہیں کہ وہ زیادہ دن زندہ سلامت رہے۔اس دوران میں اس پر نظر جمائے رکھنا ایسا نہ ہو کوئی اور سالا مال ہضم کر جائے۔''

میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔کہا...... ''آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

ڈاکٹر صاحب ذرا سے بھی مرعوب نہ ہوئے انہوں نے جواب دیا...... ''اچھا وہ چھوکرا ہی اسے گھر سے بھگا لایا ہے تم کیا سمجھتے ہو۔شری کانت بابو، خوب فارورڈ ہے۔ گفتگو تو خوب اچھی کرتی ہے۔''

میں نے کہا...... 'یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا؟'

ڈاکٹر صاحب بولے...... ''ہر ایک سفر میں تو دیکھتا ہوں کہ ایک ایسا کیس ہو ہی جاتا ہے گذشتہ مرتبہ بھی ایک اسی قسم کی جوڑی تھی۔ایک بار برما میں جا کر قدم تو رکھو خود دیکھ لوگے کہ میری بات سچ ہے یا نہیں۔''

ان کی برما والی بات کی حقیقت کو بعد میں میں نے خوب اچھی طرح محسوس کیا لیکن اس وقت تو میں لرزہ براندام ہو اٹھا۔ڈاکٹر صاحب سے رخصت لے کر میں نند مستری کی خبر لینے کے لیے نیچے آیا۔گھر والی کے ہمراہ پھل آہار (پھلوں کے کھانے) کی تیاری کر رہے تھے۔نمسکار کرنے کے بعد سب سے پہلے اس نے یہ سوال کیا کہ بابو یہ عورت کون ہے؟''

ٹگر سر درد ہونے کی وجہ سے اپنے سر پر ایک کپڑا پگڑی کی طرح باندھ رہی تھی۔ یک لخت پھنکار کر بول اٹھی...... ''یہ معلوم کرنے کی تمہیں کیا غرض پڑی ہے بتاؤ تو سہی؟''

مستری نے مجھے ثالث مقرر کر کے کہا...... ''صاحب دیکھی اس عورت کی اوچھی طبیعت، کون بنگالی عورت رنگون جا رہی ہے یہ دریافت کرنا بھی گویا کوئی گناہ ہے؟''

ٹگر اپنا سر درد بھول گئی اور پگڑی کو پرے پھینک کر میری طرف تاکنے لگی اس نے اپنی دونوں گول گول آنکھیں پھاڑ کر کہا...... ''صاحب! ویشنوی ٹگر نے آج تک مستری جیسے کتنے انسانوں کو باندھ بنا کر اپنے ہاتھوں سے نکال دیا ہے اب بھی کیا یہ میری تجربہ کار آنکھوں میں خاک جھونک سکتے ہیں؟ ارے تم ڈاکٹر ہو یاد ہے کہ میں جونہی ذرا سا پانی لینے کے لیے گئی تم جھٹ وہاں جا پہنچے۔کیوں وہ تمہاری کون ہے؟ یہ اچھا نہ ہوگا، کہہ دیتی ہوں مستری! اگر دوبارہ پھر کبھی جاتے دیکھوں گی تو یا تم ہو گے یا میں؟''

نند مستری نے گرم ہو کر کہا...... ''میں کیا تمہارا پالتو بندر ہوں کہ زنجیر پکڑ کر تم جس طرف لے

جاؤ گی اسی طرف جاؤں گا۔ میری خواہش ہوگی تو اس بے چارے کو دیکھنے جاؤں گا۔ تمہارے دل میں جو آئے کر۔'' اتنا کہہ کر اس نے پھل آہار میں جی لگایا۔

ٹگر نے بھی صرف ''اچھا'' کہہ کر اپنی پگڑی باندھنا شروع کر دیا۔ میں بھی وہاں سے چل دیا اور چلتے چلتے یہ سوچتا گیا کہ اسی طرح ان دونوں نے بیس سال گزار دیتے ہیں کئی مرتبہ ہاتھ جلا کر ٹگر اتنا سیکھی ہے کہ جہاں سچائی کی کوئی قید نہیں ہوتی وہاں لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا کر دینا اچھا نہیں ہوتا۔ دھوکہ کھانا ہی پڑتا ہے۔ یا تو آٹھوں پہر چوکنا ہو کر زبردستی سے اپنا قبضہ جمائے رکھنا پڑے گا ورنہ جوانی کی طرح نند مستری بھی کسی دن لاعلمی میں کھسک جائے گی۔

لیکن جس کی طرف اشارہ کر کے ٹگر کے دل میں یہ نار حسد جلی تھی اور جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے طنز کیا تھا وہ کون ہے؟ ٹگر نے کہا تھا..... ''یہی کام کرتے ہوئے میں نے اپنے بال سفید کئے ہیں۔ ایسی کوئی عورت نہیں جو میری آنکھوں میں خاک جھونک سکے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ ایسے واقعات روزانہ دیکھتے رہنے سے ان کی آنکھوں کو خاص مہارت ہوگئی ہے اور اس معاملہ میں اگر کوئی غلطی ہو تو وہ ایسی آنکھوں کا نکال پھینکنے کے لیے تیار ہیں۔

ایسا ہی قاعدہ ہے۔ دوسرے کے متعلق سوچتے وقت کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ وہ عالم الغیب نہیں ہے یا کہیں بھی اسے دھوکہ اور غلطی ہو سکتی ہے کوئی یہی کہتا ہے کہ انسان پہچاننے میں وہ بے مثل ہے اور اس معاملہ میں وہ پختہ کار جوہری ہے لیکن بااین ہمہ دنیا میں ایسی مثال ملنی مشکل نہیں کہ خود اپنے دل کو بھی کسی نے ٹھیک طور پر پہچانا ہو مگر ہاں میری طرح جس نے بھی کہیں سخت چوٹ کھائی ہے اسے یقیناً ہی محتاط ہونا پڑا ہے اور اس بات کو اسے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا میں جب ان دا جیجی جیسی عورتیں بھی ہیں تو اپنی عقل کے غرور سے دوسرے کو حقیر اور کم عقل سمجھ کر خود دانا بننے کی نسبت سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی نا سمجھ بنے رہنے میں زیادہ عقلمندی ہے لہٰذا ان دو تجربہ کار اور جہاندیدہ عورتوں کی نصیحت کو میں غلط سمجھ نہ سکا لیکن ڈاکٹر صاحب نے جو کہا تھا کہ نہایت صحیح معلوم ہوا اور محض یہی بات رہ رہ کر مجھے چبھنے لگی۔

☆☆☆

بہت رات گزر جانے پر میں دوبارہ بلایا گیا اس وقت اس عورت کا حسب نسب معلوم ہوا۔

''نام ابھیا تھا۔ اترا راڑھی کائستھ اور گھر بابو چر کے نزدیک ہے۔ جو انسان بیمار پڑا ہے وہ گاؤں کے رشتہ سے بھائی ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے رونی سنگھ۔'' دوائی سے رونی سنگھ کو کافی فائدہ ہے۔'' اس طرح کہنا شروع کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں ابھیا نے مجھے اپنا راز دار بنا لیا لیکن مجھے یہ تو تسلیم کرنا ہی چاہیے

کہ میرے دل میں بلا خواہش ہی اگرچہ سخت تنقید کا جذبہ برابر بیدار ہوا اٹھا تھا تاہم اس عورت کی تمام تر گفتگو کے درمیان میں کسی جگہ بھی کوئی نامناسب یا غیر موزوں مقام تلاش نہ کر سکا۔

ابھیا میں دوسرے کو قابو کر لینے کی حیرت انگیز طاقت تھی۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف میرا نام اور پتہ ہی دریافت کر لیا بلکہ میں اس کے لاپتہ شوہر کو جس طرح بھی ممکن ہوگا تلاش کر دوں گا'' اس بات کا وعدہ بھی مجھ سے لے لیا۔ اس کا شوہر آٹھ سال پہلے برما میں ملازمت کرنے کے لیے آیا تھا۔ دو سال تک اس کے خط وغیرہ آتے رہے لیکن اب لگاتار چھ سالوں سے اس کا کچھ پتہ نہیں ہے گھر پر قبیلے کا اور کوئی نہیں ہے۔ ماں تھیں وہ بھی تقریباً ایک مہینہ پہلے گزر گئیں۔ باپ کے گھر کسی نگران سے محروم ہو کر رہنا ناممکن سمجھ کر بھائی کو رضامند کر کے برما آئی ہے۔

کچھ دیر خاموش رہ کر یکایک وہ بول اٹھی..... ''اتنی سی کوشش بھی نہ کر کے اگر گھر میں ہی پڑی رہتی تو کیا یہ میرے حق میں اچھا ہوتا اس کے علاوہ اس عمر میں بدنامی خریدتے لیتے کتنی دیر لگتی ہے؟''

میں نے پوچھا..... ''کیا آپ جانتی ہیں کہ اتنے دنوں تک انہوں نے تمہاری کوئی خبر کیوں نہیں لی؟''

''اس سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کچھ معلوم ہے؟''

''جانتی ہوں، رنگون میں ہی تھے۔ برما ریلوے میں کام کرتے تھے مگر کتنے ہی خط لکھے کبھی کوئی جواب نہ ملا اور کبھی کوئی خط واپس بھی نہ آیا۔''

یہ تو فیصلہ شدہ امر تھا کہ ہر خط ابھیا کے شوہر کو مل گیا ہے مگر اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ اس کے متعلق میں نے ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب سے سنا تھا۔ بیشتر بنگالی وہاں کسی برمی حسینہ کو گھر بٹھا کر نئی گرہستی بسا لیتے ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو عمر بھر واپس نہیں آتے۔

مجھے خاموش دیکھ کر ابھیا نے پوچھا..... ''کیا آپ یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ زندہ نہیں ہیں؟''

میں نے سر ہلا کر جواب دیا..... ''بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ زندہ ہیں یہ تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔''

ابھیا نے فوراً میرے پاؤں چھو کر پرنام کیا اور کہا..... ''آپ کے منہ میں پھول چندن پڑیں، شری کانت بابو، میں اور کچھ نہیں چاہتی، وہ زندہ ہیں۔ بس اتنا ہی میرے لیے کافی ہے۔''

میں پھر خاموش ہو رہا۔ ابھیا خود بھی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی..... ''آپ کیا سوچ رہے ہیں یہ میں جانتی ہوں۔''

''جانتی ہو؟''

''جانتی کیوں نہیں؟ آپ مرد ہو کر بھی جس بات کا خیال کر رہے ہیں۔ عورت ہوتے ہوئے

بھی کیا مجھے ڈر نہ ہوگا؟'' رہنے دیجئے، مجھے اس کا ڈر نہیں ہے میں اپنی سوت کے ساتھ مزے سے گرہستی چلاسکوں گی۔''

پھر بھی میں خاموش ہی رہا مگر میرے دل کی بات کا اندازہ کرنے میں اس سمجھدار عورت کو کچھ بھی دیر نہ ہوئی بولی...... ''آپ سوچ رہے ہیں کہ گرہستی چلانے کے لیے اکیلے میری رضامندی سے کام نہ چلے گا۔ میری سوت کا رضامند ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ یہی سوچ رہے ہیں نا؟''

میں بھونچکارہ گیا اور بولا...... ''ٹھیک ہے اگر ایسا ہی ہو تو پھر تم کیا کرو گی؟''

اس بار ابھیا کی آنکھیں چھلچھلا آئیں۔ وہ میرے منہ کی طرف اپنی تیز نگاہیں جما کر بولی...... ''ایسی مصیبت میں آپ مجھے کچھ بھی امداد نہ دیں گے۔ شری کانت بابو میرے بھیا بڑے سیدھے سادے نیک انسان ہیں اس لئے اس وقت ان سے تو میری کوئی بھلائی نہ ہوگی۔''

رضامند ہو کر میں نے کہا...... ''بن پڑے گا تو ضرور تمہاری مدد کروں گا مگر ان معاملات میں غیر لوگوں کے ذریعہ عموماً کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا بلکہ الٹا نقصان ہو جاتا ہے۔''

''یہ سچ ہے'' کہہ کر ابھیا کچھ سوچنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے دن گیارہ بارہ بجے کے درمیان جہاز رنگون پہنچنے والا تھا لیکن صبح ہونے سے پیشتر ہی سب لوگوں کی آنکھوں اور چہروں پر خوف اور پریشانی کے نشانات نظر آنے لگے۔ چاروں طرف سے ایک آواز سنائی دینے لگی کیرونٹین کیرونٹین دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹھیک لفظ (Qwarantine) ہے۔ اس وقت برما کی حکومت پلیگ کے خطرہ کے پیش نظر بہت زیادہ محتاط تھی شہر سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ریت کے ایک میدان میں کانٹے دار تار سے تھوڑی سی جگہ گھیر کر بنائی گئی تھی اور اس میں بہت سی جھونپڑیاں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ڈیک کے تمام مسافروں کو بلا سوچے سمجھے اس میں اتار دیا جاتا تھا۔ وہاں اگر کسی کا کوئی رشتہ دار شہر میں ہوتا اور وہ پورٹ ہیلتھ آفیسر سے جا کر کسی سفارش سے معافی نامہ حاصل کر لیتا تو علیحدہ بات تھی۔

ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے بولے ''شری کانت بابو ایک معافی نامہ حاصل کئے بغیر آپ کا یہاں آنا مناسب نہیں ہوا۔ کارونٹین میں لے جا کر یہ لوگ انسان کو اتنا تنگ کر دیتے ہیں کہ ذبحہ خانے میں گائے بیل بھیڑ وغیرہ جانوروں کو بھی اتنی تکلیف برداشت نہیں کرنا پڑتی۔ عام انسان تو اسے کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں لیکن تکلیف تو شریف لوگوں کو ہوتی ہے۔ ایک تو یہاں کوئی مزدور نہیں ملتا۔ اپنا سامان خود اپنے ہی کندھوں پر لاد کر ایک سیدھی اور ٹوٹی پھوٹی سیڑھی سے چڑھنا اترنا پڑتا

ہے۔ اس کے بعد کل سامان وہاں کھول کر بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور سٹیم میں ابال کر برباد کر دیا جاتا ہے اور صاحب کڑی دھوپ میں تو تکلیف کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔''

بے حد خوفزدہ ہو کر میں نے پوچھا...... ''کیا اس کا کوئی حل نہیں ڈاکٹر صاحب!''

انہوں نے سر ہلا کر کہا...... نہیں ہاں جب ڈاکٹر صاحب جہاز پر چڑھ آئیں گے تو میں ان سے کہہ دیکھوں گا۔ ان کا کلرک آگر آپ کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لئے تیار ہو گیا تو......''

لیکن ان کی بات پوری ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ باہر ایک واقعہ ہوا جس کی یاد سے میں خود بھی شرم کے مارے مرا جاتا ہوں۔ کچھ گول مال سن کر دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ جہاز کا سیکنڈ آفیسر چھ سات ملاحوں کو بے دھڑک ٹھوکریں مار رہا ہے اور وہ بوٹ کی ٹھوکریں کھا کر جہاں ہو سکتا ہے بھاگ رہے ہیں۔''

یہ انگریز نوجوان بڑا اکھڑ تھا اس لیے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس کی پہلے بھی جھڑپ ہو چکی تھی اور آج پھر ایک جھڑپ ہو گئی۔

ڈاکٹر غصے ہو کر بولے...... ''تمہارا یہ فعل مذمت کے قابل ہے کسی دن اس کے لیے تمہیں نادم ہونا پڑے گا۔''

وہ پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور بولا...... ''کیوں؟''

ڈاکٹر صاحب کچھ سودیشی خیال کے تھے وہ غصے سے کہنے لگے...... ''یہ لوگ جانور نہیں ہیں غریب انسان ہیں۔ ہمارے آدمی فطرتاً نرم دل اور امن پسند ہونے کی وجہ سے کپتان صاحب سے تمہاری شکایت نہیں کرتے اسی لئے تم کو ظلم کرنے کا حوصلہ ہوا ہے۔''

یکا یک صاحب کا منہ ایک طنزیہ ہنسی سے بھر گیا ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ کھینچ کر اس نے انگلی سے دکھاتے ہوئے کہا......

Look Doctor there's your countrymen, you ought to be proud of them

(ڈاکٹر یہ دیکھو تمہارے ملک کے آدمی، تمہیں ان پر ضرور فخر ہونا چاہئے)

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، کچھ اونچے کنستروں کی آڑ میں کھڑے ہو کر وہ لوگ دانت باہر نکال کر ہنس رہے ہیں اور اپنے جسم پر پڑی ہوئی گرد کو جھاڑ رہے ہیں۔ صاحب تھوڑا سا ہنس کر اور ڈاکٹر کے منہ پر دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے ہلا کر دائیں بائیں گھومتا ہوا سیٹی دیتا ہوا نکل گیا۔ فتح یابی کا ایک غرور اس کے جسم سے پھوٹ پڑنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب کا چہرہ شرم، ندامت اور غصّے کے مارے سیاہ پڑ گیا۔ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ غضبناک لہجہ میں بولے...... ''بے حیا سالو، دانت باہر نکال کر ہنس رہے ہو۔''

اس دفعہ اتنی دیر بعد دیسی لوگوں کی خودداری شاید واپس لوٹ آئی۔ سب لوگوں نے ایک ساتھ ہنسنا بند کر کے تیزی سے جواب دیا...... تم ڈاکٹر بابو، سالا کہنے والے کون ہوتے ہو؟ کسی کا قرض کھا کر تو ہم لوگ نہیں ہنستے؟''

میں زبردستی ڈاکٹر صاحب کو کھینچ کر ان کے کمرے میں واپس لے آیا۔ کرسی پر دھم سے گرتے ہوئے ان کے منہ سے صرف اوں، نکلا۔ اور دوسری کوئی بات ان کی زبان سے باہر نکلنی بھی ممکن نہیں تھی۔ گیارہ بجے کے قریب کارنٹین کے پاس ایک چھوٹا سا سٹیمر آ کر جہاز کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیک کے تمام مسافروں کو یہ سٹیمر اس خوفناک مقام میں لے جائے گا۔ مال واسباب باندھنے کی دھوم مچ گئی۔

مجھے کوئی خاص جلدی نہ تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا آدمی ابھی کہہ گیا تھا کہ مجھے وہاں جانا نہ پڑے گا۔ اس لیے میں کھڑا کھڑا مسافروں اور ملاحوں کی چلاہٹ نہایت اطمینان سے سن رہا تھا دفعتہً پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا کہ ابھیا کھڑی ہے۔ حیرت سے پوچھا...... ''آپ یہاں کیسے؟''

ابھیا بولی...... ''کیوں کیا اپنا سامان وغیرہ نہ باندھو گے؟''

میں نے کہا...... ''نہیں مجھے ابھی کافی دیر ہے۔ مجھے وہاں جانا نہیں پڑے گا۔ سیدھے شہر میں کر جا کر اتروں گا۔''

ابھیا بولی...... ''نہیں جلدی سے اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کر لینا چاہیے۔''

میں نے کہا...... مجھے اب بھی کافی وقت ہے۔''

ابھیا نے خوب زور سے سر ہلا کر کہا...... ''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے چھوڑ کر آپ کسی طرح بھی نہ جا سکیں گے۔'

میں نے حیران ہو کر جواب دیا...... ''یہ کیا میں جا نہ سکوں گا۔''

ابھیا بولی...... ''تو پھر میں جا نہ سکوں گی۔ میں سمندر میں کود سکتی ہوں لیکن اکیلی وہاں نہ جا سکوں گی۔ وہاں کی تمام باتیں سن چکی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں حواس باختہ سا ہو کر بیٹھا رہا۔ یہ کون ہے جو زبردستی آہستہ آہستہ زور ڈال کر اپنی زندگی کے ساتھ جکڑ رہی ہے؟ آنچل سے آنکھیں پونچھ کر وہ بولی...... ''مجھے تنہا چھوڑ کر کیا تم چلے جاؤ گے، مجھے تو کبھی یہ

خیال بھی نہ تھا کہ آپ اتنے بے رحم ہیں۔ اٹھئے، نیچے چلئے آپ نہ ہوں گے تو اس بیمار انسان کو ساتھ لے کر میں اکیلی کیا کروں گی؟ آپ ہی بتائیے؟''

اپنا سامان لے کر جب میں چھوٹے سٹیمر پر سوار ہوا تو ڈاکٹر صاحب اوپر کے ڈیک پر کھڑے تھے۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ ہاتھ ہلا کر چلاتے ہوئے بولے...... ''نہیں نہیں آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔ لوٹ آئیے، لوٹ آئیے۔ آپ کے لیے اجازت مل گئی ہے آپ......''

میں نے بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا کر کہا...... ''ہزار ہزار شکریہ؟ لیکن ایک اور حکم ہے مجھے جانا ہی پڑ رہا ہے۔''

دفعتہً ان کی نگاہ ابھیا اور روہنی پر گئی وہ مسکراتے ہوئے بولے...... 'پھر مجھے بیکار ہی تکلیف کیوں دی؟'

''اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔''

''نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی جانتا تھا...... گڈبائی، یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے چہرے سے چلے گئے۔

کارونٹین نام کے قید خانہ میں بھیجنے کا قانون صرف قلیوں کے لیے ہے شریفوں کے لیے نہیں اور جو شخص جہاز کا کرایہ دس روپیہ سے زیادہ ادا نہیں کرتا قانون کی نگاہ میں وہی قلی ہے۔ پرانے کے باغیچوں کا ضابطہ اس کے متعلق کیا کہتا ہے مجھے معلوم نہیں لیکن جہاز کا قانون یہی ہے اور ذمہ دار افسران تجربہ کی بنا پر کیا سمجھتے ہیں یہ تو وہی جانیں مگر قانونی طور پر اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے اس سفر میں ہم سب قلی تھے اور صاحب لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قلی کی زندگی میں سفر کے لیے سامان کچھ خاص زیادہ ممکن نہیں اور بالکل ہی نہ ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ تا کہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے کے لیے کندھوں پر اٹھانے کی ضرورت ہی در پیش نہ ہو۔ اس لئے اترنے کے گھاٹ پر کارونٹین مسافروں کا سامان لے جانے کا اگر کوئی انتظام نہیں ہے تو اس کے لیے ناراض ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ گو یہ حقیقت ہے تاہم یہ سب ہماری قسمت کی برائی ہی سمجھئے کہ ہم تین جانوں کے سر پر آگ برساتا ہوا آفتاب اور پاؤں تلے اس سے بھی زیادہ تپتی ہوئی ریت، ایک بڑے سے اجنبی دریا کے کنارے بڑے بڑے گٹھڑ سامنے رکھ کر بدحواس ہو کر ایک دوسرے کا منہ تاکتے ہوئے کھڑے تھے۔ ساتھ کے مسافروں کا حال پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ وہ لوگ اپنے لوٹے کمبل پیٹھ پر رکھ کر اور اپنا سامان اپنی اپنی بیویوں کے سر لاد کر مزے سے مقررہ مقام پر چلے گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے روہنی ابھیا بستروں کے ایک بنڈل پر کانپتے کانپتے دھم سے بیٹھ گئے۔ بخار، پیٹ کا درد اور کافی تھکاوٹ ان تمام وجوہات کے یکجا جمع ہونے سے ان کی حالت ایسی تھی کہ ان کے لیے چلنا تو در کنار بیٹھنا بھی ناممکن ہو گیا۔ لیٹ جانے میں ہی خیریت تھی۔ ابھیا ٹھہری عورت۔ اس لیے میں، میری اور ان کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں ہی بچیں۔ میری حالت قابل غور تھی۔ ایک تو بلا وجہ ہی مصیبت کے منہ میں جا رہا ہوں دوسرے ایک کندھے پر تو ایک بے بس عورت کا بار تھا اور دوسرے کندھے پر ایک مریض انسان جھول رہا تھا اور ان کے علاوہ گٹھڑیوں کا بوجھ علیحدہ۔ مجھے اسی وقت اتنی زیادہ پیاس لگ

رہی تھی کہ تمام گلا خشک ہو رہا تھا۔ ایک اجنبی جگہ میں حواس باختہ کھڑا تھا۔ میری اس تصویر کا تصور کر کے بطور ایک تماشائی کے لوگوں کو خوب لطف محسوس ہو سکتا ہے۔ کچھ صاحب دل ناظرین شاید میری اس بلاغرض نیکی کی تعریف بھی کریں گے۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ مجھ بد قسمت کا دل اس وقت جھنجھلاہٹ اور افسوس سے یکبارگی معمور ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اتنا بڑا گدھا ملک الافلاک میں بھی نہ ہو گا لیکن کمال حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرا یہ نام میرے جسم پر مرقوم نہ تھا تو بھی جہاز بھر کے اتنے لوگوں کی موجودگی میں باربرداری کے لیے صرف مجھے ہی کیوں انتخاب کیا۔

لیکن میری حیرت اور ہوئی اس کی مسکراہٹ سے اس نے سر ہلا کر ذرا سا ہنس دیا۔ اس کے خندہ چہرے کو دیکھ کر مجھے صرف تعجب ہی نہ ہوا بلکہ اس مصیبت کا عکس بھی صاف نظر آیا اور سب سے بڑھ کر تعجب تو مجھے اس دیہاتی عورت کی بات سن کر ہوا۔ کہاں تو اسے احسان مند ہو کر حیا سے زمین میں گڑ کر بھیک مانگنی چاہیے تھی اور کہاں سے اس نے ہنس کر یہ کہا...... ''کہیں یہ خیال مت کر بیٹھنا کہ خوب دھوکہ کھایا۔ جا سکتے تھے اور پھر بھی نہیں گئے اسی کا نام خیرات ہے لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ اتنی بڑی خیرات کرنے کا موقعہ زندگی میں شاید کم ہی ملے گا لیکن چھوڑ دان باتو کو۔ سامان اسی جگہ پڑا رہنے دو اور چلو دیکھیں انہیں کہیں سایہ دار جگہ میں سلا جا سکتا ہے یا نہیں بالآخر گٹھڑیوں کا لالچ چھوڑ کر میں روہنی ابھیا کو پیٹھ پر لاد کر کارونٹین کی طرف روانہ ہوا ابھیا نے صرف ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ لے کر میرا تعاقب کیا باقی تمام سامان وہاں ہی پڑا رہا۔ شکر ہے کہ وہ کھویا نہیں کوئی دو گھنٹہ بعد اس کے آنے کا انتظام ہو گیا۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ حقیقی مصیبت، مصیبت کے تخیل سے زیادہ آسان اور قابل برداشت ہوتی ہے اگر پہلے ہی اس راز کو سمجھ لیا جائے تو بہت سی پریشانوں سے نجات مل سکتی ہے لہٰذا اگرچہ کچھ کچھ دشواریاں اور تکالیف مجھے برداشت کرنا پڑیں تاہم یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہم لوگوں کی کارونٹین کی معیاد کے دن اچھی طرح سے کٹ گئے۔ اس کے علاوہ پیسہ خرچ سکنے پر جب یم راج کے ہاں بھی سسرال کی طرح عزت اور آرام حاصل کیا جا سکتا ہے تو اس کارونٹین کی حقیقت ہی کیا ہے؟

جہاز کے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ یہ صورت خوب ''فارورڈ'' ہے مگر ضرورت کے موقعہ پر یہ عورت کہاں تک ''فارورڈ'' ہو سکتی ہے اس کا شاید انہوں نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔ روہنی بابو کو جب میں نے اپنی پیٹھ سے اتار دیا ابھیا بولی...... ''بس آپ کو اب اور کچھ بھی نہ کرنا پڑے گا۔ شری کانت بابو، آپ آرام کیجئے اور جو کچھ کرنا ہو گا میں خود ہی کر لوں گی۔''

آرام کی تو مجھے سچ مچ ہی ضرورت تھی۔ پاؤں تھکاوٹ کے مارے ٹوٹ رہے تھے میں نے

حیران ہو کر پوچھا...... "آپ کیا کریں گی۔"

ابھیا نے جواب دیا...... "کام کیا کچھ کم ہے، سامان وغیرہ لانا ہوگا۔ ایک اچھا سا کمرہ تلاش کر کے آپ دونوں کے لیے بستر تیار کروینے ہوں گے۔ کھانا بنا کر جو کچھ ہو دونوں کو کھلا دینا پڑے گا...... پھر جا کر مجھے فراغت ہوگی اور تبھی تھوڑا سا بیٹھ کر آرام کروں گی۔...... نہیں نہیں، میرے سر کی قسم، اٹھیے گا نہیں، میں ابھی ابھی سب انتظام کیے دیتی ہوں۔" پھر قدرے ہنس کر کہا...... "سوچتے رہو گے کہ عورت ہو کر یہ سب انتظام اکیلی کس طرح کر سکے گی۔ یہی نا؟ لیکن کیوں نہ کر سکوں گی؟ اچھا آپ کو ہی تلاش کر لینے والا کون تھا؟ میں ہی تھی نا کہ اور کوئی؟" اتنا کہہ کر اس نے چھوٹے سے بکس کو کھولا اور اس میں سے کچھ روپے نکال کر آنچل میں باندھ لیے اور کارونٹین کے دفتر کی طرف چل دی۔

وہ خواہ کچھ کر سکے یا نہ کر سکے۔ کسی طرح بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ مل جانے سے میری جان بچ گئی۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ایک چپڑاسی مجھے بلانے آیا۔ روہنی کو ساتھ لے کر اس کے ہمراہ گیا۔ دیکھا رہائش کا کمرہ تو اچھا ہی ہے۔ میم ڈاکٹرائن صاحبہ خود کھڑے ہو کر نوکر سے سب صاف کروا رہی ہیں۔

ضروری اشیاء آ پہنچی ہیں اور دو کھاٹوں پر دو آدمیوں کے لیے بستر تک بچھا دیے گئے ہیں ایک طرف نئی ہنڈیا، چاول، دال، آلو، گھی، میدہ، لکڑی وغیرہ سب موجود ہے۔ مدراسی ڈاکٹرین کے ساتھ ابھیا ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات چیت کر رہی ہے مجھے دیکھتے ہی بولی...... "تب تک آپ کچھ نیند لے لیں، میں سر پر گھڑا ڈال کر اس وقت کے لیے چاول دال ملا کر تھوڑی سی کھچڑی تیار کیے دیتی ہوں۔ شام کے لیے پھر دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر تولیہ لے کر میم صاحبہ کو سلام کر کے ایک ملاح کو ساتھ لے کر وہ نہانے کے لیے چلی گئی...... اسی طرح اس کی نگرانی میں ہم لوگوں کے دن اچھی طرح کٹ گئے۔ یہ کہنے میں میں ذرا سی بھی مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لے رہا۔

ابھیا میں دو باتیں آخر تک دیکھ رہا تھا۔ ایسی حالت میں ایسے عورت مرد میں جن میں باہمی کوئی رشتہ نہیں ہوتا تعلقات خود بخود گہرے ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن ابھیا نے اس کا موقعہ ہی نہ دیا۔ اس کے برتاؤ میں ایک ایسی شے تھی جو ہر وقت یاد دلایا کرتی تھی کہ ہم لوگ محض مسافر ہیں جو ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں کسی کے ساتھ کسی کا کوئی حقیقی رشتہ نہیں۔ دو دن بعد پھر زندگی میں کبھی ملاقات ہی نہ ہو گی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ایسی مسرت انگیز محنت اور لگن بھی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ دن بھر وہ ہم لوگوں کی خدمت میں مصروف رہتی اور سب کام خود ہی کرنا چاہتی۔ ہاتھ بٹانے کے لیے کوشش کرتے ہی وہ ہنس کر کہا کرتی...... یہ تو خود میرا کام ہے ورنہ روہنی بھیا کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنی تکلیف اٹھاتے اور

آپ کو بھی اس جیل خانہ میں آنے کی کیا پڑی تھی؟ میرے لیے ہی آپ لوگوں کو یہ سب تکالیف برداشت کرنی پڑی ہیں۔"

اکثر ایسا ہو جاتا کہ کھانے پینے کے بعد تھوڑی سی گپ شپ چل رہی ہوتی اور دفتر کی گھڑی میں دو بج جاتے وہ ایک دم کھڑی ہو جاتی اور کہتی...... "جاتی ہوں آپ لوگوں کے لیے چائے تیار کر لاؤں۔ دو بج گئے ہیں۔" میں دل ہی دل میں کہتا...... "تمہارا شوہر خواہ کتنا ہی بڑا گناہگار کیوں نہ ہو، انسان تو ضرور ہوگا۔ اگر کبھی اسے حاصل کر لو گی تو وہ تمہاری قدر و قیمت ضرور سمجھے گا۔"

اس کے بعد ایک دن معیاد ختم ہو گئی۔ روہنی بھی تندرست ہو گیا۔ ہم لوگ بھی سرکاری اجازت نامہ لے کر پھر گٹھڑیاں باندھ کر رنگون کو چل پڑے ارادہ کیا تھا کہ شہر کے مسافر خانے میں دو ایک دن کے لیے ٹھہرنے کا کوئی معقول انتظام کر کے میں اپنی جگہ پر چلا جاؤں گا اور پھر جہاں جہاں میں رہوں گا اس کے شوہر کو تلاش کر کے اسے خبر بھیجتے رہنے کی کوشش کروں گا۔

شہر میں جس دن ہم نے قدم رکھا اس دن برما والوں کے ایک تہوار کا دن تھا۔ یوں تو تہوار ان کے آئے دن لگے ہی رہتے ہیں گروہ کے گروہ زن و مرد ریشمی پوشاک زیب تن کیے اپنے مندروں کو جا رہے تھے۔ عورتوں کی آزادی کا صوبہ ہے اسلیے وہاں کے جشن ہائے مسرت میں عورتوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بوڑھی، نوجوان بچیاں...... ہر عمر کی عورتیں عمدہ اور نفیس پوشاکیں پہن کر ہنسی بولتی گاتی بجاتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر گوری تھیں۔ بادل کی طرح گھنے بالوں کا بوجھ نوے فیصدی عورتوں کے گھٹنے کے نیچے تک لٹکتا تھا۔ گلے میں پھولوں کے ہار گھونگھٹ کا جھنجھٹ نہیں۔ مردوں کو دیکھ کر تیزی سے بھاگ جانے کی جلدی میں ٹھوکر کھا کر گر جانے کا اندیشہ نہیں۔ پریشانی یا حیا کا خطرہ نہیں۔ گویا چشمے کے آزاد بہاؤ کی مانند بلا روک ٹوک بہی جا رہی ہیں۔ پہلی ہی نگاہ میں میں تو فریفتہ ہوا تھا۔ اپنے ہاں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے دل میں ان کی تعریف کر کے بولا...... یہی تو زندگی ہے یہی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر زندگی کا لطف ہی کیا ہے؟ ان کی خوش نصیبی حسد کی طرح میرے دل میں پیوست ہو گئی۔ میں نے سوچا۔ اطراف و جوانب میں وہ مسرت و انبساط کی ایک دنیا آباد کرتی جا رہی ہیں کیا اس شے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ عورتوں کو آزادی دے کر اس ملک کے مردوں نے کیا کوئی دھوکہ کھایا ہے؟ اور ہم لوگ کیا ان کو سرتاپا جکڑ کر اور ان کی زندگی کو اپاہج بنا کر فائدہ میں رہے ہیں؟ ہماری عورتیں بھی اگر کسی ایسے ہی دن......

ناگاہ کچھ شور و غل سن کر میں نے لوٹ کر جو کچھ دیکھا وہ آج بھی میرے دل پر اسی طرح نقش ہے۔ گھوڑا گاڑیوں کے کرایے کے متعلق جھگڑا ہو رہا تھا۔ گاڑی بان ہمارے ہاں کا ہندوستانی مسلمان

تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آٹھ آنے کرایہ طے ہوا ہے اور نیلے بھلے گھر کی بری عورتیں گاڑی پر سے اتر کر یک زبان ہوکر کہہ رہی تھیں کہ نہیں پانچ آنے ہوا ہے۔ دو چار منٹ کہا سنی ہونے کے بعد ہم بس 'بلم بلم' یا ہو بلم، سڑک کے کنارے ایک آدمی گنے کے موٹے موٹے ٹکڑے کر کے بیچ رہا تھا۔ دفعتہً تینوں نے جھپٹ کر تین ٹکڑے اٹھا لئے اور گاڑی بان پر متفقہ حملہ کر دیا۔ آہ وہ کتنی بے دھڑک مار تھی۔ بے چارہ گاڑی بان عورتوں کے جسم پر ہاتھ بھی نہ اٹھا سکتا تھا اور جان بچانے کے لئے اگر ایک کو روکتا تو دوسری کی چوٹ سر پر پڑتی۔ اس کو روکتا تو تیسری کی چوٹ آ پڑتی۔ چاروں طرف لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ لیکن صرف تماشہ دیکھنے کے لیے اس غریب بے چارے کی کہاں گئی ٹوپی صافہ اور کہاں گیا ہاتھ کا چابک۔ اور زیادہ برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے آخر وہ میدان چھوڑ کر پولیس پولیس! سپاہی سپاہی چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

میں ابھی حال ہی میں بنگال اور وہ بھی دیہات میں سے آ رہا تھا۔ کلکتے میں عورتوں کو آزادی ہے۔ سنا ضرور تھا لیکن آنکھوں نہیں دیکھا۔ لیکن آزادی حاصل کر کے شریف گھروں کی عورتیں بھی ایک جوان مرد پر کھلے عام سڑک پر حملہ کر کے لٹھ بازی کر سکتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے اتنے طاقتور ہونے کا خیال میرے تصور سے بھی بعید تھا۔ کافی دیر تک حیرت زدہ ہو کر کھڑے کھڑے دیکھتے رہنے کے بعد میں اپنے کام کے لیے نکل پڑا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ عورتوں کی آزادی اچھی ہے یا بری سوسائٹی کی مسرت میں اس سے اضافہ ہو گا یا کمی۔ اس کا فیصلہ تو کسی اور دن کروں گا لیکن آج آنکھوں جو کچھ دیکھا اس سے میری دل کی عجیب ہی حالت ہو گئی۔

ابھیا اور روہنی کو ان کی نئی رہائش اور نئی گھر گرہستی میں داخل کر کے جس دن میں خود اپنی رہائش کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کے لیے رنگون کی شاہراہ پر نکل پڑا اس دن میں یہ کہنا نہیں چاہتا کہ ان دونوں کے باہمی تعلقات کے متعلق میرے دل میں کسی طرح بھی نفرت چھو نہیں گئی تھی لیکن اس ناپاک خیال کو دور کرنے میں بھی مجھے زیادہ دیر نہ لگی کیونکہ دو خاص عمر کے عورت مردوں کو کسی حالت میں دیکھنے محض سے ہی ان کے درمیان کسی خاص تعلق کا تصور کر لینا کتنی عظیم غلطی ہے۔ یہ ہدایت مجھے بچپن ہی میں مل چکی تھی اور مستقبل کے پراسرار رموز کو بھی مستقبل کے ہاتھ سونپ دینے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ لہٰذا صرف اپنا ہی بوجھ کندھے پر لاد کر میں اس دن صبح کے وقت ان کی نئی رہائش گاہ سے باہر نکلا۔

آج کل کی طرح اس وقت کسی بھی نئے بنگالی کو برما میں قدم رکھتے ہی پولیس کے ظاہر اور خفیہ سپاہیوں کا ہجوم ان سے لگاتار سوالات کر کے ان پر طعن و تشنیع کر کے اور بے عزتی کر کے اور بلا قصور

تھانے میں لے جا کر باڈر دکھا کر حد درجہ کی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ دل میں کوئی گناہ نہ ہو، تو ان دنوں کسی اجنبی یا واقف کار کو بے خوفی سے گھومنے پھرنے کا حق تھا، اور آج کل کی طرح اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی نازک اور اہم ذمہ داری بھی نو وارد بنگالیوں پر عائد نہ ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے خوب یاد ہے کہ اس دن صبح سے لے کر دوپہر تک بلا کھٹکے میں گلی گلی میں گھومتا پھرا۔ راستے میں ایک بنگالی سے ملاقات ہو گئی۔ مزدور کے سر پر تو کاری کا ایک بوجھ رکھے ہوئے پسینہ پونچھتے ہوئے تیزی کے ساتھ وہ چلا جا رہا تھا، میں نے پوچھا...... ''صاحب، نند مستری کا مکان کہاں ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟''

وہ آدمی رک کر کھڑا ہو گیا...... ''کون نند؟ کیا آپ ربٹ گھر کے نند بگاڑی کو تلاش کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا...... ''یہ تو میں نہیں جانتا صاحب! کہ وہ کس گھر کے ہیں، انہوں نے صرف اتنا ہی پتہ بتایا تھا کہ وہ رنگون کے مشہور و معروف نند مستری ہیں۔''

اس آدمی نے ایک تذلیل آمیز جذبہ چہرے پر لا کر کہا ''اوہ، مستری، یوں تو ہر ایک اپنے آپ کو مستری کہلاتا ہے، لیکن مستری ہونا کیا آسان ہے؟ مرکٹ صاحب نے جب مجھ سے کہا تھا کہ ''ہری پد'' تمہارے علاوہ مستری ہونے کے قابل مجھے کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا تو آپ جانتے ہیں کہ بڑے صاحب کے پاس کتنی لاتعداد درخواستیں پڑی ہوئی تھیں...... تقریباً ایک سو، آری اور تیشے میں زور ہو تو درخواستوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن صاحب آپ جانتے ہیں......''

میں نے محسوس کیا کہ بے خبری میں ہی میں نے اس انسان کو ایسی جگہ پر چوٹ پہنچائی ہے جس کی تلافی مشکل ہے اس لیے فوراً گفتگو کا موضوع تبدیل کر کے کہا...... ''تو پھر نند نام کے کسی بھی انسان کو آپ نہیں جانتے؟''

''یہ آپ نے خوب کہا...... چالیس سال سے رنگون میں رہتا ہوں۔ میں اسے نہیں جانتا؟ نند کیا ایک ہے؟ تین تین نند ہیں۔ آپ نے نند مستری کہا تھا۔ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں آپ؟ شاید بنگال سے اوہ پھر یہ کہیے کہ ٹگر کے مرد کو پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے سر ہلا کر کہا...... ''ہاں، ہاں، وہی۔''

وہ بولا...... تو پھر یہ کہیے، پورا پتہ ملے بغیر کیسے پہچانوں؟ آیئے میرے ساتھ، تقدیر کے زور سے نند کما کھا رہا ہے ورنہ نند بگاڑی بھی کیا کوئی مستری ہے؟''

'صاحب آپ کون ہیں۔'

یہ سن کر کہ میں براہمن ہوں اس آدمی نے راہ میں ہی مجھے پرنام کیا بولا...... وہ آپ کی نوکری

لگا دے گا، صاحب سے سفارش کر کے آپ کی نوکری ضرور لگا سکتا ہے مگر دو مہینے کی تنخواہ اسے پیشگی رشوت میں دینی ہوگی۔ دے سکو گے کیا؟ دے سکو تو اٹھارہ بیس آنے یومیہ نوکری لگا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ فی الحال تو میں نوکری کر امید میں نہیں جا رہا ہوں۔ کچھ پناہ حاصل کرنے کی غرض سے ہی باہر نکلا ہے اور اس کی امید نند مستری نے مجھے جہاز پر ہی دلائی تھی۔

یہ سن کر ہری پد مستری نے حیرت سے پوچھا...... ''صاحب آپ نیک آدمی ہیں تو نیک آدمیوں کے ڈیرے میں کیوں نہیں جاتے؟''

''میں نے کہا ڈیرہ کہاں ہے؟ یہ تو میں جانتا ہی نہیں۔''

اس نے خود بھی یہ تسلیم کیا کہ مجھے بھی معلوم نہیں۔

مگر اس وقت تلاش کر کے بتانے کی امید دلا کر وہ بولا...... ''لیکن اس وقت تو نند سے ملاقات نہ ہو سکے گی، وہ کام پر گیا ہے، ٹنگر زنجیر لگائے سو رہی ہے اور پکار کر اس کی نیند میں مخل ہونے میں خیریت نہیں۔''

یہ تو میں خوب جانتا تھا اس لیے راستہ کے درمیان مجھے پس و پیش کرتے دیکھ کر اس نے ہمت دلا کر کہا...... ''نہ گئے وہاں تو کیا! وادا ٹھاکر عالیشان ہوٹل سامنے ہی ہے۔ وہاں غسل کر کے اور کھانا کھا کر نیند لے لیجئے اس وقت تک پھر دیکھا جائے گا۔''

ہری پد کے ساتھ باتیں کرتے کرتے جب میں دادا ٹھاکر کے ہوٹل پر پہنچا تو ہوٹل کے ڈائنگ روم (کھانے کے کمرے) میں تقریباً پندرہ آدمی کھانا کھا رہے تھے۔ انگریزی میں دو لفظ ہیں ''انسٹکٹ، اور پریجوڈس'' لیکن ہمارے ہاں صرف ایک ہی لفظ ہے تربیت یہ سمجھ لینا مشکل ہے کہ جو ایک ہے وہ دوسرا نہیں یعنی انگریزی میں دونوں الفاظ علیحدہ علیحدہ مطلب کو ظاہر کرتے ہیں لیکن دادا ٹھاکر کے ہوٹل میں داخل ہو کر یہ بات آج پہلے پہل ہی مجھے معلوم ہوئی کہ ہم لوگوں کی جات پات کی تفریق کھانا پینا وغیرہ چیزیں انسٹکٹ کی رو سے تربیت نہیں ہیں اور اگر یہ تربیت ہو بھی تو نہایت حقیر ہے۔ اس کی قیود سے آزاد ہونا کتنا آسان ہے یہ سب ظاہرہ طور سے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ ہمارے وطن میں ذات پات کی تفریق کا جو ایک لا متناہی سلسلہ قائم ہے اس سلسلہ کو پاؤں میں پہن کر جھنجناتے ہوئے پھرنے میں کتنا فخر اور بہتری ہے۔ اس پر اس وقت تنقید اور تبصرہ نہیں کروں گا البتہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہو کر کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ اس کو اپنے چھوٹے چھوٹے سے گاؤں میں، بے کھٹکے بنے ہوئے آباؤ اجداد کا چلایا ہوا رواج بتا کر قائم رکھائے ہوئے ہیں اور اس کے نظام کو توڑنے کی سختی کے متعلق جنہیں مطلقاً کوئی

شک نہیں ہے ان لوگوں نے دیدہ دانستہ ہی اس بڑے بھاری وہم کو خواہ مخواہ پال رکھا ہے۔ در حقیقت جس ملک میں کھانے پینے میں چھوا چھوت کا خیال رائج نہیں ہے اس ملک میں قدم رکھتے ہی اچھی طرح نظر آ جاتا ہے کہ چھوت پشتوں کی کھانے پینے کی چھوا چھوت رکھنے کی یہ رسم نا معلوم کس طرح راتوں رات غائب ہو جاتی ہے۔ ولایت جانے سے ذات چلی جاتی ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہاں ممنوع گوشت کھانا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اپنے ملک میں بھی کبھی گوشت نہیں کھاتے ان کی ذات بھی چلی جاتی ہے کیونکہ جن لوگوں نے ذات برادری سے خارج کرنے کا اجارہ لے رکھا ہے وہ نیچ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں گوشت نہ کھا لینے پر بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کھایا ہی ہے۔''

اور ان کا یہ فرمانا بالکل غلط بھی نہیں ہے برما تو تین چارون کا راستہ ہی ہے۔ پھر بھی میں نے دیکھا ہے کہ نوے فیصدی بنگالی شریف انسان جن میں شاید براہمنوں کی ہی اکثریت ہوگی...... کیونکہ اس زمانہ میں ان کا لالچ دوسری تمام قوموں کو مات کر چکا ہے) جہاز کے ہوٹل میں ہی سستے داموں پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر برما کے ساحل پر قدم رکھتے ہیں اس ہوٹل میں مسلمان اور رگوانیز باروچی کیا بناتے ہیں۔ یہ سوال نا مرغوب ہو سکتا ہے لیکن وہ لوگ خالص ویشنو پکا کر کیلے کے پتے میں نہیں پروستے ہوں گے۔ یہ اندازہ کر لینا تو بھاٹ پاڑے کے بھٹا چاریہ کے لیے بھی شاید مشکل نہیں ہے...... اور میں تو ٹھہرا ایک ساتھی مسافر۔ جو لوگ کم از کم یہ سب نہیں کھانا چاہتے وہ بھی ہار تسلیم کر کے بالآخر سادہ روٹی یا سبزی وغیرہ تو کھاتے ہی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ممنوع گوشت سے لے کر رتمان اور رمبھا (کیلے کی دو اقسام) تک سب کچھ ملا جلا کر جہاز کے کولڈ روم میں رکھا جاتا ہے۔ اور یہ کام کسی کی نظر سے چھپا کر کرنے کا رواج بھی میں نے جہاز کے قواعد و ضوابط میں نہیں دیکھا ہاں پھر بھی سہولت کی بات یہ ہے کہ برما جانے والے مسافروں کی ذات جانے کا قانون شاید کسی طرح شاستر بنانے والوں کی سول کوڈ کی نظر بچا گیا ہے ورنہ شاید پھر ایک چھوٹی موٹی برہمن کانفرنس کی ضرورت لاحق ہوتی...... جانے دو، نیک انسان کی بات آج یہیں تک رہے۔

ہوٹل میں جو لوگ صف باندھ کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تھے وہ شریف انسان نہیں تھے...... کم از کم لوگ انہیں شریف تسلیم نہیں کرتے۔ سب لوگ کاریگر تھے ساڑھے دس بجے کی چھٹی میں کھانا کھانے آئے تھے۔ شہر کے اس حصے میں ایک بڑا وسیع میدان ہے جس کے تین طرف مختلف دستکاریوں کے کارخانے ہیں اور اس بستی کے درمیان ایک طرف وادا ٹھاکر کا یہ ہوٹل ہے۔ یہ ایک عجیب بستی ہے ایک قطار میں ایک سے ایک ملحقہ، بوسیدہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں چینی، برمی، مدراسی، اڑیا، تیلنگی، چٹاگانگ کے ہندو اور مسلمان وغیرہ سبھی رہتے ہیں اور ہماری

ذات کے بنگالی بھی رہتے ہیں۔ان کے نزدیک رہ کر میں نے پہلے پہل یہ سیکھا ہے کہ کسی کی قوم کو حقیر کہہ کر اور اس سے نفرت کر کے اور کو دور رکھنے کی مذموم عادت کو ترک کر دینا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔یہ علیحدہ بات ہے کہ جن کو ضرورت نہیں ہوتی وہ اس عادت کو ترک نہیں کرتے لیکن جن وجوہات کی بنا پر وہ ترک نہیں کرتے ان کو ظاہر کرنے سے جھگڑا بڑھ جائیگا۔

دادا ٹھاکر نے نہایت گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا اور ایک چھوٹا سا کمرہ دکھا کر کہا...... ''جتنے روز آپ کی خوشی ہو اس میں رہیں اور ہمارے ہاں کھانا کھائیں،نوکری وغیرہ ملنے کے بعد بل ادا کر دیجئے گا۔''

میں نے کہا...... ''مجھے تو آپ پہچانتے نہیں ہیں ایک مہینہ ٹھہر کر اور کھا پی کر بغیر بل ادا کئے بھی تو جا سکتا ہوں؟''

دادا ٹھاکر نے اپنی پیشانی دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا...... ''اسے تو آپ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے صاحب!''

میں نے جواب دیا...... ''جی نہیں اس کا مجھے رتی بھر بھی لالچ نہیں ہے۔''

دادا ٹھاکر سر ہلاتے ہوئے اس دفعہ نہایت سنجیدہ چہرے بنا کر بولے...... ''دیکھئے تقدیر ہی ہے صاحب! تقدیر! اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں یہی میں سب لوگوں سے کہا کرتا ہوں۔''

درحقیقت یہ ان کا زبانی جمع خرچ نہیں تھا۔اس سچائی پر ان کو کتنا زبردست اعتقاد تھا اس کا ہاتھوں ہاتھ ثبوت دینے کے لیے چار پانچ مہینے کے بعد، ایک دن وہ علی الصبح ہی بہت سے لوگوں کی امانتیں...... روپے پیسے، انگوٹھی گھڑی وغیرہ ساتھ لے کر محض ان کی مایوس پیشانیوں کو برما میں اس خالی ہوٹل کی میز پر ٹپکنے کے لیے چھوڑ کر اپنے وطن چلے گئے۔

خیر جو بھی ہو اس وقت دادا ٹھاکر کی بات سننے میں بری محسوس نہ ہوئی اور میں بھی ان کا ایک نیا موکل بن کر ایک ٹوٹے سے کمرے پر قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔رات کو ایک کچی عمر کی بنگالی خادمہ میرے کمرے میں آسن بچھا کر کھانے کے لیے جگہ بنانے لگی۔قریب ہی ڈرائنگ روم میں لوگوں کے کھانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔میں نے دریافت کیا کہ مجھے وہاں کھانا کیوں نہیں کھلایا گیا۔یہاں کس لئے لائی ہو؟''

اس نے جواب دیا...... ''وہ لوگ ہلکے درجے کے لوہا کاٹنے پیٹنے والے مزدور ہیں بابو ان کے ساتھ آپ کو کیسے کھلایا جا سکتا ہے؟''

یعنی وہ تھے، کمیں، میں تھا معزز انسان،...... میں نے ہنس کر کہا...... ''مجھے بھی یہاں کیا کیا

کاٹنا پیٹنا پڑے گا اس کا فی الحال کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔خیر کوئی مضائقہ نہیں آج کھلاتی ہو تو کھلا جاؤ مگر کل سے مجھے بھی ان ہی کے ساتھ اسی کمرے میں کھلانا۔''

خادمہ بولی...... ''آپ براہمن ہیں آپ کو وہاں کھانے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں، وہ سب بنگالی تو ہیں؟''

خادمہ نے آواز کو قدرے دھیما کر کے کہا...... ''بنگالی تو ضرور ہیں لیکن ان میں ایک ڈوم بھی ہے۔''

ڈوم! ہمارے اپنے ملک میں یہ قوم اچھوت ہے۔چھو جانے پر نہانا ضروری ہے یا نہیں یہ معلوم نہیں لیکن یہ ضروری جانتا ہوں کہ کپڑے تبدیل کر کے سر پر گنگا جل چھڑکنا پڑتا ہے۔نہایت حیرت کے ساتھ میں نے پوچھا'' ''اور سب؟''

خادمہ بولی...... 'اور سب اعلیٰ قوم کے ہیں۔کائستھ ہیں۔کیورت (کیوٹ) ہیں۔آہیر ہیں، لوہار......''

یہ لوگ کوئی اعتراض نہیں کرتے؟''

خادمہ اب قدرے ہنس کر بولی...... ''اس پردیس میں سات سمندر پار آ کر کیا اتنی پاکیزگی چل سکتی ہے بابو؟ وہ کہتے ہیں کہ گھر لوٹ کر گنگا اشنان کر کے کفارہ کر لیں گے۔''

''شاید ہی کر لیں مگر مجھے علم ہے کہ جو دو چار آدمی گاہے بگاہے بنگال جاتے ہیں وہ چلتے چلتے کلکتے کی گنگا میں ایک آدھ مرتبہ اشنان تو ضرور کر لیتے ہوں مگر پرائیشچت کوئی نہیں کرتا۔غیر ملکی آب و ہوا کے تاثرات سے یہ لوگ اس پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔''

میں نے دیکھا کہ ہوٹل میں صرف دو حصے ہیں۔ایک براہمنوں کے لیے اور دوسرا تمام غیر براہمنوں کے لیے۔کھانے کے بعد کیوٹ کے ہاتھ سے ڈوم اور ڈوم کے ہاتھ سے لوہار نے حقہ پکڑ لیا اور بلا روک ٹوک پی لیا۔دو دن بعد اس لوہار کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے میں نے پوچھا...... ''اچھا اس طرح تمہاری جاتی نہیں جاتی؟''

لوہار بولا...... ''جاتی کیوں نہیں صاحب! جاتی تو ہے''

''تو؟''

اس نے پہلے پہل اپنے آپ کو ڈوم ظاہر نہیں کیا تھا۔کہا تھا کہ میں کیوٹ ہوں۔بعد ازاں ہی سب راز کھلا۔''

''پھر تم لوگوں نے کچھ نہ کہا؟''

"صاحب اور کیا کہتے۔ کام تو بہت ہی برا ہوا۔ یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے لیکن مبادا اسے شرمندگی اٹھانی پڑے یہ سوچ کر سب نے دیدہ دانستہ معاملے کو دبا لیا۔"

"لیکن اگر تم اپنے وطن میں ہوتے تو کیا ہوتا؟"

وہ گویا لرز اٹھا بولا ...... "تو' کیا پھر کوئی بچ سکتا تھا؟" اس کے بعد وہ ذرا سا خاموش رہ کر وہ خود ہی کہنے لگا...... "مگر آپ جانتے ہیں بابو، میں براہمنوں کی بات نہیں کہتا...... وہ تمام ذاتوں کے گرو ٹھہرے، ان کی تو بات ہی علیحدہ ہے ورنہ باقی تمام ذاتیں یکساں ہیں۔ خواہ تیلی، مالی، نمولی، نائی، بڑھئی، لوہار، کمہار اور گاندھی ان نوشاخوں کے ہندو ہوں خواہ ہاڑی ڈوم وغیرہ ہوں۔ کسی کے جسم پر کچھ لکھا تو ہوتا نہیں ہے۔ سبھی بھگوان کے بنائے ہوئے ہیں۔ سب ایک ہیں۔ سبھی پیٹ کی آگ میں جل کر دور دراز پردیس میں آئے ہیں اور لوہا پیٹ رہے ہیں۔ ذرا سوچیے تو بابو، ہری موڈل ڈوم ہے تو کیا ہوا؟ شراب پیتا نہیں۔ گانجے کو چھوتا تک نہیں۔ اس کے رہن سہن اور عادات واطوار کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک اونچی ذات کا نہیں...... ڈوم کا لڑکا ہے؟ اور لکشمن وہ تو شریف کائیستھ کا بیٹا ہے لیکن ایک بار اس کے طور اطوار تو دیکھو۔ بچو دوبارہ جیل جاتے بچے ہیں۔ ہم سب نہ ہوتے تو اب تک جیل میں پڑے پڑے مہتر کے ہاتھ کی روٹیاں کھاتے ہوتے۔"

اس کی یہ بات سن کر نہ تو مجھے لکشمن کے متعلق کسی طرح کی بے تابی ہوئی اور نہ ہری موڈل نے اپنے ڈوم پن کو چھپا کر کتنا بڑا ظلم کیا ہے اس پر ہی کسی طرح کی بحث کرنے کی خواہش ہوئی۔ میں صرف یہی سوچنے لگا کہ جس ملک میں شریف انسان تک جاسوس لگا کر اپنے جنم کے پڑوسی کی کمزوریاں ڈھونڈ کر اور اس کے ماں باپ کی شرادھ کو بگاڑ کر دلی تسکین حاصل کرتے ہیں اسی ملک کے گنوار اور نا تعلیم یافتہ نیچ قوم ہونے پر بھی ان لوگوں نے ایک اجنبی بنگالی کا اتنا بڑا بھاری جرم بھی معاف کر دیا اور صرف...... یہی نہیں بلکہ بعد ازاں اس پردیس میں کہیں اسے شرمندہ اور حقیر ہو کر نہ رہنا پڑے اس خیال سے اس سلسلہ کو اٹھایا تک نہیں۔ یہ سب ناممکن کام کس طرح ممکن ہوا؟ غیر ملکی لوگ بے شک نہ سمجھ سکیں لیکن ہم تو سمجھ سکتے ہیں کہ کتنی فراخدلی اور دل کی کتنی بڑی وسعت اس کے لیے درکار ہوتی ہے۔ تمام زندگی بھر اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ہی بیٹھ کر گزار دینے سے بڑھ کر انسان کیلئے سب معاملات میں تنگ دل بنا دینے والا دشمن اور کوئی نہیں۔ خیر جانے دو اس بات کو۔

ان لوگوں کے ساتھ میں بہت دنوں تک رہا لیکن جب تک انہیں یہ معلوم نہ ہوا کہ میں پڑھا لکھا ہوں تب تک ہی ان کے ساتھ بے تکلفی سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا ان کے ہر قسم کے رنج و راحت میں میں ان کا شریک ہوتا تھا مگر جس گھڑیاں کو یہ معلوم ہوا کہ میں شریف انسان ہوں اور مجھے انگریزی آتی ہے انہوں نے مجھے غیر سمجھنا شروع کر دیا۔ انگریزی پڑھنے لکھنے نیک انسانوں کے قریب یہ لوگ انتہائی مصیبت کے وقت جاتے ضرور ہیں اور ان سے اصلاح مشورہ بھی کرتے ہیں لیکن نہ تو ان پر بھروسہ کرتے ہیں اور انہیں اپنا آدمی ہی خیال کرتے ہیں۔ ملک کے اس برے رواج کو وہ آج بھی دور نہیں کر سکے کہ میں انہیں چھوٹا سمجھ کر دل ہی دل میں نفرت کرتا ہوں یا ان کی غیر حاضری میں ان کا مذاق اڑایا ہوں۔ صرف اسی لیے ان کے درمیان کام کرنے کی میری کتنی ہی سکیمیں فیل ہو گئی ہیں۔ لیکن خیر آج اس بات کو رہنے دیجئے۔

میں نے دیکھا کہ بنگالی عورتوں کی تعداد بھی اس طرف کچھ کم نہیں ہے اگرچہ ان کے خاندان کا پورا پورا پتہ نہ دینا ہی بہتر ہے تاہم آج وہ کسی دوسری ہی شکل میں تبدیل ہو کر ایک دم پورے پورے عیال داروں کی بیویاں بن چکی ہیں۔ مردوں کے دلوں میں تو شاید آج بھی ذات پات، کی پرانی یاد قائم ہے لیکن عورتیں تو نہ کبھی اپنے وطن میں آتی ہیں اور نہ ہی اپنے وطن کے ساتھ کوئی تعلق ہی رکھتی ہیں۔

ان کے بچے بچیوں سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ "ہم بنگالی ہیں، یعنی مسلمان، عیسائی، برمی وغیرہ نہیں ...... بنگالی ہندو ہیں۔ قرب و جوار میں بیاہ شادیاں نہایت آزادانہ طور سے ہوتی ہیں محض بنگالی ہونا ہی کافی ہے اور چٹا گانگ کے کسی بنگالی براہمن سے منتر پڑھوا کر دونوں کے ہاتھ ملا کر ایک کر دینا ہی کافی ہے۔ بیوی ہو جانے پر دوبارہ شادی کا رواج نہیں ہے...... اور یہ اس لیے کہ پروہت دوبارہ منتر پڑھنے کے لیے رضامند نہیں ہوتا۔ لیکن بیوگی کو بھی یہ پسند نہیں کرتیں اور پھر دوسرا گھر بسا لیتی ہیں۔ ان کے لڑکے بچے ہوتے ہیں اور بھی کہتے ہیں کہ ہم بنگالی ہیں، اور ان کی شادیوں میں بھی وہی پروہت آ کر وید کے منتر پڑھا کر شادی کرا جاتے ہیں۔ اس دفعہ انہیں ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہوتا۔ شوہر سے انتہائی طور پر ستائی جانے پر یہ دوسرے کا سہارا بھی لے لیتی ہیں لیکن اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ اور ہر ممکن اذیت کو برداشت کرتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ ہندو ہیں اور درگا پوجا سے شروع کر کے مہا کالی وغیرہ کوئی بھی چارہ نہیں چھوڑتیں۔"

☆☆☆

راستے میں جن لوگوں کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو کر اس دور دراز پردیسی علاقہ میں داخل ہوا تھا واقعات کی رفتار سے وہ تو شہر کے ایک کنارے رہ گئے اور مجھے پناہ ملی شہر کی دوسری طرف لہٰذا ان پندرہ سولہ دنوں میں اس طرف نہ جا سکا۔ اس کے علاوہ تمام دن ملازمت کی امیدواری میں گھومتے گھومتے اتنا عاجز آ جاتا تھا کہ شام کے وقت اپنی قیام گاہ پر لوٹتے ہوئے اتنی طاقت نہیں بچتی تھی کہ کہیں بھی جا سکوں۔ رفتہ رفتہ جوں جوں دن گزرنے لگے میرے دل میں یہ خیال مضبوط ہوتا گیا کہ اس دور

دراز علاقہ میں آنے پر بھی ملازمت کا حصول میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا خود اپنے ملک میں۔

ابھیا کی بات یاد آ گئی۔ جس انسان پر بھروسہ کر کے وہ گھر بار چھوڑ کر اپنا شوہر تلاش کرنے آئی تھی پتہ نہ ملنے پر اس کا کیا حال ہوگا؟ گھر چھوڑ کر باہر آنے کا راستہ کافی وسیع اور کھلا ہونے پر بھی واپس لوٹنے کا راستہ بھی اتنا ہی فراخ بنا رہ سکتا۔ اتنی بڑی امید بنگال کی آب و ہوا میں پرورش پانے کی وجہ سے مجھے کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہ تھا کہ کافی دنوں تک گزارہ کرنے کے قابل دولت جمع کر کے بھی انہوں نے اپنے قدم نہیں بڑھایا تھا۔ اس لیے ان کے لئے محض وہی چارہ کار تھا جو نوے فیصدی بنگالی اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنی مہینہ پندرہ دن کے بعد کسی غیر کی نوکری کر کے مرتے دم تک بمشکل تمام روح اور جسم کا تعلق قائم رکھ کر زندہ رہنا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ روہنی بابو کے لیے بھی اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا لیکن رنگون کے اس بازار میں صرف اپنا ہی پیٹ بھرنے کے لیے نوکری حاصل کرتے وقت جب میرا یہ حال ہے تو ایک عورت کا بار اپنے کندھوں پر لاد کر ابھیا کے اس گم سم اور کمزور بھیا کا کیا حال ہوا ہوگا اس کا خیال آتے ہی میں خوف زدہ ہو اٹھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو کل ایک مرتبہ جا کر ان کی خبر ضرور لوں گا۔

دوسرے دن شام کے وقت تقریباً دو کوس فاصلہ طے کر ان کی رہائش گاہ پر پہنچا اور دیکھا کہ باہر کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے موڑھے پر روہنی بھیا بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا چہرہ بادلوں سے محیط اساڑھ کے پہلے دن کی مانند سنجیدہ ہو رہا تھا بولے...... "اوہ! شری کانت بابو! آپ، اچھے تو ہیں؟"

میں بولا...... "جی اچھا ہی ہوں۔"

"جائیے اندر جا کر بیٹھیے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا...... "آپ لوگ تو سب اچھے ہیں؟"

"ہوں، اندر جائیے نا، وہ گھر میں ہی ہیں۔"

"اچھا جاتا ہوں...... آپ بھی آیئے نا؟"

"نہیں، میں یہاں ہی کچھ دیر آرام کروں گا۔ محنت کرتے کرتے میں تو یک طرح سے مرا جا رہا ہوں۔ دو گھڑی پاؤں پھیلا کر کچھ بیٹھ لوں یہی غنیمت ہے۔ اگرچہ ان کے چہرے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تھی کہ وہ محنت کرتے کرتے مرے جا رہے ہیں تاہم دل ہی دل میں کچھ متفکر ہو اٹھا۔ روہنی بھیا کے اندر بھی اتنی سنجیدگی اتنے دنوں سے اس شکل میں موجود ہے بغیر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اس پر یقین کر لینا مشکل تھا۔ لیکن اصل معاملہ کیا ہے؟ میں خود بھی تو واستے کی خاک چھان چھان کر تنگ آ چکا ہوں۔ میرے یہ روہنی بھیا بھی کیا......

کواڑا کی آڑ میں سے ابھیا نے اپنے ہنستا ہوا چہرہ باہر نکال کر گپ شپ اشارہ کر کے مجھے اندر بلوایا...... پریشانی کے عالم میں میں نے کہا...... چلئے نا روہنی بھیا، اندر چل کر گپ شپ کریں۔"

روہنی بھیا نے جواب دیا۔ "گپ شپ...... اس وقت مر جاؤں تو جان بچے یہ جانتے ہو شری کانت بابو؟"

"نہیں جانتا" مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑا۔ جواب میں انہوں نے صرف ایک تیز آہ بھری ہے اور کہا...... "دو دن بعد ہی معلوم ہو جائے گا۔"

جب ابھیا نے گپ چپ دوبارہ بھلایا تو مزید بحث نہ کر سکا اور اندر چلا گیا۔ رسوئی گھر کے علاوہ دو کمرے اور بھی تھے۔ مقابل کا کمرہ ہی بڑا تھا اور اسی میں روہنی بابو سوتے تھے۔ ایک طرف رسی کی کھاٹ پر ان کے بستر رکھے تھے اندر گھستے ہی دیکھا فرش پر آسن بچھا تھا، ایک طرف طشتری میں پوری ترکاری، تھوڑا سا حلوہ اور ایک گلاس پانی رکھا ہوا تھا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ لوگ جیوتش نہیں جانتے تھے کہ میری آمد کا علم انہیں ہو گیا ہوا اور انہوں نے دوپہر سے ہی میرے لیے یہ انتظام کر رکھا ہو اس لئے لمحہ بھر میں ہی سمجھ گیا کہ کچھ لڑائی جھگڑا چل رہا ہے اس لیے روہنی بھیا کا چہرہ غم بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کہہ رہے تھے کہ مر جاؤں تو جان بچے۔ میں چپ چاپ کھاٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ابھیا نے کچھ دور کھڑی ہو کر پوچھا...... "آپ اچھے تو ہیں؟ اتنے دنوں بعد شاید غریبوں کا خیال آیا ہے؟"

کھانے کے تھال کی طرف اشارہ کر کے میں نے جواب دیا...... "میری بات بعد میں ہوتی رہے گی لیکن یہ کیا ہے؟"

ابھیا ہنسی اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولی...... "کچھ نہیں۔ یہ تو بتایئے کہ آپ کیسے ہیں؟"

"کیسا ہوں یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا پھر کسی دوسرے کو کس طرح بتاؤں؟" پھر کچھ سوچ کر بولا...... روہنی بھیا کہتے تھے......" میرے منہ کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ روہنی بھیا اپنی پھٹی چپلیوں سے ایک غیر قدرتی آواز کرتے ہوئے پھڑ پھڑ اندر گھس آئے اور کسی کی طرف دیکھے بغیر ہی انہوں نے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ایک ہی سانس میں انہوں نے اسے آدھا خالی کر دیا۔ باقی دو تین گھونٹ زبردستی پی کر خالی گلاس لکڑی کی میز پر رکھ دیا اور یہ کہتے کہتے باہر چل دیئے...... "جانے دو، خالی پانی پی کر ہی پیٹ بھر لوں۔ میرا یہاں اور کون بیٹھا ہے جو بھوک لگنے پر کھانے کو دے گا۔"

میں نے حیرت زدہ ہو کر ابھیا کی طرف دیکھا۔ چشم زدن کے لیے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس لمحہ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہنس کر کہا...... "بھوک لگی ہو تو پانی کے گلاس کی نسبت......

کھانے کا تھال ہی انسان کو پہلے نظر آتا ہے۔''

روہنی نے اس بات پر کان ہی نہ دھرے اور وہ باہر چل دیئے لیکن ابھی آدھ منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ وہ واپس لوٹ آئے اور کواڑ کے سامنے کھڑے ہو کر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے..... ''تمام دن بھر دفتر میں محنت کرنے کے بعد بھوک کے مارے سر چکرا رہا تھا شری کانت بابو! اس لئے اس وقت آپ سے بات نہ کر سکا، کچھ خیال نہ کیجئے گا۔''

میں نے کہا..... ''نہیں۔''

انہوں نے پھر کہا..... آپ جس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں میرے لئے بھی کیا تھوڑا سا انتظام ہو سکتا ہے؟''

اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والے جذبات دیکھ کر میں بے اختیار ہنس پڑا بولا..... ''لیکن وہاں پوریوں اور موہن بھوگ کا انتظام نہیں ہے۔''

روہنی بھیا بولے..... ضرورت ہی کیا ہے۔ بھوک کے وقت اگر کوئی ذرا سا گڑ پانی ہی دے دے تو وہی آب حیات ہے۔ یہاں تو وہ بھی کون دیتا ہے؟''

میں نے جاننے کی غرض سے ابھیا پر نگاہ ڈالی فوراً ہی وہ آہستہ سے بولی۔ ''سر میں درد تھا اس لیے بے وقت سو گئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ کھانے بنانے میں آج ذرا سی دیر ہو گئی شری کانت بابو؟''

میں نے تعجب کے ساتھ کہا..... ''بس یہی جرم ہے؟''

ابھیا اسی طرح استقلال سے بولی..... 'یہ کیا کوئی معمولی جرم ہے۔ شری کانت بابو؟''

''معمولی نہیں تو اور کیا ہے؟''

ابھیا نے جواب دیا..... ''آپ کے نزدیک معمولی ہو سکتا ہے لیکن جو صاحب زبردستی گلے پڑی ہوئی کو کھانے کے لیے دیتے ہی وہ اس کو معاف نہیں کر سکتے۔ میرے سر درد کرتا ہے تو ان کا کام کس طرح چل سکتا ہے؟''

روہنی بابو ایک دم تڑپ اٹھے اور گرج کر بولے..... ''تم میرے گلے پڑی ہوئی ہو یہ میں نے کب کہا؟''

ابھیا بولی..... ''کہو گے کس لیے ہزار مرتبہ اظہار تو کر چکے ہو؟''

روہنی بھیا بولے..... ''اظہار کر رہا ہوں، اور تمہارے دل میں جلیبی کی طرح پھیر ہے۔ تم نے مجھ سے کب کہا تھا کہ سر درد کر رہا ہے؟''

ابھیا نے کہا..... ''کہنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ کیا تم یقین کر لیتے؟''

روہنی بھیا میری طرف پلٹ کر بلند لہجہ میں بول اٹھے 'سنیئے شری کانت بابو! یہ سب باتیں سن رکھیئے۔ ان کے لیے ہی میں نے وطن چھوڑا، گھر لوٹنے کا راستہ بند ہو گیا..... اب ان کے منہ کی بات سنیئے۔ اف.....''

ابھیا نے بھی اس مرتبہ غصے سے جواب دیا..... ''میرا جو ہونا ہوگا ہو جائے گا، تمہیں مجبور نہیں کرتی جب جی چاہے گھر لوٹ جاؤ۔ میرے لئے تم اتنی مصیبت کیوں اٹھاؤ گے میں تمہاری کون ہوتی ہوں؟ اس طرح طعنہ زنی کی نسبت.....''

اس کی بات ابھی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ روہنی بھیا تقریباً چیخ اٹھے۔ 'سنیئے شری کانت، دو روٹی پکا دینے کے لیے..... یہ باتیں آپ ذرا سن رکھیئے۔ اچھا آج سے کبھی تم نے اگر میرے لئے رسوئی گھر میں قدم رکھا تو تمہیں بہت ہی بڑی..... بلکہ ہوٹل میں..... '' کہتے کہتے ان کا گلا گریہ سے بھر آیا۔ وہ دھوتی کا کنارہ منہ پر رکھ کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے مکان سے باہر ہو گئے۔ ابھیا نے اپنا اترا ہوا چہرہ نیچے جھکا لیا..... نا معلوم آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لیے یا کسی اور غرض سے لیکن میں تو یکبارگی حواس باختہ ہو اٹھا۔ چند دنوں سے دونوں کے درمیان ان بن ہو رہی تھی یہ تو صاف نظر آ رہا تھا لیکن اس کی تہہ میں جو بات پوشیدہ ہے وہ تو بھوک اور پیاس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگی۔ تو پھر کیا شوہر کو تلاش کرنے کی بات بھی میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لیے مجھے خود بھی جھجک محسوس ہونے لگی۔ پس و پیش کرنے کے بعد بالآخر میں نے کہا مجھے بہت دور جانا ہے اس لیے اب چلتا ہوں؟

ابھیا نے منہ اوپر اٹھا کر کہا..... اب کب آیئے گا؟''

''بہت دور.....''

''تو پھر ذرا ٹھہر جایئے'' کہہ کر ابھیا باہر چلی گئی پانچ چھ منٹ بعد لوٹ کر آئی اور میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دے کر بولی..... ''جس کام کی غرض سے میں یہاں آئی ہوں وہ سب اس میں مختصراً لکھ دیا ہے۔ پڑھ کر جو درست معلوم ہو کیجئے گا۔ میں آپ سے مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی۔'' اتنا کہہ کر اور گلے میں آنچل ڈال کر آج اس نے مجھے پرنام کیا اور پھر اٹھ کر پوچھا..... ''آپ کی رہائش کس جگہ ہے؟''

سوال کا جواب دے کر میں اس کاغذ کے چھوٹے سے پرزے کو مٹھی میں دبا کر آہستہ آہستہ نکل آیا۔ برآمدے کے باہر کا وہ موڑ اس وقت خالی تھا۔ روہنی بھیا کو بھی میں آس پاس کہیں دیکھ نہ سکا۔ قریب ہی راستے کو بغل میں چائے کا دکان پر دیکھ کر اس میں گھس گیا اور لیمپ کی روشنی میں اس خط کو

کھول میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ لیا۔ پنسل سے تحریر تھی لیکن طرز تحریر بالکل مرادنہ تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے شوہر کا نام اور اس کا پرانا پتہ دے کر نیچے لکھا تھا...... ''آج آپ اپنے دل میں جو خیال لئے جارہے ہیں اسے میں جانتی ہوں اور مصیبت کے موقعہ پر آپ کا کتنا بھروسہ ہے وہ بھی غالباً آپ جانتے ہی ہیں اس لیے میں نے آپ کا پتہ دریافت کرلیا ہے۔''

ابھیا کی اس تحریر کو میں نے کئی بار پڑھا لیکن کچھ تھوڑی سی باتوں کے علاوہ اور کسی بھی خاص بات کا اندازہ نہ کرسکا۔ آج ان لوگوں کا باہمی برتاؤ اپنی نظر سے دیکھ کر باہر کا کوئی انسان جو کچھ بھی سوچ سکتا ہے اس کا اندازہ کرلینا ابھیا جیسی ہوشیار اور عقلمند عورت کے لیے کوئی مشکل نہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کا اندازہ صحیح ہے یا غلط اس کے متعلق ذرا سا بھی اشارہ اس نے نہیں کیا۔

اس کے شوہر کا نام اور پتہ تو میں نے پہلے بھی سنا تھا لیکن مصیبت کے وقت وہ اس کی تلاش کرنا چاہتی ہے یا نہیں یا اور کون سی مصیبت کا امکان سمجھ کر اس نے میرا یہ پتہ دریافت کرلیا ہے...... وغیرہ وغیرہ کسی بھی بات کا ذکر تک میں اس کا تحریر سے باوجود کوشش بسیار کے تلاش نہ کرسکا۔ گفتگو کے دوران میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ رہنی کسی دفتر میں ملازمت حال کرچکا ہے۔ کس طرح حاصل کرچکا ہے یہ بھی مجھے معلوم نہ ہوسکا لیکن ہاں میری طرح کھانے پینے کی تشویش انہیں نہیں ہے...... پوریاں بھی کھانے کو مل جاتی ہیں...... پھر ابھیا نے کس قسم کی مصیبت کے لیے مجھے تیار کر رکھا ہے اور ایسا کرنے میں کیا فائدہ ہوگا؟ ابھیا ہی جانے۔

باہر نکل کر تمام راستہ بھر میں ان ہی لوگوں کے متعلق سوچتے سوچتے اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ کچھ بھی فیصلہ نہ کرسکا۔ محض یہی فیصلہ کیا کہ ابھیا کا شوہر کوئی بھی کیوں نہ ہو اور خواہ جہاں بھی کسی حالت میں کیوں نہ ہو اس کی بیوی کے پرزور اصرار کے بغیر اس کو ڈھونڈھ نکالنے کی بات تابی مجھے مجبوراً روکنی ہی پڑے گی۔

دوسرے دن سے میں پھر اپنی نوکری کی امیدواری میں مصروف ہوگیا مگر ہزارہا تفکرات اور پریشانیوں کے باوجود بھی ابھیا کی تشویش کو دل سے اکھاڑ کر پھینک نہ سکا۔ لیکن تشویش خواہ کتنی ہی کیوں نہ کروں ایک کے بعد ایک دن اپنی قدرتی رفتار سے نکلنے لگا۔ ادھر قسمت پر شاکر رہنے والے دادا ٹھاکر کا مسرور چہرہ ابر آلود سا ہونے لگا۔ کھانے کے وقت پہلے تو سبزیوں کی مقدار اور پھر تعداد رفتہ رفتہ کم ہونے لگی مگر نوکری نے میرے متعلق مطلقاً کوئی تبدیلی نہ کی۔ جس نظر سے اس نے پہلے دن دیکھا تھا مہینہ بھر سے مجھے غصہ اور افسوس آ گیا مگر اس وقت تک مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ جب تک نوکری کرنے کی پوری پوری ضرورت نہ ہو وہ نصیب نہیں ہوتی۔ مجھے یہ سبق ایک دن یکا یک رہنی بابو کو دیکھ کر حاصل ہوا۔

وہ بازار میں راستے کے کنارے ساگ سبزی خرید رہے تھے۔ میں چپ چاپ ان کے پاس کھڑا ہو کر دیکھتا رہا۔ اگرچہ ان کا لباس اور جوتے بوسیدگی کی انتہائی حالت کو پہنچ چکے تھے...... جھلسا دینے والی گرمی میں سر پر ایک چھتری تک نہیں ہے۔ لیکن کھانے کا سامان وہ بڑے آدمیوں کی طرح ہی خرید رہے تھے۔ اس کام میں جستجو اور جانچ پرکھ کی بھی کوئی حد نہیں۔ خواہ کتنی ہی زحمت اور کتنا ہی جھنجھٹ کیوں نہ اٹھانا پڑے اچھی چیز خریدنے میں وہ ہمہ تن محو تھے چشم زدن میں تمام بیوپار میری نظر کے سامنے تھا۔ اس خرید و فروخت کر در پردہ ان کی بے تابانہ محبت کس مرکز پر جا کر ٹھہرتی ہے آفتاب کی روشنی کی طرح مجھے صاف صاف معلوم ہوئی کس لیے یہ سب کچھ لے کر انہیں اپنے گھر پہنچنا ہی چاہیے اور کس لیے ان سب چیزوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے ان کو ملازمت اختیار کرنی پڑی اس راز کو حل کرنے میں مجھے کچھ بھی دیر نہ لگی۔ آج میں صاف طور سے سمجھ گیا کہ انسانوں کے اس چنگل میں اس نے اپنے راستہ کیوں حاصل کر لیا ہے اور میں ابھی تک کیوں ناکام رہا ہوں؟

یہ دبلا پتلا انسان رنگون کی شاہراہ پر ایک بڑی سی گٹھڑی لیے ہوئے سینکڑوں جگہ سے پھٹے سلے کپڑوں میں ملبوس گھر کی طرف جارہا تھا...... آڑ میں سے میں نے اس کی مضطرب چہرے کی طرف دیکھا اپنی طرف دیکھنے کی گویا اسے فرصت ہی نہ تھی۔

جس شے سے اس کا دل معمور ہورہا تھا اس کے مقابلہ میں کپڑے لتوں کی ہستی ہی کیا تھی؟ اور میری یہ حالت تھی کہ اپنے کپڑوں کے معمولی میلے پن کی وجہ سے ہی میں ہر قدم پر شرم کے مارے سکڑ کر پتھر ہوا جارہا تھا۔ راہ چلتے ہوئے کسی بالکل اجنبی کی بھی اپنے اوپر نظر پڑتے دیکھ کر شرم کے مارے مرا جارہا تھا۔

رہنی بھیا چلے گئے۔ میں نے انہیں پکارا نہیں اور وہ جلد ہی دوسرے لوگوں کے ہجوم میں غائب ہوگئے۔ ایسا کیوں ہوا میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس مرتبہ آنسوؤں کی روانی میں میری دونوں آنکھیں دھندلی ہوگئیں اور چادر کے کنارے سے پونچھتے ہوئے راستے کے کنارے کنارے میں آہستہ آہستہ اپنی قیامگاہ پر لوٹ آیا اور دل ہی دل میں بار بار کہنے لگا کہ محبت سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں۔ محبت سے بڑھ کر کوئی معلم شاید دنیا میں ہے ہی نہیں۔ ایسا کوئی مشکل مرحلہ نہیں جس کو یہ پار نہ کرسکے۔

تاہم کئی صدیوں کا قدیم اعتقاد میرے کانوں میں چپ چاپ کہنے لگا کہ یہ نیک نہیں ہے۔ یہ پاکیزہ نہیں ہے...... انجام کار اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔

قیام گاہ پر پہنچتے ہ ایک بڑا لفافہ ملا کھول کر دیکھا۔ ملازمت کی درخواست منظور ہوگئی ہے ساگوان کی لکڑی کا ایک بہت بڑا سوداگر بے شمار درخواستوں کی موجودگی میں بھی مجھ غریب پر ہی خوش ہوا

ہے بھگوان اس کا بھلا کریں۔

نوکری کے نام سے میں واقف نہ تھا لہٰذا اسے حاصل کر کے دل میں یہ شک باقی ہی رہا کہ وہ بہت دنوں تک قائم رہے گی یا نہیں۔ وہ صاحب میرے آقا ہوئے تھے وہ اگرچہ سچے صاحب (انگریز) تھے تاہم بنگالی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ کیونکہ وہ کلکتہ کے دفتر سے تبدیل ہو کر برما آئے تھے۔

وہ ہفتے کی ملازمت کے بعد ہی انہوں نے بلوا کر کہا...... ''شری کانت بابو، تم اس میز پر آ کر کام کرو تنخواہ بھی پہلے کی نسبت تقریباً اڑھائی گنا پاؤ گے۔''

میں نے بظاہر اور دل ہی دل میں بھی صاحب کو لاکھوں دعائیں دیتے ہوئے اس ہڈی پسلی نکلی ہوئی میز کو خیر باد کہہ کر ہری بانات کی مڑھی ہوئی میز پر دخل جمالیا۔ انسان کی جب بہتری ہونے لگتی ہے تو اسی طرح ہوتی ہے، ہم لوگوں کو ہوٹل کے دادا ٹھاکر نے بالکل ہی جھوٹ نہیں کہا تھا۔

کرائے کی گاڑی پر سوار ہو کر یہ خوشخبری سنانے کے لیے ابھیا کے ہاں پہنچا۔ روہنی بھیا دفتر سے لوٹ کر ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھے تھے لیکن آج انہیں صرف پانی پی کر ہی اپنی بھوک مٹاتے نہیں دیکھا بلکہ آج جس طرح وہ اپنی بھوک پوری کر رہے تھے اس طرح پوری کرتے دنیا میں اور کسی کو اعتراض ہو تو ہو لیکن مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس لیے یہ کہنا فضول ہے کہ ابھیا کی دعوت پر میں نے انکار نہیں کیا تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی روہنی بھیا کوٹ پہننے لگے۔ ابھیا نے جھنجھلا کر کہا...... ''تم سے میں برابر کہتی آ رہی ہوں روہنی بھیا! کہ یہ کمزور جسم لے کر تم اتنی سخت محنت مت کرو۔ کیا تم کسی طرح بھی نہ سنو گے؟ اچھا یہ تو بتاؤ کہ ہم اتنے زیادہ روپوؤں کو کیا کریں گے؟ دن تو ہمارے اچھی طرح کٹ رہے ہیں۔''

روہنی بھیا کی آنکھوں سے پیار جھڑنے لگا وہ کچھ ہنس کر بولے...... اچھا اچھا یہ اچھی کہی، ایک رسوئیا تک تو رکھ نہیں سکتا۔ چولہے کے پاس دونوں وقت کام کرتے کرتے تمہارا جسم سوکھ گیا ہے۔'' اتنا کہہ کر اور پان کھا کر جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے باہر چل دیئے۔

ابھیا ایک ہلکی سی آہ دبا کر زبردستی ذرا سا ہنس کر بولی...... ''دیکھیے تو شری کانت بابو، ان کا ظلم، تمام دن جی توڑ کر محنت کرنے کے بعد گھر آ کر کچھ آرام کر لیں یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اب رات کو بھی نو بجے تک لڑکوں کو پڑھانے باہر چلے گئے ہیں۔ میں کتنا کہتی ہوں لیکن کسی طرح سنتے ہی نہیں۔ دو آدمیوں کا کھانا بنانے کے لیے رسوئیا رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بتائیے ہے نا یہ سب ان کی زیادتی؟''

یہ کہہ کر اس نے ایک طرف کو آنکھیں پھیر لیں۔

میں آہستہ آہستہ قدرے ہنس دیا۔ نا، یا ہاں کسی طرح کا بھی جواب دینا میرے لیے ممکن نہ

تھا۔ میرے پرماتما کے لیے بھی ممکن تھا یا نہیں اس میں بھی شک ہے۔ ابھیا اٹھ کر گئی اور ایک خط لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کچھ دن ہوئے وہ برماریلوے کمپنی کے دفتر سے آیا تھا۔ بڑے صاحب نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ابھیا کا شوہر تقریباً دو سال پیشتر کسی بڑے بھاری جرم کی پاداش میں کمپنی کی نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ کہاں چلا گیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔

ہم دونوں ہی بہت دیر تک سن ہوئے بیٹھے رہے آخر کار ابھیا نے ہی اس خاموشی کو توڑا پوچھا...... ''اب آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا...... ''اب کیا رائے دوں؟''

ابھیا سر ہلا کر بولی...... ''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں آپ کو ہی میرا فرض بتانا پڑے گا۔ اس خط کے ملنے کے بعد سے ہی میں بڑی امید کے ساتھ آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا...... ''بہت خوب، کیا میری ہی رائے لے کر گھر سے باہر نکلی تھی جو میرے رائے کے لیے راہ دیکھ رہی ہو۔''

بہت کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے دریافت کیا...... ''واپس گھر لوٹ جانے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

ابھیا نے جواب دیا...... ''کچھ بھی نہیں۔ آپ کہیں تو جا بھی سکتی ہوں مگر میرا تو وہاں کوئی نہیں ہے۔''

''روہنی بابو کیا کہتے ہیں؟''

''وہ کہتے ہیں کہ نہیں جائیں گے۔ کم از کم دس سال تک تو وہ اس طرف نظر بھی نہ اٹھائیں گے۔''

بہت دیر تک چپ رہ کر میں نے کہا...... ''وہ آپ کا بار کیا ہمیشہ سنبھالے رہ سکیں گے؟''

ابھیا بولی...... ''آپ ہی بتائیے کہ غیر کے دل کی بات میں کیا جانوں؟ اس کے علاوہ وہ خود بھی کس طرح جان سکتے ہیں''؟ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے چپ رہی پھر بولی۔'' ایک بات اور بھی ہے میرے لیے وہ ذرا سے بھی ذمہ دار نہیں ہیں۔ قصور کہو یا غلطی کہو جو کچھ بھی ہے میری ہی ہے۔''

گاڑی بان نے باہر سے پکارا...... ''بابو اور کتنی دیر ہو گی؟''

گویا میری جان بچ گئی۔ اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کا میرے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ میرا دل اس بات پر یقین کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا کہ ابھیا بحر مصیبت میں گر

کرغوطے کھارہی ہے میں نے عورتوں کی کتنی ہی الٹی پلٹی حالتیں دیکھی ہیں اس لیے میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ ان ظاہرہ آنکھوں پر اعتبار کر لینا بہت بڑی ناانصافی ہے۔

گاڑی بان نے ایک دفعہ پھر بلایا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ......"میں جلد ہی پھر کسی دن آؤں گا۔" یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ ابھیا اور کچھ نہ بولی...... موم حیات مجسمہ کی طرح بے حس وحرکت زمیں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

❁......❁

میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی چل دی مگر دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ یاد آیا، چھڑی تو وہاں ہی بھول آیا ہوں۔ فوراً گاڑی کھڑی کی اور مکان میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ عین دروازے کے سامنے ہی ابھیا الٹی بڑی ہے اور تیر سے گھائل ہوئے جانور کی طرح کسی نامعلوم درد سے پچھاڑ کھا کر گویا جان توڑ رہی ہے۔

کیا کہہ کر اسے تشفی دوں یہ میری عقل سے بالاتر بات تھی۔ کسی بدحواس کی طرح کچھ دیر گم سم کھڑا رہ کر اسی طرح چپ چاپ لوٹ آیا۔ ابھیا جس طرح رو رہی تھی بدستور روتی رہی۔ اس کو یہ معلوم ہی نہ سکا کہ اس کے اس بے پایاں اضطراب اور بے پناہ درد کا ایک خاموش شاہد بھی اس کائنات میں موجود ہے۔

راج لکشمی کا اصرار میں ابھی تک بھولا نہ تھا۔ پٹنہ خط لکھنے کی بات جب سے یہاں آیا تھا، میرے دل میں جاگزین تھی لیکن اول تو یہ کہ دنیا میں جس قدر بھی مشکل کام ہیں ان میں سے خط لکھنا بھی کسی سے بھی کم نہیں سمجھتا۔ اس کے علاوہ پھر لکھوں بھی کیا؟ حسن اتفاق کہیئے کہ ابھیا کا نالہ وگریہ میرے دل میں اس طرح بھاری ہوا تھا کہ اس کا کچھ حصہ باہر نکالے بغیر مجھے کسی طرح بھی قرار ہی نہ آتا تھا۔ اس لیے اپنی قیام گاہ پر پہنچتے ہی کاغذ قلم لے کر بائی جی کو خط لکھنے بیٹھ گیا......اسے چھوڑ کر میرے درد وغم کا حصہ دار اور تھا ہی کون؟ دو تین گھنٹے بعد اس ادبی بحث، کو ختم کر کے جب میں نے قلم رکھا تو رات کے بارہ بج چکے تھے مگر اس لیے کہ شاید صبح کی روشنی میں یہ خط ڈاک میں ڈالتے ہوئے شرم محسوس ہو میں نے اپنے مزاج گرم رہتے رہتے ہی ان کو اسی وقت لیٹر بکس کے سپرد کر دیا۔

مجھے شک تھا کہ ایک شریف گھرانے کی خاتون کے درد و اضطراب کی داستان کی کسی غیر عورت پر ظاہر کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن ابھیا کی اس انتہائی مصیبت کے موقعہ پر وہ راج لکشمی جس نے ایک دن پیاری بائی کی پیاس کو دبا دیا تھا اس کے لیے کیا نیک رائے دیتی ہے۔ یہ معلوم کرنے کی خواہش نے مجھے ایک دم بے قابو کر دیا اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس سوال کو الٹ پلٹ کر میں نے

ایک مرتبہ بھی نہیں سوچا۔ ابھیا کے شوہر کے نہ ملنے کی بات بھی بار بار دماغ میں گھوم رہی تھی لیکن پتہ مل جانے پر یہ الجھن اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو سکتی ہے۔ یہ تشویش ایک بار بھی پیدا نہ ہوئی اور اس گورکھ دھندے کو حل کرنے کا بار بھی پرماتما نے میرے ہی سپرد کر رکھا ہے یہ بھی کسی نے سوچا تھا؟

تین چار دن بعد میرا ایک برمی کلرک میری میز پر ایک فائل رکھ گیا۔ اس پر نیلی پنسل سے لکھا ہوا بڑے صاحب کا نوٹ تھا۔ انہوں نے مجھے کیس کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ معاملے کو شروع سے آخر تک پڑھ کر کچھ لمحوں کے لئے میں دم بخود رہ گیا۔ واقعہ مختصراً یہ تھا کہ ہمارے پردم دفتر کے ایک کلرک کو وہاں کے ایک انگریز منیجر نے لکڑی چرانے کے شبہ میں معطل کر کے رپورٹ کی تھی کلرک کا نام دیکھ کر ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہی ہماری ابھیا کا شوہر ہے۔ اس کی بھی چار پانچ صفحہ کی کیفیت درج تھی۔ برما ریلوے میں بھی کسی سنگین جرم کی وجہ سے یہ نوکری سے برطرف ہوا تھا یہ اندازہ کر لینے میں بھی مجھے کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کلرک نے آ کر کہا کہ ایک شریف آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے میں تیار ہی تھا اور میں یقیناً جانتا تھا کہ پردم سے وہ شخص اپنے کیس کی پیروی کرنے آیا ہے۔ اس لیے کچھ دیر بعد اس نے مجسم درشن دیئے تو بلاوجہ ہی میں نے پہچان لیا کہ یہی ابھیا کا شوہر ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی میرا دل نفرت سے معمور ہو اٹھا۔ پہنے تھا وہ ہیٹ کوٹ لیکن جس قدر پرانے اتنے ہی گندے۔ تمام چہرہ سیاہ، بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی سے ڈھکا ہوا نیچے کا ہونٹ شاید ڈیڑھ انچ موٹا تھا اور پان اس نے اس کثرت سے کھائے تھے کہ ان کا رنگ دونوں طرف جم گیا تھا۔ بات کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا کہ کہیں تھوک کے چھینٹے نہ آ پڑیں۔

اس بات کو میں جانتا ہوں کہ شوہر ہی عورت کا دیوتا ہے...... وہ ہی اس کی یہ دنیا اور وہ عقبیٰ ہے لیکن اس مجسم بدی کے ساتھ ابھیا کا مقابلہ کرتے ہوئے میری روح تک لرز اٹھی۔ ابھیا اور خواہ جو بھی ہو ایک حسین اور باذوق خاتون ہے لیکن یہ بھینسا برما کے کس جنگل سے یکا یک باہر نکل آیا ہے اس کا علم اس برہما کو ہو گا جس نے اس کی تخلیق کی ہے۔

بیٹھنے کا اشارہ کر کے میں نے دریافت کیا کہ تمہارے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے اس میں کہاں تک سچائی ہے؟ اس کے جواب میں وہ دس منٹ تک واہیات بکتا رہا جس کا مقصد یہ تھا کہ میں بالکل ہی بے قصور ہوں اور میری موجودگی میں پردم دفتر کا صاحب دونوں ہاتھوں سے لوٹ نہیں مچا سکتا تھا یہی اس کی مخالفت کا باعث تھا اور اس نے یہ چال اس لیے اختیار کی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مجھے برطرف کر کے اپنے ایک آدمی کو بھرتی کر لیا جائے مجھے اس کی بات پر مطلقاً یقین نہ آیا میں نے کہا......

"یہ نوکری نہ بھی رہے تو آپ جیسے ہوشیار انسان کے لیے تشویش ہی کس بات کی ہے؟ ریلوے کی ملازمت چھوٹ جانے کے بعد آپ کو کتنے دن بیکار رہنا پڑا تھا؟"

میری بات سن کر وہ پہلے تو کچھ گھبرایا پھر بولا...... "آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ بالکل جھوٹ نہیں ہے لیکن صاحب آپ جانتے ہیں کہ فیملی مین (عیالدار) ہوں۔ بہت سے بچے کچے......"

"آپ نے کیا کسی برمی عورت سے شادی کر لی ہے؟"

وہ یکا یک بول اٹھا...... "معلوم ہوتا ہے کہ سالے صاحب نے رپورٹ میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اسی لیے آپ کی ناراضگی کا علم ہو سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر میرے منہ کی طرف دیکھ کر کچھ نرم ہو کر بولا...... "آپ کیا اس پر یقین کرتے ہیں؟"

میں نے گردن ہلا کر کہا...... "اس میں برائی ہی کیا ہے؟"

حوصلہ پا کر وہ بولا...... "ٹھیک فرماتے ہیں صاحب! میں تو یہ سب سے ہی کہتا ہوں کہ جو کچھ کروں گا بولڈلی (دلیرانہ طور پر) کروں گا۔ میں اس قماش کا نہیں ہوں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں مرد ہوں جو کچھ کہوں گا صاف صاف کہوں گا چھپانے کی ضرورت ہی کیا؟ اس کے علاوہ گھر پر تو میرا کوئی ہے ہی نہیں...... اور جب یہاں رہ کر ہی ہمیشہ کے لیے ملازمت کر کے پیٹ بھرنا ہے تو آپ سمجھتے ہی ہیں صاحب!"

میں نے سر ہلا کر بتایا کہ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔"

پھر پوچھا کہ "گھر پر کیا تمہارا کوئی بھی نہیں ہے؟"

اس کے چہرے پر ذرا سی بھی میل نہ آئی اس نے جواب دیا...... "جی نہیں کوئی نہیں...... اگر کوئی ہوتا تو پھر میں اس سورج ماما کے ملک میں آ سکتا؟ صاحب آپ یقین نہ کریں گے۔ میں ایسے ویسے گھرانے کا لڑکا نہیں ہوں کبھی ہم لوگ بھی زمیندار تھے۔ آج بھی اگر آپ ہمارے دیس کے مکان کو دیکھیں تو آپ کی آنکھیں چکرا جائیں لیکن اوائل عمر میں ہی سب مر کھپ گئے...... میں نے کہا جانے بھی دو۔ گھر بار، دھن، دولت، زمین جائیداد یہ سب ہیں کس لیے؟ سب کچھ ذات برادری میں تقسیم کر کے میں برما چلا آیا۔"

کچھ مستحکم لہجہ میں پوچھا...... "کیا آپ ابھیا کو جانتے ہیں؟"

وہ چونک اٹھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا...... "آپ کو اس کا کس طرح علم ہے؟"

میں نے کہا...... "ایسا بھی ممکن ہے کہ آپ کا پتہ لگا کر اس نے اپنے گزارے کے لیے اس دفتر میں درخواست دی ہو۔" وہ کچھ سرور لہجہ میں بولا...... "اوہ، یوں فرمائیے نا یہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں

کہ ایک وقت وہ میری بیوی تھی۔"

"اور اب؟"

"کوئی نہیں، میں اسے چھوڑ کر یہاں چلا آیا ہوں۔"

"اس کا جرم؟"

اس نے چہرے پر ایک مصنوعی درد کا جذبہ لا کر کہا "آپ جانتے ہیں صاحب! فیملی سیکرٹ (گھریلو راز) بتانا مناسب نہیں مگر اس وقت آپ میرے حقیقی ہمدرد ہیں اس لیے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک بدچلن عورت ہے، اسی روحانی کوفت کی وجہ سے ہی مجھے وطن چھوڑنا پڑا ہے۔ ورنہ کیا کوئی شوق سے اس ملک میں پاؤں رکھ سکتا ہے؟ آپ ہی فرمایئے کہ اس میں کوئی ایسی ویسی ندامت کی بات ہے؟"

"جواب کیا دوں؟" شرم کے مارے میرا سرنگوں ہو گیا۔ شروع سے ہی میں نے اسے پرلے درجے کے دروغ گو کی ایک بات پر بھی یقین نہیں کیا تھا لیکن اب مجھے صاف صاف معلوم ہو گیا کہ یہ جتنا کم ظرف ہے اتنا ہی بے درد بھی ہے۔

ابھیا کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جو الزام شوہر ہو کر بھی اس مکار نے اس پر بلا جھجک لگا دیا غیر ہو کر بھی میں اسے زبان سے کہہ نہیں سکتا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر میں نے کہا...... "اس کے اس جرم کی بات آپ نے آتے وقت تو اس سے نہیں کہی تھی اور جب یہاں آ کر بھی کچھ دن تک آپ اسے خط وغیرہ اور روپیہ پیسہ بھیجتے رہے تو بھی اس پر خط کے ذریعہ یہ بات ظاہر نہیں کی؟"

وہ سیہ کار اعظم بے حیائی سے اپنے موٹے ہونٹوں کو پھاڑ کر ہنستا ہوا بولا۔ "یہی تو بات ہے آپ جانتے ہی ہیں صاحب! کہ ہم شریف آدمی ہیں ہم لوگ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہلکے لوگوں کی طرح اپنی بیوی کے کلنک کی بات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ سکتے۔ خیر یہ سب دکھ کی باتیں چھوڑ دیجئے صاحب! ایسی عورتوں کا نام زبان پر لاتے ہی گناہ ہوتا ہے..... ہاں تو پھر کیس تو آپ ہی ڈسپوز (فیصلہ) کریں گے نا؟ میری جان بچی، خیریت ہوئی لیکن پھر بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ صاحب بچو کو یونہی چھوڑ نہ دیا جاتے بلکہ اچھی طرح ایسا سبق پڑھایا جائے کہ پھر زندگی بھر کبھی میری مخالفت کی جرأت نہ ہو سکے۔ وہ بھی سمجھ جائے کہ میرے مہربان مربی کا کچھ زور ہے سمجھنے نا آپ؟ میں کہتا ہوں کہ کیا اس حرامزادے کو ہیڈ آفس میں کھینچا نہیں جا سکتا؟"

میں نے کہا..... "نہیں"

اس نے ہنسی کی ایک پھل جھڑی سے فائل کو کچھ آگے سرکاتے ہوئے کہا۔ "لیجئے مذاق چھوڑیئے۔ میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ بڑے صاحب بالکل آپ کی مٹھی میں ہیں؟ خیر مرنے دیجئے اسے اور بھی ایک مرتبہ وہ میرے پیچھے لگ کر دیکھ لے۔ اچھا کیا بڑے صاحب کا آرڈر، نکال کر آج ہی میرے ہاتھ نہیں دیا جا سکتا؟ رات کے نو بجے ہی میں چلا جاتا۔ رات کو بیکار تکلیف اٹھانی نہ پڑتی۔ کیا فرماتے ہیں آپ؟"

میں یکا یک جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ خوشامد چیز ہی ایسی ہے کہتے ہیں خوشامد کرا خوش نہ آئید۔ برخلاف بات منہ پر لاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہونے لگی لیکن اس رکاوٹ کی کوئی پرواہ نہ کی اپنے آپ کو سخت بنا کر کہہ ہی دیا۔ "بڑے" صاحب کا حکم حاصل کر لینے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ اور کہیں نوکری تلاش کیجئے۔"

ایک ساعت میں ہی وہ کاٹھ ہو گیا اور کچھ دیر بعد بولا..... "اس کے معنی؟"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ میں آپ کو ڈس مس (برخاست) کرنے کا نوٹس ہی دوں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا..... ایک دم بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں چھلکا آئیں۔ ہاتھ باندھ کر بولا......

"بنگالی ہو کر بنگالی کو مت ماریئے بابو! میں بال بچے دار مر جاؤں گا۔"

"یہ دیکھنے کا بار مجھ پر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں آپ کو جانتا نہیں آپ کے صاحب کے خلاف بھی میں جا نہیں سکتا۔"

اس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی کر شاید سمجھ لیا کہ میں دل لگی نہیں کر رہا ہوں اور بھی کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ہی دفعتہً وہ زور سے رو پڑا۔ کلرک، دربان، چپڑاسی جو جہاں تھے اس غیر متوقع واقعہ سے دنگ ہو گئے۔ میں بھی گویا شرمندہ سا ہو گیا۔ اس کو روکنے کے ارادے سے میں نے کہا..... "ابھیا آپ کے لیے ہی برما آئی ہے۔ ایک بدچلن عورت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے میں اصرار نہیں کرتا لیکن آپ کی سب باتیں سن کر بھی اگر وہ معاف کر سکے..... اور آپ اس سے لکھو کر چٹھی لا سکیں تو آپ کی نوکری بحال رکھنے میں پوری پوری کوشش کروں گا ورنہ دوبارہ مل کر مجھے شرمندہ نہ کرنا..... میں غلط بات نہیں کہتا۔"

میں جانتا تھا کہ یہ بدفطرت لوگ نہایت بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں اس نے آنکھیں پونچھ کر کہا..... "وہ کہاں ہے؟"

"کل اسی وقت آئیں گے تو اس کا پتہ بتا دوں گا۔"

وہ اور کچھ نہ کہہ کر بھی سلام کر کے چلا گیا۔

شام کے وقت ابھیا میرے منہ سے تمام ماجرا سرنگون ہو کر سنتی رہی اس نے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں......زبان سے کچھ نہ کہا......میرے غصے کا بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت دیر بعد میں نے ہی پوچھا......''آپ اسے معاف کرسکیں گی؟''

ابھیا نے صرف گردن ہلا کر اپنی منظوری دے دی۔

''اگر وہ تم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو تم چلی جاؤ گی؟''

اس نے اسی طرح سر ہلا کر جواب دیا۔''ہاں''

''برما کی عورتوں کا مزاج کیسا ہوتا ہے یہ تو تم پہلے ہی دن دیکھ لیا ہے پھر بھی کیا تم وہاں جانے کی جرأت کرسکتی ہو؟''

اس دفعہ ابھیا نے اپنا سر اوپر اٹھایا میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا جاری ہے اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکی اس کے بعد بار بار آنچل سے اپنی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی بھرائے گلے سے بولی......''نہ جاؤں تو میرے لیے چارہ ہی کیا ہے؟ بتایئے؟''

اس کی بات سن کر میں یہ سوچ نہ سکا کہ خوش ہوں یا آنکھوں سے آنسو بہاؤں لیکن مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

اس دن اور کوئی بات نہ ہوئی۔ قیام گاہ پر لوٹتے ہی راستہ بھر یہی ایک بات میں بار بار اپنے آپ سے دریافت کرنے لگا لیکن اس سوال کا کسی طرف سے بھی کوئی جواب نہ مل سکا۔ دل کے اندر کا وہ نامعلوم کس طرف جس طرح فضول ہی غصے سے جل اٹھا اسی طرح دوسری طرف ایک بے بس عورت کے اس سے بھی زیادہ لاعلاج مرض سے مضطرب اور پریشان ہو اٹھا۔ دوسرے دن ابھیا کا پتہ دریافت کرنے کے لیے وہ انسان سامنے آ کھڑا ہوا تو نفرت کے مارے میں اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکا۔ میرا دلی جذبہ سمجھ کر آج وہ زیادہ باتیں کیے بغیر صرف پتہ دریافت کر کے عاجزی کے ساتھ چلا گیا لیکن اگلے دن جب وہ ملنے آیا تو اس کی آنکھوں اور چہرے کا رنگ ڈھنگ ہی اور تھا۔ پر نام کر کے اس نے ابھیا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس سطر میری میز پر رکھ دی اور کہا......''آپ نے میری جو بھلائی کی ہے اس زبان سے کیا عرض کروں۔ جب تک زندہ رہوں گا آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔''

ابھیا کی تحریر پر نظر جمائے ہوئے ہی میں نے کہا......''جایئے آپ اپنا کام کیجئے۔ بڑے صاحب نے اس بار معاف کردیا ہے۔''

اس نے ہنس کر کہا......''بڑے صاحب کی مجھے فکر نہیں آپ معاف کردیں تو میں جی جاؤں۔ آپ کے قدموں میں میں نے بہت سی خطائیں کی ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے پھر بکنا شروع کردیا......

اسی طرح کی بالکل ہی خالص خوشامدانہ باتیں اور درمیان میں گاہے گاہے رومال سے آنکھیں بھی پونچھنے لگا۔ اتنی زیادہ باتیں سننے کا حوصلہ اور کسی کو نہیں ہوسکتا اس لیے یہ سزائیں آپ کو دینا نہیں چاہتا۔ میں اس کی طول طویل داستان کا مختصراً ہی ذکر کروں گا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی پر جو الزام لگایا تھا وہ بالکل ہی جھوٹ ہے۔ اس نے شرم کے پھیر میں پڑ کر ہی ایسا کیا تھا ورنہ ایسی ستی لکشمی کیا کہیں مل سکتی ہے اور دل ہی دل میں وہ ابھیا کو ہمیشہ جان سے بھی عزیز سمجھتا رہا ہے۔ اور یہاں جو اسے ایک اور موقعہ مل گیا اس کی اسے بالکل ہی خواہش نہ تھی محض برمیوں کے ہاتھ سے جان بچانے کے لیے ہی اس نے ایسا کیا ہے (ممکن ہے کہ اس میں کچھ صداقت بھی ہو) لیکن آج رات جب وہ اپنے گھر کی لکشمی کو لے جا رہا ہے تو اس برمی بچی کو دفع کرتے کچھ دیر نہ لگے گی؟ باقی رہے لڑکے بچے......اوہ ہو! سالوں کی جیسی شکل وصورت ہے ویسا ہی مزاج بھی ہے وہ کسی کام کے نہیں۔ بڑھاپے میں نہ تو کھانے پہننے کو ہی دیں گے اور نہ مرنے پر ایک چلو پانی کی ان سے امید ہوسکتی ہے۔ جاتے ہی ان سب کو جھاڑو مار کر رخصت کردوں گا وغیرہ وغیرہ۔''

میں نے پوچھا......''ابھیا کو آج ہی رات لے جائیں گے آپ؟'' اس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا......''خوب، جب تک آنکھوں نہیں دیکھا تھا تو خیر کسی طرح رہا گیا مگر آنکھوں دیکھ کر کیا اسے آنکھ سے اوجھل کرسکتا ہوں؟ تنہا اتنی؟ مصیبت اٹھا کر، اتنی دور صرف میرے لیے تو آئی ہے۔ ایک مرتبہ اس بات پر غور تو کیجئے۔''

میں نے پوچھا......''کیا دونوں کو ایک ساتھ ہی گھر میں رکھو گے؟''

''جی نہیں، اس وقت تو پردم کے پوسٹ ماسٹر کے ہاں ہی رکھوں گا۔ ان کی بیوی کے ساتھ مزے سے رہے گی لیکن دو ایک دن میں ہی......زیادہ نہیں۔ اس کے لیے مکان کا انتظام کروں گا اور پھر گھر کی لکشمی کو گھر لے جاؤں گا۔''

ابھیا کا شوہر چلا گیا۔ میں نے روزانہ کام کاج میں دل لگانے کی غرض سے سامنے کی فائل کو کھینچ لیا۔

اسکے نیچے پڑی ہوئی ابھیا کی تحریر پر ایک دفعہ پھر میری نظر گئی۔ اس کے بعد کتنی ہی بار ان دو سطروں کو میں نے پڑھا اور نامعلوم اور کتنی بار پڑھتا لیکن اسی دوران میں ہی چپڑاسی نے کہا......''بابو جی آپ کے مکان پر کون کون سے کاغذات پہنچانے ہوں گے؟'' چونک کر میں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس وقت مقابل کی گھڑی میں ساڑھے چار بج چکے تھے اور کلرک لوگ اپنا اپنا کام ختم کر کے گھر چلے گئے ہیں۔

☆☆☆

اب مجھے ابھیا کے شوہر کا ایک خط ملا۔ بدستور سابق تمام خط جذبہ شکر گزاری سے بھر کر اس بات کا بالتفصیل مودبانہ ذکر کیا تھا کہ اس وقت وہ نہایت مصیبت میں ہے اور مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ میں کیا کروں؟ مختصراً بات یہ تھی کہ اس نے اپنی طاقت سے زیادہ خرچ کر کے بھی ایک بڑا مکان کرایے پر لے لیا تھا اور اس میں ایک طرف اپنے برمی بیوی بچوں کی رہائش کا انتظام کر کے دوسری طرف ابھیا کو لا کر رکھنے کی کوشش میں تھا لیکن ابھیا کسی طرح بھی رضامند نہ ہوتی تھی۔ بیوی کی اس نامعقول ضد سے اس کو ایک روحانی صدمہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ محض کلجگ کا ہی نتیجہ ہے، ست جگ میں ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ بڑے بڑے رشی منی تک...... بے شمار مثالیں دے کر اور ان کا بار بار ذکر کر کے اس نے لکھا تھا کہ ہائے کہاں ہیں وہ آریہ دیویاں؟ وہ سیتا ساوتری کہاں گئیں؟ جو آریہ عورتیں شوہر کے نقوش پا کو دل میں نقش کر کے ہنستی مسکراتی چتا کے شعلوں میں جل جاتا کرتی تھیں۔ اور شوہر کے ہمراہ ابدی سورگ کی حقدار ہوتی تھیں۔ وہ اب کہاں ہیں؟ جو ہندو عورت مسرور اور شاداں چہرے اپنے جذباتی شوہر دیوتا کو کندھے پر اٹھا کر ویشا کے گھر تک پہنچا آئی تھی کہاں ہے اس جیسی شوہر پرست عورت؟ کہاں ہے وہ شوہر پرستی۔ آہ، بھارت درس! کیا تیری گرمادٹ کی ایک دم ہی انتہا ہو گئی۔ وہ گزرے ہوئے افسانے کیا ہم ایک بار پھر بھی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں گے اور کیا ہم لوگ......" وغیرہ وغیرہ تقریباً دو صفحے اس نے ایسی گریہ وزاری سے بھر دیے تھے لیکن ابھیا اپنے شوہر کو اتنا روحانی صدمہ پہنچا کر ہی خوش نہ ہوئی اور بھی سنیے۔ اس نے لکھا تھا کہ صرف اس پر اکتفا نہیں کہ اس کی بیوی غیر کے گھر میں رہتی ہے بلکہ آج اسے اپنے دلی دوست پوسٹ ماسٹر سے معلوم ہوا ہے کہ روہنی نام کے کسی انسان نے اس کی بیوی کو خط لکھا ہے اور کچھ روپے بھی بھیجے ہیں اور اس سے مجھ بدبخت کی عزت کو کتنا صدمہ پہنچا یہ لکھ کر بتانے کا مضمون نہیں۔

خط پڑھتے پڑھتے ہی اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ ساتھ ہی ساتھ روہنی کے برتاؤ پر بھی مجھے کم غصہ نہ آیا۔ اب اسے روپے بھیجنے اور خط لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جس عورت نے پتی کے گھر کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سخت اور اذیتیں برداشت کیں اس کے دل کو دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اچاٹ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور ابھیا نے بھی اس قسم کا سلوک کیوں شروع کر دیا ہے آخر وہ کیا چاہتی ہے؟ اس کے شوہر نے جس عورت کو بیوی کی شکل میں قبول کیا ہے لڑکے بچے پیدا کیے ہیں ان سب کو ترک کر کے محض اسی کو لے کر گھر گرہستی کس طرح چلائے؟ کیوں، برمی عورتیں کیا عورتیں نہیں ہیں؟ انہیں کیا سکھ دکھ، عزت بے عزتی کا احساس نہیں ہے؟ ظلم اور انصاف کا قانون کیا ان کے لیے

طاق نسیاں پر رکھ دینا چاہیے؟ اور بالفرض محال اگر ایسا ہے تو اسے وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ سب جھگڑے یہاں ہی نپٹ جاتے تو اچھا ہوتا۔

اب تک میں روہنی سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بلاوجہ ہی جھوٹ موٹ تکلیف اٹھا رہا ہے اس لیے بھی شاید اس کی طرف جانے کی میری خواہش نہ ہوتی تھی۔ آج چھٹی ہونے سے پیشتر ہی گاڑی بلوانے کے لیے آدمی بھیج کر میں اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسی وقت ابھیا کا خط ملا کھول کر دیکھا تو تمام خط شروع سے لے کر آخر تک روہنی کے متعلق ہی بھرا پڑا تھا۔ میں اس کا ہمیشہ خیال رکھوں۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دوں...... وہ کتنا کمزور کتنا بے بس اور لاچار ہے یہی ایک بات ہر سطر اور ہر لفظ میں ایسے دلی اضطراب کے ساتھ پھوٹی پڑتی تھی کہ بھولا بھالا انسان بھی اس التجا کے مقصد کو سمجھنے میں غلطی نہ کرتا۔ اپنے سکھ دکھ کا اس خط میں کوئی ذکر تک نہ تھا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ کئی خاص وجوہات سے وہ ابھی تک اسی جگہ ہے جہاں پہلے پہل آ ٹھہری تھی۔

محض شوہر ہی کسی ستی عورت کا واحد دیوتا ہو سکتا ہے یا نہیں اس کے متعلق اپنی رائے شائع کر کے اس کی نشر و اشاعت کرنے کے لیے میں تیار نہیں لیکن مکمل ستی پن کی ایک لاثانی مثال اور فلک پیا فضیلت جو میری ان داجیجی نے ظلم و ستم کا شکار ہو کر اور ہمیشہ دکھ اور مصیبتیں قبول کر کے میرے دل کی گہرائیوں میں نقش کر رکھی تھی اور جس نے حقیر عورت کا مرتبہ بلند وارفع بنا دیا تھا۔ میرا وہ فردوسی تخیل ابھیا کے خط کا وار برداشت نہ کر سکا۔

جانتا ہوں کہ ہر عورت ان داجیجی نہیں ہے۔ اس بعید از قیاس پر بے رحمی کو سینہ تان کر خندہ پیشانی سے دعوت دینے کے قابل بھی ہر عورت کا سینہ نہیں ہو سکتا اور جس شے کا وجود نہیں ہے اس کے لیے ہر روز افسوس اور حیرت کا اظہار کرنا کسی مصنف کا فرض ہے بھی یا نہیں اس کا میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا تاہم میرا دل کسی درد سے معمور ہوا تھا۔ غصے میں بھرا ہوا میں گاڑی پر جا پہنچا اور اس نکمے اور غیر عورت پر فریفتہ روہنی کو جو کڑی کڑی باتیں اچھی طرح سنانے کا تہیہ کر چکا تھا انہیں دل ہی دل میں دوہراتے ہوئے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ شام ہو رہی تھی یعنی دن کی روشنی ختم ہو کر شام کی تاریکی آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔

ابھی بھادوں پورے جوبن پر نہ تھا اور نہ اس وقت بادلوں میں جوبن تھا۔

لیکن سنسان گھر بار کی بھی اگر کوئی شکل و صورت ہو سکتی ہے تو اس دن اس تاریکی اور روشنی کے اتصال میں وہ مجھے نظر آئی اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہوا کرتی ہے یہ تو میں آج بھی نہیں جانتا۔ گھر کے در و دیوار بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ صرف رسوئی گھر کی ایک کھڑکی سے کچھ دھواں نکل رہا تھا۔ دائیں

طرف کچھ آگے بڑھ کر جھانکنے سے معلوم ہوا کہ چولہا جل کر تقریباً بجھ رہا ہے اور قریب ہی زمین پر رونی بابو درانتی سے ایک بینگن کے دو ٹکڑے کر کے گم سم بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے پاؤں کی آہٹ ان کے کانوں تک نہ پہنچی کیونکہ قوت سمع کا آقا اس وقت خواہ کسی اور جگہ ہو لیکن بینگن پر محور نہیں تھا۔ اس بات کو میں بلا خوف تردید کہہ کر سکتا ہوں لیکن جب میں چپ چاپ لوٹ کر ان دو کمروں کے درمیان آ کھڑا ہوا تو مجھے صاف صاف معلوم ہوا کہ ایک بے پایاں اضطراب سے پر گریہ تمام گھر کو معمور کر کے اطراف و جوانب پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے اور تمام سوسائٹی تمام نیکی بدی تمام گناہ وثواب سے بھی بعید...... بہت بعید تر شے ہے وہ۔

باہر آ کر میں برآمدے میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد شاید دیا جلانے کے لیے رونی بابو باہر آئے اور خوفزدہ ہو کر انہوں نے پوچھا...... ''کون ہے؟''

میں نے آواز دے کر کہا...... ''میں ہوں شری کانت!''

''شری کانت بابو؟ اوہ......'' کہہ کر وہ تیز چال سے نزدیک آئے، اندر جا کر انہوں نے چراغ جلایا اور پھر مجھے اندر لے جا کر بٹھایا۔ اس کے بعد کسی کے منہ سے بھی کوئی بات نہ نکلی...... دونوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ اس خاموشی کو پہلے پہل میں نے ہی توڑا کہا...... ''اب یہاں کس لیے رہتے ہو؟ چلو میرے ساتھ۔''

رونی نے پوچھا ''کیوں؟''

میں نے کہا...... ''یہاں آپ کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے؟''

رونی کچھ توقف کے ساتھ بولا...... ''تکلیف اب مجھے کیا ہے؟''

بجا ہے لیکن ایسی حالت ہے تو کوئی تنقید وغیرہ نہیں ہو سکتی۔ میں کس طرح اسے ذلیل کروں گا وغیرہ وغیرہ یہی باتیں سوچتا ہوا گھر سے چلا تھا لیکن وہ سب خیالات یہاں بہہ گئے۔ پالیٹکس اتنا زیادہ نہیں پڑھا تھا کہ اس بیمار کی توہین کر سکوں۔ کہاں گیا میرا غصہ اور کہاں گیا میرا حسد اور تمام نیک جذبات کس کونے میں منہ چھپائے رہے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

رونی نے کہا کہ اس نے وہ پرائیویٹ ٹیوشن چھوڑ دی ہے کیونکہ اس سے صحت بگڑتی تھی۔ اس کا دفتر بھی اس کے حسب حال نہیں ہے۔ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اس کے علاوہ اسے اب کوئی تکلیف نہیں ہے۔

میں خاموش ہو رہا کیونکہ اسی رونی کے منہ سے اس کے بالکل برعکس بات سنی تھی۔ کچھ دیر چپ رہ کر پھر کہنے لگا...... ''آفس سے تھکے ماندے لوٹ کر یہ کھانا پکانا بالکل ایک عذاب معلوم ہوتا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے شری کانت!''

میں اور کیا کہتا۔ آگ بجھ جانے پر صرف پانی کے زور سے تو انجن چلایا نہیں جا سکتا یہ تو تسلیم شدہ امر ہے۔

با ایں ہمہ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔ تصور کی تو کوئی حد بست قائم نہیں کی جا سکتی اس لیے اس بات کو چھیڑنا بے کار ہے۔

مگر کسی ناممکن امید سے اس کے دل میں سکون و قرار نہ تھا اور میں اس کی کچھ باتوں سے سمجھ گیا تھا تاہم وہ اس عذاب کدہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا یہ میں سوچ نہ سکا۔ لیکن اس کے پرماتما سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ جس بدنصیب کے گھر کا راستہ بند ہو گیا ہے اسے اس سنسان گھر کی ویرانی ثابت قدم نہ رکھ سکے تو اس کو مٹھی میں لینے سے روکنا دنیا میں کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

اپنے مکان پر واپس لوٹتے کچھ رات ہو گئی۔ گھر میں گھس کر دیکھا کہ ایک کونے میں بستر بچھا کر کوئی سر سے پاؤں تک کپڑا اوڑھے سو رہا ہے خادمہ سے دریافت کرنے پر جواب ملا ''شریف آدمی ہے۔''

''اسی لیے میرے کمرہ میں!''

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ان حضرات سے بات چیت ہوئی۔ ان کا گھر چٹا گانگ ضلع میں ہے۔ تقریباً چار سال کے بعد ان کے لاپتہ چھوٹے بھائی کا پتہ ملا ہے اور اسے واپس گھر لے جانے کے لیے وہ آئے ہیں۔ وہ بولے...... ''صاحب کہانیوں میں سنا تھا کہ زمانہ قدیم میں کام روپ کی عورتیں غیر ملکی لوگوں کو بھیڑ بنا کر باندھ رکھتی تھیں۔ نامعلوم اس وقت وہ کیا کرتی ہوں گی لیکن اس زمانہ میں بھی برما کی عورتیں اس سلسلہ میں ان سے رتی بھر بھی کم نہیں ہیں۔ میرے جسم کا رواں رواں اس کا احساس کر رہا ہے۔''

اور بھی بہت سی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی نجات کے لیے میری امداد طلب کی۔ میں نے وعدہ دے دیا کہ ان کے اس نیک ارادے کو کامیاب بنانے میں سرگرمی سے منہمک ہو جاؤں گا اور یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کیوں؟ دوسرے دن صبح بسیار کوشش اور تلاش کے بعد ان کے چھوٹے بھائی کے برمی سسرال جا پہنچا۔ بڑے بھائی آڑ میں راستے کے کنارے چہل قدمی کرنے لگے۔

چھوٹے بھائی گھر پر نہ تھے۔ سائیکل لے کر صبح سیر کے لیے باہر گئے تھے۔ ان کی بیوی اپنی بہن اور ایک دو خادماؤں کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ ان لوگوں کا ذریعہ معاش برما چرٹ بنانا تھا۔ اس

وقت سب اسی کام میں مصروف تھے مجھے بنگالی دیکھ کر اور غالباً اپنے شوہر کا دوست سمجھ کر انہوں نے میرا گرمجوشی کے ساتھ مقدم کیا۔ برما کی عورتیں نہایت محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں لیکن مرد نہایت نکھے اور کاہل ہوتے ہیں۔ وہاں گھر کے چھوٹے موٹے کام کاج سے لے کر کاروبار تک کا سب انتظام عموماً عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے لکھنا پڑھنا سیکھنے بغیر ان کا کام نہیں چلتا لیکن مردوں کی بات علیحدہ ہے۔ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے تو بہتر ورنہ شرمندگی کے مارے مرنا نہیں ہوتا نکما اور کاہل مرد بیوی کی کمائی کھا کر باہر اسی کے مال پر بابو بنا پھرتا ہے اور اس سے لوگوں کوئی تو تعجب نہیں ہوتا اور عورتیں بھی چھی چھی، ڈرڈر، من من پن پن کر کے اس کا ناک میں دم کر دینا مناسب نہیں سمجھتیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ان کی سوسائٹی میں یہ بات قدرتی اور اخلاق کا جزو بن چکی ہے۔

دس پندرہ منٹ میں ہی بابو صاحب لوٹ آئے جسم پر مکمل انگریزی لباس، ہاتھ میں دو تین انگشتریاں، گھڑی چین وغیرہ کام کاج کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا پھر بھی دیکھا کہ حالت خوب اچھی ہے۔ ان کی برمی بیوی اپنے ہاتھ کا کام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ہاتھ سے ٹوپی اور چھڑی لے کر رکھ دی۔ چھوٹی بہن نے چرٹ دیا سلائی وغیرہ لا دیئے۔ ایک خادمہ نے چائے کا سامان اور دوسری نے پان کا ڈبہ لا حاضر کیا۔ واہ کیا خوب؟ اس انسان کو تو سب نے مل کر بالکل راجا جی کی طرح رکھ چھوڑا ہے۔ نام میں بھول گیا ہوں۔ شاید چارڈ وارڈ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ جانے دو اتنی پریشانی کس لیے؟ نہ ہوگا تو ہم لوگ صرف بابو کہہ کر پکار لیں گے۔

بابو نے سوال کیا آپ کون ہیں؟ میں نے کہا ”میں آپ کے بھائی کا دوست ہوں۔ انہوں نے اس بات کا یقین نہ کیا...... بولے ”آپ تو کلکتیہ ہیں، میرے بھائی تو کبھی وہاں گئے بھی نہیں۔ پھر دوستی کس طرح ہوئی؟“

کس طرح دوستی ہوئی، کہاں ہوئی؟ کب ہوئی، اس وقت وہ کہاں ہیں وغیرہ مختصراً بیان کر کے ان کے آنے کا مقصد بھی میں نے بتا دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ وہ اپنے بھائی کے دیدار کے لیے بے قرار ہیں۔

دوسرے دن صبح ہی ہمارے ہوٹل میں بابو جی نے قدم رنجہ فرمایا اور دونوں بھائیوں کی طویل گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ پھر تو دونوں بھائیوں میں ایسا میل جول ہو گیا کہ صبح شام غرض یہ کہ جب بھی موقعہ ملتا بابو صاحب بھیا بھیا پکار کر آ حاضر ہونے لگے اور پھس پھس سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کھانے پینے کی تو کوئی حد ہی نہ رہی۔ ایک دن شام کو وہ اپنے بھیا کو اوپر مجھے بھی چائے بسکٹ کی دعوت دے گئے۔

اسی دن ان کی برمی بیوی سے میری کھل کر بات چیت ہوئی۔ وہ نہایت سادہ دل، خوش مزاج اور نیک خاتون تھی۔ اس نے یہ شادی محبت کی بنا پر اپنی مرضی سے کی تھی اور کمال یہ تھا کہ اپنی ازدواجی زندگی میں اس نے انہیں ایک دن کے لئے بھی تکلیف نہیں دی۔ چار پانچ دن بعد بڑے بھیا نے مسکراتے ہوئے کان میں کہا کہ پرسوں صبح جہاز سے ہم لوگ گھر جا رہے ہیں۔ سن کر مجھے ڈر سا لگا پوچھا...... ”آپ کے بھائی پھر یہاں واپس آئیں گے؟“

بڑے بھیا بولے...... ”اب رام رام کر کے کسی طرح ایک دفعہ جہاز پر تو سوار ہو جائیں۔“

میں نے پوچھا...... ”اس کی بیوی کو بتا دیا ہے؟“

بڑے بھیا بولے...... ”باپ رے، پھر ہم کیا بچ سکیں گے۔ سالی جو جہاں ہوں گیں بھڑوں کے چھتے کی طرح آ کر گھیر لیں گی۔“ یہ کہہ کر اور پھر دونوں آنکھیں مٹکا کر ہنستے ہوئے بولے...... ”فرنچ لو صاحب!“ ...... آپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟“

مجھے کافی صدمہ پہنچا بولا...... ”اگر ایسا ہوا تو اس عورت کو بہت زیادہ تکلیف ہوگی۔“

میری بات سن کر بڑے بھیا تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے بمشکل تمام ہنسنا بند کر کے بولے...... ”واہ، آپ نے بھی خوب کہا۔ ان بری عورتوں کو تکلیف؟ ان سالیوں کی قوم کے لوگ تو کھا کر کلا تک نہیں کرتے نہ ان کے ہاں جوٹھے میٹھے کا کچھ خیال ہے اور نہ ذات پات کا۔ سالی سب نپی (ایک قسم کی سڑی ہوئی مچھلیاں) کھاتی ہیں صاحب نپی جس کی بد بو سے بھوتنیاں تک بھاگ جائیں۔ ان سالیوں کو تکلیف۔ ایک چلا جائے گا تو دوسرے کو پکڑ لیں گی۔ نیچ قوم کی ہیں سالی......“

”ٹھہریئے صاحب ٹھہریئے، آپ کے بھائی کو اس نے ان چار سالوں تک راجاؤں کی طرح کھلایا پلایا ہے اور کچھ نہ سہی اس کے لیے تو ان کا کچھ احسان مند ہونا چاہئے۔“

بڑے بھائی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے...... ”آپ نے تو مجھے لاجواب کر دیا۔ مرد بچے ہیں۔ غیر ملک میں آ کر عمر کے تقاضا سے اگر کچھ شوق کر ہی ڈالا تو کیا ہوا؟ اور پھر کون ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ سبھی کرتے پھرتے ہیں۔ مجھ سے تو کچھ بھی چھپا نہیں بدقسمتی سے اس کا راز ظاہر ہو گیا یہ بس اسی لیے کیا اس کو ہمیشہ کے لیے پھرتے رہنا ہوگا۔ شریف بن کر گھر گرہستی چلا کر از سر نو پانچ پنچوں میں شامل ہوتا ہے صاحب! یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے کچی عمر میں باہر جا کر مرغی تک کھا لیتے ہیں مگر عمر کی پختگی کے ساتھ سب کچھ جاتا رہتا ہے۔ ایسا کریں تو پھر کام ہی کس طرح چلے؟ اب آپ ہی غور فرمایئے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے یا جھوٹ؟“

درحقیقت اس قسم کا خیال کرنے والی قوت تمیز بھگوان نے مجھے عطا نہیں کی۔ اس لیے میں

خاموش رہا اور دفتر کا وقت ہو رہا تھا لہٰذا نہا کھا کر چل دیا۔

لیکن دفتر سے لوٹتے ہی وہ پھر یکا یک بول اٹھے...... ''میں نے غور کر کے دیکھ لیا ہے آپ کی رائے ہی درست ہے صاحب! اس ذات کا کوئی بھروسہ نہیں نا معلوم جاتے وقت آخر کار کیا فساد کھڑا کر دے۔ کہہ کر جانا ہی ٹھیک ہے۔ یہ سالی جو نہ گزریں تھوڑا ہے۔ نہ لاج ہے، نہ شرم اور نہ کچھ دھرم کرم کا خیال۔ ان کو اگر جانور بھی کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔''

میں نے کہا...... ''ہاں یہی ٹھیک ہے۔''

لیکن نا معلوم کیوں مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ دل ہی دل میں ایسا محسوس ہوا کہ اس میں در پردہ کوئی سازش ہے۔ دراصل سازش تھی لیکن وہ اتنا ذلیل اور اتنا کم ظرف ہوگا بغیر دیکھے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چٹا گانگ کے لیے جہاز اتوار کو جانا تھا۔ صبح کے وقت اور کرتا بھی کیا؟ ان لوگوں کو سی آف (وداع) کرنے کے لیے جہاز کے ساحل پر جا پہنچا۔ اس وقت جہاز جیٹی سے لگا ہوا تھا۔ جانے والے اور نہ جانے والے دونوں قسم کے لوگوں کی دوڑ دھوپ اور شور وغل میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہی اس برمی خاتون پر نظر پڑ گئی۔ اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لئے وہ ایک کنارے کھڑی تھی۔ تمام رات بھر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھیں گلنار ہو رہی تھیں۔ چھوٹے بابو بہت زیادہ مصروف تھے۔ وہ اپنی دو پہیوں کی گاڑی (سائیکل) ٹرنک، بستر اور بھی نا معلوم کیا کیا لیے قلیوں کے ہمراہ دوڑ دھوپ کر رہے تھے ایک لمحہ بھر کی بھی فرصت نہ تھی۔

رفتہ رفتہ تمام سامان جہاز پر لاد دیا گیا۔ مسافر بھی دھکم پیل کر کے سوار ہو گئے جنہیں کہیں جانا نہ تھا وہ نیچے اتر آئے۔ سامنے کی طرف لنگر اٹھنے لگا۔ اسی وقت چھوٹے بابو اپنے سامان کو حفاظت سے رکھ کر اور جگہ ٹھیک کر کے اپنی برمی بیوی کے پاس وداع لینے کے دھوکہ سے دنیا کی بے حیائی کا تماشہ دکھانے کے لیے جہاز پر سے نیچے اترتے۔ وہ سیکنڈ کلاس کے مسافر تھے اس لیے انہیں یہ حق حاصل تھا۔

☆☆☆

میں نے کئی مرتبہ سوچا ہے کہ اس کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ انسان اپنے ضمیر کو زبردستی کیوں ذلیل کرتا ہے۔ باقاعدہ منتر پڑھ کر شادی نہ ہوئی تو کیا ہوا مگر وہ بیوی تو ہے وہ بیٹی، بیوی اور ماں کی نسل سے تو ہے۔ اسی کے بھروسہ پر تو وہ اتنے طویل عرصہ تک شوہر کے تمام حقوق کا فائدہ حاصل کرتا رہا ہے۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ جس نے اپنے دل کی تمام تر دلکشی، اپنی محبت کا تمام تر آب حیات اور اپنا تن من اس پر نثار کر دیا تھا۔ پھر کس ترغیب سے وہ ان بے شمار لوگوں کی آنکھوں میں طعن و تشنیع کا شکار بنا

کر چلتا بنا۔ وہ ایک رومال سے اپنی دونوں آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور دوسرا ہاتھ اپنی برمی بیوی کے گلے میں حمائل کر کے روتے ہوئے لہجہ میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بیوی آنچل میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

گرد و پیش بہت سے بنگالی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ تو منہ پھیر کر ہنس رہے تھے اور کچھ منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں کچھ فاصلہ پر تھا۔ اس لئے پہلے تو کچھ سمجھ نہ سکا لیکن قریب آتے ہی سب باتیں صاف صاف معلوم ہونے لگیں۔ وہ گریہ آلود لہجہ میں برمی اور دیہاتی بنگالی ملا کر کہہ رہا تھا...... ''جس کو بنگالی میں کچھ ترمیم کے ساتھ کہا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا...... ''ایک مہینے بعد رنگ پور سے تمباکو خرید کر کس طرح آ جاؤں گا یہ میں جانتا ہوں۔ میری ولاّ رام تجھے کیلا دکھا کر چلا رے۔ کیلا دکھا کر چلا۔'' اور یہ سب باتیں صرف ہمارے جیسے کچھ اجنبی بنگالی تماشائیوں کو ہنسانے کی غرض سے ہی کہہ رہا تھا لیکن اس کی بیوی بے چاری بنگالی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو رو رو کر چھاتی پھاڑ رہی تھی اور بمشکل ہاتھ اٹھا کر اور اس کی آنکھیں پونچھ کر تشفی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ آدمی زور زور سے بسور بسور کر روتا ہوا کہنے لگا...... ''بڑی مشکل ہے پانچ سو روپیہ تمباکو خریدنے کے لیے دیئے ہیں...... اب کچھ بھی تیرے پاس نہیں رہا...... میرا پیٹ تو بھرا نہیں۔ اسی طرح اگر تیرا مکان بھی فروخت کر کے بھلے گھر کے لڑکے کی طرح گھر جا سکتا تو بھی سمجھتا کہ ہاں ایک داؤ مارا۔ ہائے یہ سب کچھ نہیں ہوا رے، کچھ بھی نہیں ہوا۔''

آس پاس کے لوگ ہنسی کو روکے رکھنے کی وجہ سے پھول پھول اٹھنے لگے لیکن جس کے متعلق یہ سب مذاق ہو رہا تھا اس کی آنکھیں اور کان دکھ کے آنسوؤں سے جل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس غم میں کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔

ملاحوں نے پکار کر اوپر سے کہا...... ''بابو سیڑھی اٹھائی جا رہی ہے۔''

بابو گلا چھوڑ کر سیڑھی تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔ بیوی کے ہاتھ میں پرانے زمانہ کی قیمتی نگینہ والی انگوٹھی تھی۔ اسی پر ہاتھ رکھ کر روتا ہوا بولا...... ''اری دے دو ری، یہ انگوٹھی ہی لے جاؤں اس کی قیمت کم از کم دو ڈھائی سو روپے تو ضرور ہوگی...... ان کو ہی کیوں چھوڑوں؟''

بیوی نے اسے جھٹ پٹ اتار کر اپنے محبوب کی انگلی میں پہنا دیا جو ملا وہی اچھا، کہہ کر روتا ہوا بابو سیڑھی پر چڑھ گیا۔ جہاز جیٹی چھوڑ کر رفتہ رفتہ دور سرکتا گیا۔ اور وہ عورت منہ پر آنچل ڈال کر اور گھٹنے ٹیک کر وہیں بیٹھ گئی۔ بہت سے لوگ دانت نکال ہنستے ہنستے چلے گئے۔ کسی نے کہا...... ''واہ رے لڑکے، کسی نے کہا'' واہ رے بہادر چھوکرے، بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے چلے گئے'' ...... کیا تماشہ کیا۔ ہنستے ہنستے پیٹ درد کرنے لگا، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ صرف ایک میں ہی ایسا چشم دید گواہ تھا، جو اس کے

دردِ غم سے متاثر ہو کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

چھوٹی بہن آنکھیں صاف کرتی ہوئی اپنی بہن کا ہاتھ کھینچ رہی تھی۔ میرے قریب جاتے ہی وہ آہستہ سے بولی...... ''بابو جی آئے ہیں بہن، اٹھو۔''

سر اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور اسی وقت اس کے گریہ کا بندھ ٹوٹ کر پھٹ پڑا۔ میرے پاس تشفی دینے کے لیے اور کیا تھا؟ تاہم اس دن میں اس کا ہاتھ نہ چھوڑ سکا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ راستہ بھر وہ رو رو کر یہی بات کہتی رہی...... ''بابو جی میرا گھر سونا ہو گیا۔ میں اس گھر میں پاؤں کس طرح رکھوں گی۔ ایک مہینے کے لیے تمبا کو خریدنے گئے ہیں...... یہ ایک مہینہ میں کس طرح کاٹوں گی۔ پردیس میں نا معلوم انہیں کتنی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ میں نے انہیں وہاں کیوں جانے دیا۔ رنگون میں بازار کے تمباکو سے ہمارا کام تو مزے سے چل رہا تھا۔ محض زیادہ منافع کی امید سے خواہ مخواہ انہیں اتنی دور بھیجا غم کے مارے میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے نہ بابو جی اگلی میل سے میں ان کے پاس چلی جاؤں گی۔'' اسی طرح وہ نا معلوم کیا کیا کہتی رہی۔

میں ایک بات کا بھی جواب نہ دے سکا اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکال کر اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو چھپاتا رہا۔

وہ کہنے لگی...... ''بابو جی تمہاری قوم کے افراد جتنا پریم پیار کر سکتے ہیں۔ اتنا ہماری قوم کے لوگ نہیں کر سکتے۔ تم لوگوں میں رحم اور ہمدردی کا جو جذبہ ہے وہ دوسرے کسی ملک کے لوگوں میں نہیں ہے۔''

کچھ دیر رک کر اور تین بار آنکھیں پونچھ کر وہ کہنے لگی...... ''بابو کی محبت میں گرفتار ہو کر جب میں ان کے ساتھ رہنے لگی تو کتنے ہی لوگوں نے ڈر دکھا کر مجھے روکا تھا لیکن میں نے کسی کی بھی بات نہ سنی۔ اس وقت نا معلوم کتنی عورتیں میری خوش قسمتی پر رشک کھاتی ہیں۔''

چوک کے نزدیک پہنچ کر میری خواہش ہوئی کہ گاڑی سے اتر کر اپنے ڈیرے پر چلا جاؤں مگر وہ بے تانہ، دونوں ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بولی...... ''نہ بابو جی، یہ نہ ہوگا۔ تم ہمارے ساتھ چلو اور چائے کا پیالہ پی کر واپس آ جاؤ چلیے۔''

میں انکار نہ کر سکا۔ گاڑی چلنے لگی۔ اس نے یکا یک پوچھا...... ''اچھا بابو جی، رنگ پور کتنی دور ہے؟ آپ کبھی وہاں گئے ہیں؟ کیسی جگہ ہے؟ بیمار ہونے پر وہاں ڈاکٹر تو مل سکتے ہیں نا؟''

باہر کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے جواب دیا...... ''ہاں ملتے کیوں نہیں۔''

ایک آہ بھر کے وہ بولی۔ بھیا'' پھیا (پرماتما) انہیں اچھا رکھیں۔ ان کے بھائی بھی ساتھ

ہیں۔ وہ نہایت نیک دل ہیں۔ چھوٹے بھائی کو تو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھیں گے تم لوگ تو گویا مجسم محبت ہو مجھے کوئی تشویش نہیں کیوں ہے نا بابو جی!''

میں باہر کی طرف دیکھتا ہوا صرف یہی سوچنے لگا کہ اس گناہ عظیم میں میرا کتنا حصہ ہے؟ خواہ میری کاہلی کی وجہ سے ہو یا آنکھوں کی شرم مجبور کرتی ہو اور خواہ میری عقل ماری گئی تھی کہ میں نے اپنا منہ بند رکھ کر اتنا بڑا ظلم ہوتے دیکھا اور ایک لفظ نہ کہا...... اس کی پاداش سے کیا میری نجات ہو سکے گی؟ اگر ایسا ہی ہے تو سر اونچا کر کے میں سیدھا کیوں نہیں بیٹھ سکتا؟ اس کی آنکھوں کی طرف تاکنے کی جرأت کیوں نہیں کر سکتا؟

☆☆☆

چائے بسکٹ کھا کر اور ان کی ازدواجی زندگی کے لاکھوں واقعات سن کر جب میں مکان سے باہر ہوا تو دن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ گھر لوٹ جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ دن کے آخری حصہ میں سب لوگ اپنا اپنا کام ختم کر کے ڈیرے میں لوٹ آئے تھے اور دادا ٹھا کر کے ہوٹل میں اس وقت ہنسی مذاق اور دل لگی کا دور جاری تھا لیکن یہ سب شور و غل مجھے زہر کی طرح معلوم ہونے لگا...... اکیلا راستے راستے گھومتا ہوا یہ سوچنے لگا کہ اس معمہ کا حل کس طرح ہوتا؟ برمی لوگوں میں شادی کے متعلق کوئی مقررہ اصول نہیں ہے شادی کا باقاعدہ طریقہ بھی رائج ہے اور شوہر بیوی کی طرح جو مرد اور عورت تین دن تک باہم اکٹھے رہ کر ایک برتن میں کھانا کھا لیتے ہیں ان کی بھی شادی ہو گئی سمجھی جاتی ہے۔ نہ تو سوسائٹی ہی اسے منظور کرتی ہے اور نہ وہ عورت ہی اس کی وجہ سے ہلکی نظروں سے دیکھی جاتی ہے لیکن بابو، کے لیے ہندو قانون میں یہ بھی کچھ بھی نہیں تھا۔ اس عورت کو وہ اپنے وطن میں لے جا کر نہیں رکھ سکتا۔ ہندو سماج اس کی مخالفت کرے گا اور نیچ سے نیچ انسان بھی انہیں حقارت کی نظر سے دیکھے گا عمر بھر تک یہ کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر علاج ہی کیا؟ یہ تو زندگی بھر جلا وطن رہے یا بڑے بھیا نے چھوٹے بھائی کا جو انتظام کیا ہے یہی درست ہے اور ان سب حالات کی موجودگی میں بھی دھرم نام کے کسی لفظ کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے۔ تو اتنا بڑا ظلم کس طرح بجا کہا جا سکتا ہے۔ مجھ میں اتنی عقل نہیں کہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کروں البتہ حسب موقعہ پھر کبھی سوچ کر دیکھوں گا۔ لیکن اس ندامت کے مارے میں جل کر خاک ہونے لگا کہ یہ دھوکہ باز اور فریبی انسان آج اس بے کس عورت کی محبت پر آزار کا بوجھ لاد اور چکر دے کر بھاگ گیا۔

راستے کے کنارے کنارے جو چلنا شروع کیا تو چلتا ہی گیا۔ بہت پیشتر ایک دن ابھیا کا خط پڑھنے کے لیے جس چائے کی دکان میں گیا تھا اسی دکان کے مالک نے پہچان کر آواز دی...... ''بابو صاحب آئیے۔''

دفعتہً خواب سے چونکے ہوئے کسی انسان کی طرح دیکھا، یہ وہی دکان ہے اور وہ رونی بھیا کا گھر ہے بغیر کچھ کہے اس کی دعوت کو قبول کر کے میں اندر چلا گیا اور ایک پیالہ چائے پی کر باہر نکلا۔ رونی کے دروازے پر دھکا دے کر دیکھا کہ اندر سے بند ہے۔ باہر کی زنجیر کو پکڑ کر دو چار مرتبہ ہلاتے ہی دروازے کھل گیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ سامنے ابھیا، کھڑی ہے۔

''ارے تم؟''

ابھیا کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو اٹھا۔ کوئی جواب دیئے بغیر ہی چشم زدن میں وہ اپنے کمرے میں چلی گئی، اور دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن شرم کی جو شکل شام کی اس دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر ہویدا ہوتی دیکھی تو پھر دریافت کرنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا۔ بدحواس ہو کر کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد چپ چاپ لوٹ کر جا رہا تھا کہ معاً میرے دونوں کانوں میں رونے کی دو مختلف آوازیں ایک ساتھ گونج اٹھیں۔ ایک اس گنا ہگار کی اور دوسری اس بری حسینہ کی۔ میں نے جانا ہی چاہا تھا لیکن پھر لوٹ کر صحن میں کھڑا ہو گیا۔ دل ہی دل میں کہا...... نہیں مجھے اس طرح جانا نہیں چاہیے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ اچھا نہیں ہے۔...... یہ سب کئی دفعہ سننے کا عادی ہو چکا ہوں۔ کئی دفعہ دوسروں نے سنایا بھی ہے لیکن بس اب اور نہیں۔ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ کیوں اچھا ہے اور کہاں کس طرح برا ہے۔ یہ سب اگر ممکن ہوا تو اس کی زبانی سنوں گا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو محض کتاب کے الفاظ نظر پر جما کر فیصلہ کرنے کا حق نہ مجھے ہے نہ آپ کو اور نہ ہی شاید پرماتما کو بھی۔

☆☆☆

یکایک ابھیا دروازہ کھول کر سامنے آ کھڑی ہوئی بولی...... ''صدیوں کے اندھے اعتقادات کے دھکے سے پہلے پہل اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اس لیے بھاگ کھڑی ہوئی تھی شری کانت بابو! میری اس حرکت کو میری شرمندگی پر محمول نہ کرنا۔''

اس کی دیدہ دلیری کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا وہ بولی...... ''آپ کو اپنی قیام گاہ پر لوٹنے میں کچھ تاخیر ہو جائے گی کیونکہ رونی بابو آتے ہی ہوں گے۔ آج ہم دونوں ہی آپ کے ملزم ہیں۔ آپ کے خیال میں اگر ہم لوگ قصوروار ثابت ہوں تو جو سزا آپ تجویز کریں گے ہم اس کو منظور کر لیں گے۔''

رونی کو، بابو، کہہ کر خطاب کرتے ہوئے میں نے پہلی ہی مرتبہ سنا۔ میں نے پوچھا...... ''آپ واپس کب آئیں؟''

ابھیا بولی...... ''پرسوں! وہاں کیا ہوا یہ جاننے کے لیے آپ یقیناً بیتاب ہو رہے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ ننگا کر کے دکھایا۔ بیت کی ضربوں کے نشان چمڑے پر جا بجا ابھر رہے تھے

بولی...... ''اور بھی بہت نشانات ہیں جنہیں آپ کو دکھا نہیں سکتی۔''

جن مناظر کو دیکھ کر انسان جائز اور ناجائز کی تمیز کھو بیٹھتا ہے یہ بھی ان میں سے ایک تھا ابھیا نے میرے سخت اور خاموش چہرے کی طرف دیکھ کر دم بھر میں ہی سب کچھ سمجھ لیا اور قدرے ہنس کر کہا ''لیکن میرے واپس لوٹ آنے کا صرف یہی ایک باعث نہیں ہے شری کانت بابو۔ یہ تو میرے ستی دھرم کا ایک چھوٹا سا انعام ہے وہ میرے شوہر ہیں اور میں ان کی بیاہتا بیوی...... یہ اسی کا عوضانہ ہے۔''

لمحہ بھر خاموش رہ کر اس نے پھر کہنا شروع کیا...... ''میں بیوی تھی۔ ان کی رضامندی کے بغیر ہی اتنا دور جا کر ان کے سکون میں مخل ہوئی۔ عورتوں کی اتنی بری حماقت مرد برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ اسی جرم کی سزا ہے۔ کئی طرح سے فریب دے کر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے مجھ سے کیفیت طلب کی کیوں میں رونی کے ساتھ یہاں تک آئی؟ میں نے جواب دیا کہ پتی کا گھر کیسا ہوتا ہے یہ تو میں نے آج تک جانا نہیں۔ میرے باپ نہیں ہیں ماں بھی مر گئی۔ گھر پر کوئی ایسا نہیں تھا جو مجھے کھانے کو دیتا۔ متواتر کئی خطوط لکھے لیکن تم سے کوئی جواب نہ ملا۔'' انہوں نے ایک بیت اٹھا کر کہا...... ''آج اس کا جواب دیتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر ابھیا نے اپنے اس زخم خوردہ دائیں ہاتھ کو ایک مرتبہ سہلا لیا۔

اس نہایت ہی ظالم اور جابر انسان کے خلاف میرے دل میں از سرنو ہلچل مچ گئی لیکن جس اندھا دھند عقیدہ کے زیر اثر ابھیا مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر چھپ گئی تھی۔ وہی جذبہ مجھ میں بھی تو موجود تھا۔ میں بھی تو اس کی حدود سے باہر نہ تھا اس لیے میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ تم نے اچھا کیا، اور میری زبان یہ کہنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئی کہ تم نے برا کیا، کسی دوسرے کو کسی اہم مشکل اور مصیبت میں مبتلا دیکھ کر جب اپنی ذاتی عقل و تمیز اور قدیم عقائد کے درمیان آزادانہ رائے اور مستعار علم میں جنگ چھڑتی ہے تو دوسروں کو نصیحت کرنے سے بڑھ کر برا بھاری آزاد شاید ہی کوئی ہوتا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا...... ''تمہارا وہاں سے یوں چلا آنا غلطی ہے یہ تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن......''

ابھیا بولی...... ''اسی لیکن، کے متعلق ہی تو میں آپ کا فیصلہ چاہتی ہوں شری کانت بابو! وہ اپنی بری بیوی کیساتھ سکھ چین سے رہیں مجھے کوئی شکایت نہیں مگر میں آپ سے یہ بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ شوہر جب محض ڈنڈے کے زور سے بیوی کے تمام حقوق زبردستی چھین لیتا ہے اور اسے اندھیری رات میں دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا گھر سے باہر نکال دیتا ہے تو اس کے بعد شادی کے وید منتروں کے زور سے اس پر بیوی کے فرائض کی ذمہ داری قائم رہتی ہے یا نہیں؟''

لیکن میں تو چپ سادھے رہا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں جما کر کہا...... ''یہ تو بالکل

عام فہم بات ہے کہ جہاں حق نہ رہا وہاں فرض کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے بھی تو میرے ساتھ ان ہی وید منتروں کو دہرایا تھا لیکن اس کا اثر ایک فضول بکواس سے زیادہ نہ رہا کیونکہ ان کے مزاج اور ان کی ذاتی خواہشات پر کوئی پابندی عائد نہ ہوئی۔ منتروں کی وہ بے معنی آواز منہ سے نکلتے ہی باطشل میں مل گئی...... لیکن کیا تم قیود، تمام پابندیاں اور تمام تر ذمہ داریاں میں عورت ہوں اس لئے مجھ پر ہی رہ گئیں۔ شری کانت بابو، آپ تو لیکن کا لفظ کہہ کر رک گئے یعنی میرا وہاں سے چلا آنا غلطی نہیں ہوئی مگر اس لیکن...... کا مطلب محض یہی ہے کہ جس کے شوہر نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے اس کی بیوی کے لئے قالب نسوانی کی یہی معراج ہے کہ وہ اس کا کفارہ کرتی ہوئی زندگی بھر زندہ تو رہے لیکن مردوں سے بدتر؟ ایک دن مجھ سے شادی کے جو منتر بلوائے گئے تھے...... ان کا بلوایا جانا ہی کیا میری زندگی کی واحد حقیقت ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب نقش خیال۔ اتنا بڑا بھاری ظلم، اتنی بڑی ناانصافی اور اتنا وحشیانہ سلوک...... اور میرے حق میں کچھ...... کچھ بھی نہیں ہے۔ سماج، دنیا، سکھ اور چین کسی پر بھی میرا کوئی حق نہیں رہا۔ اگر کوئی بے رحم، دھوکہ باز اور فریبی بدچلن شوہر بلاوجہ اور بلاقصور اپنی بیوی کو نکال دے تو کیا اسی لیے اس کی تمام نسوانی زندگی کا فضول، لنگڑی اور ناکارہ بن جانا ضروری ہے؟ کیا اسی لیے بھگوان نے عورت کی تخلیق کی تھی۔ سب قوموں میں سب مذاہب میں اس قسم کی ناانصافی کی تلافی ہے۔ بدقسمتی سے میں ایک ہندو کے گھر میں پیدا ہوئی ہوں کیا اسی لیے میرے لئے تمام راہیں مسدود ہو گئی ہیں شری کانت بابو!''

میں نے کہا...... ''میرے جواب سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔ آنے سے پیشتر آپ نے میری رائے کا انتظار تو نہیں کیا تھا؟''

ابھیا بولی...... ''لیکن اس کے لیے تو وقت نہ تھا۔''

میں نے جواب دیا...... ''ممکن ہوگا، آپ مجھے دیکھ کر بھاگ گئیں تو میں بھی چلا جا رہا تھا لیکن پھر لوٹ آیا، کیوں؟ کیا آپ جانتی ہیں۔''

''نہیں''

''لوٹ کر آنے کی وجہ یہ تھی کہ آج میرا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ آپ سے بھی زیادہ بے رحمانہ ظلم میں نے ایک عورت پر ہوتے ہوئے آج صبح دیکھا ہے۔''

یہ کہہ کر ساحل سمندر کی اس برمی عورت کی تمام داستان میں نے تفصیل سے سنا دی اور پوچھا...... ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ عورت اب کیا کرے؟''

ابھیا لرز اٹھی اور بعد ازاں گردن ہلا کر بولی...... ''نہیں، میں بتا نہیں سکتی۔''

میں نے کہا...... ''آج آپ کو اور بھی دو عورتوں کی داستان سناتا ہوں۔ ایک تو میری ان دا

جیجی اور دوسری پیاری بائی کی...... آلام و مصائب کے لحاظ سے ان میں سے کسی کی جگہ بھی آپ سے نیچی نہیں۔''

ابھیا خاموش رہی۔ شروع سے آخر تک ان داجیجی کی تمام سرگزشت سنا کر میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ ابھیا پتھر کے بت کی طرح بیٹھی ہے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ کچھ دیر اسی عالم میں بیٹھی رہ کر اس نے زمیں سے سر لگا کر نمسکار کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر آنچل سے آنکھوں کو صاف کرتی ہوئے بولی...... ''اس کے بعد؟''

میں نے کہا اس کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ اب پیاری بائی کا واقعہ سنو جب اس کا نام راج لکشمی تھا اسی وقت سے وہ کسی کو چاہتی تھی وہ چاہنا کس قسم کا تھا۔ یہ آپ جانتی ہیں؟ روہنی بابو آپ کو جس طرح چاہتے ہیں بالکل اسی طرح معاف کرنا اپنی آنکھوں دیکھا ہے اس لیے یہ تشبیہ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ کے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی اس وقت وہ پہلی راج لکشمی نہ تھی پیاری بائی، بن چکی تھی لیکن یہ بات اسی دن ثابت ہو گئی کہ راج لکشمی مری نہیں بلکہ پیاری کے قالب میں ہی زندہ جاوید ہو گئی ہے۔

ابھیا بے چین ہو کر بولی...... ''اس کے بعد؟''

بعد کے واقعات یکے بعد دیگرے وضاحت کے ساتھ سنا کر کہا...... ''اس کے بعد ایک دن ایسا آیا جب پیاری نے اپنے عزیز از جان محبوب کو چپ چاپ دور ہٹا دیا۔

ابھیا نے پوچھا...... ''آپ جانتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا؟''

''جانتا ہوں لیکن بتا نہ سکوں گا۔''

ابھیا نے ایک آہ بھر کر کہا...... ''آپ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اکیلی ہی نہیں ہوں...... بلکہ ازل سے ہی عورتوں کو اس بدنصیبی کا شکار ہونا پڑا ہے اور اس کو برداشت کرتے رہنے میں ہی ان کی زندگی کی کامیابی ہے۔''

میں نے کہا...... ''میں یہ کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا آپ کو صرف اتنا ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ عورتیں مرد نہیں ہیں۔ دونوں کے افعال کو ایک ہی ترازو سے تولا نہیں جا سکتا اور اگر تولا بھی جائے تو کوئی خاص فائدہ نہیں۔'

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کیوں نہیں؟''

''نہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے علاوہ میرا دل آج اس قدر پریشان ہو رہا ہے کہ ان سب الجھنوں پر کسی قسم کی رائے زنی کرنا ممکن ہی نہیں۔ آپ کے سوال پر کسی اور دن غور کروں گا۔ تاہم آج

صرف اتنا ہی عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے اپنی حیات میں نسوانی اخلاق کا جو معیار دیکھا ہے ان سب نے آلام و مصائب سے گزر کر ہی میرے دل میں بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میری ان داجیجی اپنی مصیبت کا تمام بار خاموشی سے برداشت کرنے کے علاوہ کچھ نہ کرسکتیں۔ بالفرض محال یہ بار نا قابل برداشت بھی ہوتا تو کسی حالت میں بھی وہ اپنی راہ سے منحرف ہو کر آپ کی راہ پر قدم نہ بڑھائیں۔ ان کے متعلق اس قسم کر تصور سے شاید میرا سینہ پھٹ جائے گا۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر کہا...... ''اور وہ راج لکشمی، اس کے ایثار کی تکلیف کتنی عظیم ہے میں بچشم خود دیکھ آیا ہوں۔ اس کی روحانی کوفت سے میرا تمام دل معمور ہے۔''

ابھیا نے چونک کر کہا...... تو کیا آپ ہی ان کے......؟''

میں نے جواب دیا...... ''اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے مجھے اتنی دور پڑا رہنے نہ دیتی بلکہ اس خیال سے کہ کہیں میں کھو نہ جاؤں جی جان سے کھینچ کر اپنے قریب ہی رکھنا چاہتی۔''

ابھیا بولی...... ''اس کا مطلب یہ ہے کہ راج لکشمی جانتی ہے کہ اسے آپ کے کھوئے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا...... ''صرف خطرہ ہی نہیں، راج لکشمی اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کھویا جا ہی نہیں سکتا۔ میرا کھویا جانا ناممکنات سے ہے۔ حاصل ہونے اور کھوئے جانے کی حد سے بالاتر جو ایک تعلق ہے مجھے پورا پورا یقین ہے کہ اسے وہی تعلق حاصل ہو چکا ہے اور اسی لیے اس وقت اسے میری بھی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو خود میں نے بھی اس زندگی میں کچھ کم دکھ نہیں اٹھائے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جس شے کو دکھ کہا جاتا ہے وہ نا تو خلا ہی ہے اور نہ محرومی۔ جو دکھ بلا خوف ہوتا ہے انسان اس کو سکھ کی طرح سے ہی محسوس کرتا ہے۔''

ابھیا کافی دیر تک مستقل خاموش رہ کر آہستہ سے بولی۔ میں آپ کی بات بخوبی سمجھتی ہوں۔ شری کانت بابو! ان داجیجی اور راج لکشمی دونوں نے ہی اپنی حیات میں دکھ کو حقیقی شکل میں حاصل کیا ہے۔ لیکن میری تو حالت ہی مختلف ہے شوہر سے مجھے ملا ہے صرف بے عزتی کا داغ۔ محض بے عزتی اور بدنامی کا ٹیکہ لے کر ہی میں واپس لوٹ آئی ہوں۔ اسی سرمایہ حیات کو لے کر ہی کیا آپ زندہ رہنے کے لیے مجھے مجبور کررہے ہیں؟''

سوال نہایت ہی مشکل تھا۔ مجھے لا جواب دیکھ کر ابھیا پھر بولی...... ''ان کے ساتھ میری زندگی کی کہیں بھی مطابقت نہیں شری کانت بابو! دنیا میں تمام عورت مرد ایک سانچے میں ڈھلے نہیں ہوتے۔ ان کے عہدہ برآ ہونے کا راستہ بھی زندگی میں صرف ایک نہیں ہوتا۔ ان کی ترتیب، ان کا

مزاج اور ان کے دل کی رفتار صرف ایک ہی جانب چل کر انہیں کامیاب نہیں بنا سکتی۔ لہٰذا سوسائٹی میں ان کا مناسب انتظام ہونا ضروری ہے۔ میری زندگی پر ہی آپ ایک مرتبہ شروع سے آخر تک نظر ڈالیے۔ میرے ساتھ جن کی شادی ہوئی تھی ان کی قربت میں آئے بغیر بھی کوئی چارہ نہ تھا اور آنے پر بھی کوئی چارہ نہ ہوا۔ اس وقت ان کی بیوی، بال بچے ان کی محبت کوئی بھی شے میری اپنی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں بھی انہیں کے پاس ان کی ایک داشتہ ویشیا کی طرح پڑے رہنے سے کیا میری زندگی پھل پھولوں سے بھر کر کامیاب ہوسکتی ہے شری کانت بابو! اور اس ناکامی کا داغ لے کر تمام زندگی بھر بھٹکتے پھرنا ہی کیا میری حیات نسوانی کی سب سے بڑی ریاضت ہے۔ روہنی بابو کو تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ ان کی محبت تو آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ایسے انسان کی زندگی کو لنگڑا بنا کر میں ستی کا خطاب خریدنا نہیں چاہتی شری کانت بابو!''

ہاتھ اٹھا کر ابھیا نے آنکھوں کے کونے پونچھ ڈالے اور پھر بھرائے گلے سے کہا...... ''اور نہ ایک رات کی بیاہ کی رسم کو جو شوہر اور بیوی دونوں کے نزدیک ہی خواب کی طرح باطل ہو چکی ہے، زبردستی تمام عمر بھر حقیقت سمجھ کر کھڑے رکھنے کے لیے اتنی بڑی محبت کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار ہوں۔ جس بھگوان نے محبت کی یہ نعمت عطا کی ہے کیا وہ اس سے خوش ہوں گے؟ میرے متعلق آپ جو بھی مناسب سمجھیں رائے قائم کرلیں لیکن اگر زندہ رہی شری کانت بابو! تو میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں کہ ہماری معصوم محبت کی اولاد دنیا میں انسانیت کے لحاظ سے کسی طرح بھی کم نہ ہوگی اور میرے بطن سے پیدا ہونے والا اپنے آپ کو بدقسمت نہ سمجھے گا۔ اس کو دینے کے لیے شاید اس کے ماں باپ کے پاس کچھ نہ ہوگا لیکن اس کی ماں اس کو یہ اطمینان ضرور دلا جائے گی کہ اس کی تخلیق سچائی پر مبنی ہے اور سچائی سے بڑھ کر کوئی سہارا اس کے لیے نہیں ہے اور اس سے گرنا ان کے لیے مشکل ہوگا ورنہ وہ بالکل ہی حقیر ہو جاتے گی۔''

ابھیا خاموش ہوگئی لیکن لامحدود فضا میری آنکھوں کے سامنے کانپنے لگی۔ دم بھر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس عورت کی باتیں مجسم ہو کر ہم دونوں کو گھیرے کھڑی ہیں...... ہاں ایسا ہی معلوم ہوا سچائی جب کسی انسان کے دل سے نکل کر سچ مچ ہی نظر آتی ہے تو معلوم ہوتا کہ اس میں زندگی ہے گویا اس کا گوشت اور پوست کا جسم بھی ہے اور اس جسم کے اندر جان بھی۔ پھر نہیں، کہہ کر نا منظور کرنا آسان نہیں وہ چوٹ کر کہے گی...... ''خاموش رہو فضول بحث کرکے دنیا کی مکاریوں میں اور اضافہ نہ کرو۔''

دفعتہً ابھیا نے ایک سیدھا سوال کیا۔ بولی...... ''آپ خود بھی کیا ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھیں گے شری کانت بابو؟ اور اب کیا ہمارے گھر نہ آئیں گے؟''

جواب دینے کے لیے مجھے کچھ پس وپیش کرنا پڑا۔ بعد ازاں بولا...... بھگوان کے نزدیک تو شاید آپ بے گناہ ہوں وہ آپ کی بھلائی ہی کریں گے لیکن انسان تو انسان کا دل نہیں دیکھ سکتا اس کے لیے تو ہر ایک کے دل کا احساس کر کے اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اگر وہ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ اصول قائم کرنے لگے تو سوسائٹی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔''

ابھیا تڑپ کر بولی...... ''جس مذہب میں، جس سوسائٹی میں ہم لوگوں کو اٹھانے کی فراخ دلی موجود ہے کیا آپ ہمیں اس سوسائٹی میں پناہ لینے کے لیے مجبور کر رہے ہیں؟''

میں یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اس کا کیا جواب دوں؟

ابھیا بولی...... ''اپنے آدمی ہو کر بھی ایک آدمی کو آپ مصیبت کے موقعہ پر پناہ نہیں دے سکتے...... کیا اس پناہ کے لیے ہمیں غیروں کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہوگا؟ کیا اس سے آپ کی شان میں کوئی اضافہ ہوگا؟''

جواب میں ایک طویل آہ کے علاوہ میرے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

ابھیا خود بھی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی...... ''جانے دیجئے، آپ لوگوں نے جگہ نہ دی نہ سہی مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ دنیا میں آج بھی ایک بڑی قوم ہے جو کھلے بندوں آزادی سے جگہ دے سکتی ہے۔''

اس کی بات سے گھائل ہو کر بولا...... ''کیا ہر حالت میں پناہ دینا ہی اچھا کام ہے۔ کیا اس بات کا بطور اصول تسلیم کر لینا ضروری ہے؟''

ابھیا بولی ''اس کا ثبوت تو ہاتھوں ہاتھ مل رہا ہے شری کانت بابو! روئے زمیں پر کوئی بھی ظلم زیادہ دنوں تک پھل پھول نہیں سکتا۔ اس بات میں اگر ذرا سی بھی سچائی موجود ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اسی لئے وہ اس ظلم وستم کو پناہ دے کر آئے دن ترقی کر رہے ہیں اور ہم لوگ صرف انصاف اور دھرم کے دعویدار بن کر دن بدن نیچے گر رہے ہیں کمزور ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ تو یہاں تھوڑے ہی دنوں سے مقیم ہیں لیکن دیکھتی ہوں کہ یہ علاقہ مسلمانوں سے بھرا پڑا ہے سنتی ہوں کہ ایک بھی گاؤں ایسا نہیں جہاں کم از کم ایک گھر مسلمانوں کا ہو اور وہاں ایک آدھ مسجد تعمیر نہ ہوگئی ہو۔ ہم لوگ شاید اپنے جیتے جی نہ دیکھ سکیں لیکن وہ دن ضرور جلد آئے گا جب بنگال کی طرح برما میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ آج صبح ہی جہاز کے ساحل پر ایک ظلم دیکھ کر آپ کا دل خراب ہو گیا ہے آپ ہی فرمائیے ایسی حالت میں کس مسلمان بڑے بھائی کو دھرم اور سماج کے خوف سے ایسی سازش، ایسی کمینگی کا سہارا لے کر سکھ اور چین کی ایسی گرہستی کو خاک میں ملا کر بھاگ جانے کی ضرورت لاحق ہوئی؟ بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ سب کو

اپنے منہ میں کھینچ کر اسے دعا دیتا اور بڑے بھائی کے قابل عزت و توقیر حاصل کر کے گھر لوٹ جانا...... ان دونوں میں سے کون سا مذہب سچا ہے شری کانت بابو!''۔

میں نے عقیدت بھرے جذبہ سے دریافت کیا...... ''اچھا آپ تو گاؤں کی لڑکی ہیں آپ نے یہ سب باتیں کس طرح جانیں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اتنی زیادہ فراخ دلی مردوں میں موجود نہیں۔ آپ جس کی ماں ہوں گی وہ کبھی بدقسمت نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے تصور سے بھی بالاتر ہے۔''

ابھیا اداس چہرہ پر تبسم کا ایک ہلکا سا خط لا کر بولی...... ''تو پھر شری کانت بابو، مجھے سوسائٹی سے باہر نکال دینے سے ہی کیا ہندو قوم زیادہ افضل اور پاکیزہ ہو جائے گی۔ کیا ہندو سوسائٹی کو میرے اخراج سے کسی طرح کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اور پھر قدرے ہنس کر کہا...... ''لیکن میں کسی طرح سماج سے باہر نہ جاؤں گی۔ تمام بدنامی، تمام کلنک، تمام بدقسمتی اپنے سر پر لے کر ہمیشہ آپ لوگوں کو ہی ہو کر رہوں گی۔ اپنی ایک اولاد کو بھی اگر کسی دن انسان کی طرح انسان بنا کر پیش کر سکی تو میری یہ تمام مصیبتیں برحق ہو جائیں گی اس ایک امید کے سہارے زندہ رہوں گی۔ مجھے تجربہ کر کے یہ دیکھا ہوگا کہ سچ مچ کا انسان ہی حقیقت میں بڑا ہے یا اس کے جنم کا حساب ہی دنیا میں بڑا ہے۔''

منوہر چکرورتی نام کے ایک قابل انسان سے میری راہ ورسم ہو گئی تھی۔ دادا ٹھاکر کے ہوٹل میں ایک ہری سنکیرتن دل تھا۔ پن کمانے کی غرض سے وہ گاہے گاہے وہاں آتے تھے لیکن کہاں رہتے تھے کیا کرتے تھے؟ یہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ صرف اتنا ہی سنا تھا کہ ان کے پاس بہت سارو پیہ ہے اور ہر پہلو سے مکمل حسابی کتاب انسان ہیں۔

نا معلوم کیوں؟ مجھ سے بے حد خوش ہو کر وہ ایک دن تنہائی میں کہنے لگے...... ''دیکھو شری کانت بابو! تمہاری عمر چھوٹی ہے۔ زندگی میں اگر ترقی حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں ایک ایسا گر بتا سکتا ہوں جس کی قیمت لاکھ روپیہ ہے میں نے خود جن سے یہ گر سیکھا تھا انہوں نے دنیا میں خود ترقی کی تھی۔ سنو گے تو شاید انگشت بدنداں رہ جاؤ گے لیکن بات سچ ہے۔ وہ صرف پچاس روپیہ ماہوار پاتے تھے لیکن مرتے وقت گھر بار، باغ باغیچہ، تالاب، زمین، جائیداد وغیرہ کے علاوہ دو ہزار روپے نقد چھوڑ گئے کہئے یہ کیا کوئی آسان بات ہے؟ اپنے ماں باپ کی دعا سے میں خود بھی تو......''

مگر وہ اپنی بات کو یہیں دبا کر بولے...... ''سنتا ہوں، تنخواہ تو خوب بھاری بھرکم پاتے ہو، قسمت بھی یاوری ہے۔ برما میں سینکڑوں آنے والوں کی تقدیر اس طرح کھلتے نہیں سنی...... پھر اتنی فضول خرچی کیوں کرتے ہو؟ در پردہ تحقیقات کرنے سے سینہ پھٹ جاتا ہے۔ دیکھتے ہی ہو کہ میں لوگوں کی کسی

بات میں نہیں پڑتا لیکن میری طرح زیادہ نہیں صرف دو سال تک چل کر دیکھ لو میں دعوی سے کہتا ہوں کہ اپنے گھر لوٹ کر اگر تمہاری خواہش ہوگی تو شادی کر سکو گے؟''

اس خوش یقینی کے لیے اندر ہی اندر میں فریفتہ ہوا اٹھا ہوں اس راز کو نا معلوم انہوں نے کس طرح آشکار کر لیا لیکن یہ تو وہ خود ہی ظاہر کر چکے تھے کہ وہ کسی بھی معاملہ کی پوری پوری ماہیت جانے بغیر اس میں دخل دینے کے عادی نہیں۔ کچھ بھی ہو۔ ترقی کا جو اسم اعظم ان کے پاس تھا اسے حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ وہ بولے...... ''دیکھوں دان پن کرنے کی بات رہنے دو۔ چوٹی کا پسینہ ایڑھی تک بہا کر روزی کمانی پڑتی ہے کمر تک مٹی کھودنے پر پیسہ نصیب ہوتا ہے اپنے خون کو جلا کر پیدا کی ہوئی کوڑی غیر کو خیرات کرنے والا آج کی دنیا میں اور بھی کوئی پاگل ہے؟ اپنے بیوی بچوں اور خاندان والوں کے لیے پس انداز کیا جائے اور دوسروں کو کچھ بھی نہ دیا جائے۔ یہ میں نہیں کہتا لیکن اول خویشاں بعد درویشاں کی مثل سنی ہوگی جس کے اپنے گھر میں پیسے کی تنگی ہو اس کو کبھی شہ نہ دینا۔ زیادہ نہیں صرف دو چار دن کی آمد و رفت کے بعد ہی وہ اپنے دکھ کی رام کہانی سنا کر دو چار روپوؤں کا مطالبہ کر بیٹھے گا۔ یکے نقصان مایہ و دیگر شماتت ہمسایہ۔ جو روپے دیئے ہو تو الگ اور غیروں کے گھر کا جھگڑا اپنے گھر کھینچ لائے وہ علیحدہ روپوؤں کا لالچ تو کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ تقاضہ کرنا ہی پڑتا ہے اور پھر دوڑ دھوپ۔ جھگڑا بکھیڑا بھلا ہمیں اس کی ضرورت ہی کیا پڑی ہے؟''

میں نے گردن ہلا کر کہا...... ''جی ہاں آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔''

وہ کچھ جرأت پا کر بولے...... ''تم اچھے گھر کے لڑکے ہو، اس لیے بات کو فوراً ہی سمجھ گئے مگر ان نیچ قوم کے لوہا پیٹنے والے سالوں کو ذرا سمجھاؤ تو جانوں حرامزادے سات جنم میں بھی نہیں سمجھیں گے۔ سالوں کے پاس اپنا ایک پیسہ نہیں پھر بھی اوروں کے گھر سے قرض لا کر دوسروں کو دے آئیں گے یہ چھوٹے لوگ ایسے ہی احمق ہوتے ہیں۔

ہمیں کیا؟ اور اگر حقیقتاً تکلیف ہے تو دو تولے سونا لا کر رکھ جاؤں۔ دیتا ہوں دس روپے ابھی ادھار...... کیوں بھیا ہے نا ٹھیک؟''

میں نے کہا...... ''جی ہاں، ٹھیک تو ہے۔''

وہ بولے...... ''ایک دفعہ نہیں سو دفعہ ٹھیک ہے اور دیکھو جھگڑے بکھیڑے کی جگہ مت جانا۔ کسی کا خون ہو جائے تو بھی نہیں۔ ہمیں اس سے کیا غرض؟ اگر کسی کو بچاؤ گے تو دو چار چوٹیں اپنے جسم پر بھی آ پڑیں گی۔ اس کے علاوہ کسی ایک فریق کا گواہ بننا پڑے گا۔ پھر مفت میں عدالتوں کی خاک چھانو۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ جب لڑائی جھگڑا ختم ہو جائے اور تمہاری خواہش ہو تو وہاں تک گھوم پھر آؤ اور ممکن ہو تو

دو چار بھلی بری باتیں مشورہ کے طور پر دے آؤ۔ پانچ آدمیوں میں تمہارا نام ہو جائے گا۔ ہے نہ ٹھیک بات؟''

کچھ دیر چپ رہ کر پھر انہوں نے کہنا شروع کیا...... ''اور پھر ان لوگوں کی بیماری کے موقعہ پر ان کے گھر تو در کنار، ان کے محلّہ میں بھی قدم نہ رکھو۔ فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ بھائی میں مر رہا ہوں اس مصیبت میں دو روپے دے کر امداد کیجئے،...... لیکن بھائی صاحب انسان کی زندگی موت کا تو کوئی بھروسہ نہیں اس لیے ان کو روپیہ دینا پانی میں بہا دینے کے مترادف ہے بلکہ پانی میں پھینک دینا کہیں زیادہ اچھا ہے اور کچھ نہ ہو تو یہی کہہ بیٹھتے ہیں ذرا رات جگا کرنے آ بیٹھا بہت خوب، کون جائے ان کی بیماری رات جاگنے لیکن کہیں اس دور پردیش میں مجھے ہی کچھ ہو جائے۔ نہ کریں شتیلا ماتا! کان پکڑتا ہوں!'' یہ کہہ کر انہوں نے زبان کو دانتوں تلے دبا لیا اور اپنے کان اپنے ہی ہاتھوں اینٹھ کر نمسکار کر کے کہا...... ''ہم لوگ سب ہی تو ان کے قدموں پر پڑے ہیں۔ لیکن بتاؤ بھلا ایسی مصیبت میں میری خبر کون لے گا؟''

اس مرتبہ میں ان کے ہاں میں ہاں نہ ملا سکا...... مجھے خاموش دیکھ کر وہ دل ہی دل میں شاید کچھ تشویش میں پڑ کر بولے...... ''صاحب لوگوں کو دیکھئے...... وہ ایسی جگہ کبھی نہیں جائے کبھی نہیں۔ صرف ایک کارڈ لکھ دیتے ہیں بس ہوگئی بیماری پرسی۔ اسی لیے تو انہوں نے اپنی ترقی کی ہے...... اس کے بعد تندرست ہونے پر ویسے ہی میل ملاقات...... بالکل اسی طرح...... اسی لئے بھیا کسی کے جھگڑے جھنجھٹ میں کبھی نہ آنا چاہیئے۔''

دفتر کا وقت ہوتے دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس قابل انسان کے نیک مشورہ سے میری کوئی روحانی ترقی ہو سکتی تھی۔ اس بات کو باور نہیں کرتا بلکہ اس کی باتوں سے میرے دل میں کوئی خاص ہلچل بھی پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس قسم کے تجربہ کار انسان دیہات میں بکثرت ملتے ہیں لیکن خواہ وہ رسوائے زمانہ بھی ہوں مگر مشورے دینے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ ان کے اس مشورے پر اگر میں عمل کر لیتا تو کتنی بڑی غلطی ہوتی اس کا ثبوت بھی مجھے دو ہفتے گزرنے سے پہلے ان ہی کے ذریعہ مل گیا۔

تب میں ابھیا کے گھر کی طرف نہیں گیا تھا یہ بھی درست ہے کہ میں ان کی حالت کے ساتھ ان کی باتوں کا مقابلہ کر کے شروع سے آخر تک اس واقعہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ سکتا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کی آزادی اور ان کے افعال کی بے خوفی اور ان کی باہمی غیر معمولی اور حسین محبت سب مل کر میری توجہ ہمیشہ کشش کرتے تھے تاہم زندگی بھر کے عقائد کسی طرح بھی اس طرف قدم بڑھنے نہ دیتے تھے۔ دل میں بار بار یہی آتا تھا کہ میری ان داجیجی ایسا فعل کبھی نہ کرتیں۔ وہ کہیں بھی نوکری کر کے بدنامی تکلیف اور دکھ کے درمیان سے گزر کر اپنی باقی زندگی گزار دیتی لیکن روئے زمین کے تمام عیش

و آرام کے عوض بھی جن کے ساتھ ان کی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی ازدواجی زندگی بسر کرنے پر رضامند نہ ہوتی۔ میں جانتا ہوں انہوں نے بھگوان کے چرنوں میں اپنے آپ کو نہایت یکسوئی سے نثار کر دیا تھا۔ اپنی اس ریاضت سے انہوں نے پاکیزگی کا جو تصور اور فرض کا جو احساس حاصل کیا تھا وہ ابھیا کی عقل رسا کے نزدیک کیا محض بچوں کا ایک کھیل تھا؟

دفعتہً ابھیا کی ایک بات یاد آ گئی اس وقت بات کی یہ تک پہنچنے کا مجھے موقعہ ہی نہ ملا تھا اس نے کہا تھا...... ''شری کانت بابو! مصیبتوں کو برداشت کرنے میں بھی ایک تباہ کن لالچ ہے۔ انسان نے اپنی صدیوں کے سفر زندگی میں یہ دیکھا ہے کہ کوئی بھی خاص مقصد بغیر دکھ اٹھائے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بے شمار جنموں کا تجربہ اس وہم کو ہی حقیقت تسلیم کر چکا ہے کہ زندگی کے میزان میں ایک طرف دکھ کا جتنا زیادہ بوجھ لادا جاتے دوسری طرف اتنا ہی زیادہ سکھ کا بوجھ اوپر اٹھ آتا ہے اسی لیے تو انسان دنیا میں جب اپنی عام اور قدرتی خواہشات پر قابو پا کر اور یہ سمجھ کر بھوکا گھومتا پھرتا ہے کہ ''میں تپیا کرتا ہوں۔'' تو اس بات کے متعلق کہ اس کے کھانے کے لیے کسی دوسری جگہ چار گنا خوراک جمع ہو رہی ہے نہ تو اس کے دل میں ہی کچھ شک پیدا ہوتا ہے نہ کسی دوسری کے ہی اس لیے جب کوئی سنیاسی کڑکتی ہوئی سردی میں گلے تک پانی میں ڈوب کر اور سخت گرمی کی خطرناک دھوپ میں دھونی رمائے زمیں پر سر اور اوپر کی طرف پاؤں کیے رہتا ہے تو اس کی مشکل پسندی کی سختی کو دیکھ کر تماشائیوں کا ہجوم صرف اس تکلیف کو ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ مستقبل میں اس کو حاصل ہونے والے بھاری آرام اور ناممکن سہولیات کا حساب لگا کر ان کا حریص دل حسد سے بھر اٹھتا ہے اور پھر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ الثار ہنے والا یہ انسان ہی مبارک ہے۔ قالب انسانی کے شایاں شان صرف یہی کام ہے ہم لوگ تو کچھ بھی نہیں کر رہے...... اپنی زندگی رائیگاں گنوار ہے ہیں وغیرہ وغیرہ اس طرح وہ اپنے آپ پر ہزار نفرتیں کرتے ہوئے اداس دل سے گھر لوٹ جاتے ہیں شری کانت بابو! سکھ کے حصول کے لیے دکھ کو اختیار کرنا ہی چاہیے۔ یہ بجا ہے لیکن اس لیے یہ بذات خود حقیقت نہیں ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو بہت سا دکھ اٹھا لینے پر سکھ از خود آ کر کندھوں پر سوار ہو جائے گا۔ اس دنیا میں بھی اس کی کوئی حقیقت نہیں اور عقبیٰ میں بھی نہیں۔''

میں نے کہنا شروع کیا...... ''لیکن بیوہ کا ضبط نفس......''

ابھیا مجھے درمیان میں ہی روک کر بولی...... بیوہ کا چال چلن کہیئے...... اس کے ساتھ برہم (حق) کا کوئی تعلق نہیں۔ بیوہ کا چال چلن ہی برہم (برحق) کے حصول کا ذریعہ ہے میں اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ درحقیقت وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دوشیزہ، شادی شدہ یا بیوہ ہر ایک اپنے اپنے راستہ

سے برہم (حق) کو حاصل کر سکتی ہے۔ بیوہ کا چال چلن ہی اس کے لیے ریزرو نہیں رکھا گیا ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا...... ''بہت خوب ایسا ہی سہی...... اس کا چال چلن ہی سہی ضبط نفس نہ سہی نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

ابھیا نے بگڑ کر کہا...... ''نام ہی تو سب کچھ ہے شری کانت بابو! نام کو چھوڑ کر دنیا میں اور ہے ہی کیا؟ غلط ناموں کی وجہ سے انسان کی عقل کی رسائی اور قوت تمیز کا بہاؤ نہایت غلط راستوں میں بے ہو کر گزر سکتا ہے کیا آپ اس بات کو نہیں جانتے؟ نام کی اس غلط فہمی کے باعث تو ہر زمان و مکان بیوہ کے چال چلن کو سب سے افضل قرار دیتے آ رہے ہیں۔ فضول ایثار کی بیکار فضیلت ہے شری کانت بابو، بالکل ہی فضول بالکل ہی غلط۔ انسان کی دونوں دنیائیں برباد کر دینے کے لیے اس سے بڑھ کر اور جادو گری کوئی نہیں ہے۔''

اس وقت اور زیادہ بحث نہ کر سکا اور خاموش ہو گیا۔ درحقیقت اس کو بحث میں ہرا دینا ایک طرح سے ناممکن ہی تھا۔ پہلے پہل جب جہاز پر اس سے تعارف ہوا تو ڈاکٹر صاحب اس کو بظاہر دیکھ کر ہی ازراہ مذاق کہہ اٹھے تھے ''عورت تو خوب ''فارورڈ'' ہے لیکن اس وقت دونوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے فارورڈ، لفظ کا مطلب کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ خاتون اپنے دل کی گہرائیوں تک کو کس طرح ایک لاثانی نور سے باہر کھینچ کر دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ ...لوگوں کی مخالفت کی پرواہ ہی نہیں کرتی۔ اس وقت اس کے متعلق ہمارا یہ خیال تھا کہ ابھیا صرف اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ہی مباحثہ نہیں کرتی بلکہ اپنے مقصد کو بھی پوری پوری طاقت سے فتح یاب کرنے کے لیے باقاعدہ جنگ کرتی ہے۔ اس کے قول و فعل میں مکمل یکسانیت تھی اس لیے کئی مرتبہ اس کے سامنے لاجواب ہو جایا کرتا تھا لیکن اپنے ڈیرے پر واپس آ کر خیال آتا کہ ارے یہ تو اس کا معقول جواب ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں اس کے متعلق آج بھی میرا اضطراب کم نہیں ہوا۔ متعدد بار میں اپنے دل سے سوال کر چکا ہوں کہ ابھیا کے لیے اس کے علاوہ اور راستہ ہی کیا تھا ہر بار میرے دل میں اس کے متعلق مخالفت کا ایک جذبہ بھڑک اٹھتا۔ اپنے آپ کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کرتا کہ اس پر ناراض اور غصہ ہونے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے لیکن کوئی نامعلوم طاقت میری سب کوششوں پر پانی پھیر دیتی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ دل کی اس گومگو مشکل وگرنہ گومگو مشکل حالت میں ہی میرے دن کٹ رہے تھے۔ اس لیے نہ تو میں اس کے پاس ہی جا سکتا تھا اور نہ اسے اپنے دل سے دور ہی کر سکتا تھا۔

ایسے ہی دنوں میں دفعتہً پلیگ نے شہر میں داخل ہو کر اپنا گھونگھٹ کھول دیا اور اپنا کالا منہ باہر نکالا۔ ہائے رام! اس کو سمندر پار ہی روکے رکھنے کے لیے ہزاروں جنتر منتر اور ذمہ دار حکام کی ہر

ممکن احتیاط چشم زدن میں ہی خاک میں مل گئی۔ عوام میں ہراس پھیل گیا شہر کی نوے فیصدی آبادی تو ملازمت پیشہ تھی یا تجارت پیشہ۔ اس لیے ان کو فوراً ہی بھاگ نکلنے کی سہولت نہ تھی بالکل وہی حالت ہوئی جیسی کسی بند کمرے میں آتش بازی چھچھوندر چھوڑ دینے پر ہوتی ہے خوف کے مارے اس محلے کے لوگ بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑے، چھوٹی موٹی گٹھڑیاں کندھے پر لادے اس محلے کو بھاگتے تھے اور اس محلے کے لوگ ٹھیک اسی طرح اس محلے کو بھاگتے آتے تھے۔ زبان سے ''چوہے'' کا لفظ نکلا نہیں کہ پھر خیریت نہیں وہ مردہ ہے یا زندہ، یہ سننے سے پہلے لوگ بھاگنا شروع کر دیتے معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کی جان درخت کے پھل کی طرح پک کر ڈنٹھلوں میں جھول رہی ہے۔ پلیگ کی ہوا لگتے ہی رات بھر میں ان سے کون کون کب 'ٹپ سے' نیچے ٹپک پڑے گا اس کا کچھ یقین ہی نہ تھا۔

❁......❁

اس دن سنیچر تھا۔ ایک معمولی کام کے لیے میں صبح ہی باہر چلا گیا تھا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک گلی کے اندر سے بڑے راستہ پر جانے کے لیے جلدی جلدی قدم بڑھائے جا رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت ہی بوسیدہ مکان کے دومنزلے کے برآمدے میں منوہر چکروتی کھڑے ہو کر بلا رہے ہیں۔

میں نے ہاتھ ہلا کر کہا...... ''وقت نہیں ہے۔''

وہ منت سماجت کرنے لگے...... ''دومنٹ کے لیے ایک دفعہ اوپر تشریف لائیے شری کانت بابو! بڑی آفت میں ہوں۔''

آخر خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اوپر جانا پڑا...... میں یہی تو کئی مرتبہ سوچا کرتا ہوں کہ کیا انسان کی ہر حرکت پہلے سے ہی فیصلہ شدہ ہوتی ہے؟ ورنہ میرا کوئی ایسا کام نہ تھا اور نہ اس گلی کے اندر اس سے پہلے کبھی گزر رہی ہوا تھا تو آج صبح اس طرف کیوں چلا آیا؟

نزدیک جا کر کہا...... ''بہت دن سے تو آپ اس طرف آئے نہیں...... آپ کیا اسی مکان میں رہتے ہیں؟''

بولے...... ''نہیں صاحب! نہیں بارہ تیرہ دن ہوئے ایک مہینہ بھر سے ڈسنٹری (دست لگنے کی بیماری) بھگت رہا ہوں اور پھر اس پر یہ ظلم کہ ہمارے محلہ میں پلیگ ہو گئی۔ کیا کروں صاحب۔ اٹھ تک نہیں سکتا ہوں پھر بھی جس طرح ہو سکا جلدی جلدی بھاگ آیا۔

میں نے کہا...... ''بہت اچھا کیا۔''

وہ بولے...... ''بہت اچھا کیا یہ کس طرح کہوں صاحب! کمبائینڈ ہیڈ'' بہت سی زبردست ہے بولتا ہے نہیں رہوں گا چلا جاؤں گا، ذرا سالے کو اچھی طرح دھمکا تو دیجئے۔''

مجھے کچھ حیرت ہوئی لیکن اس سے پہلے اس کمبائینڈ کی تعریف کر دینا ضروری ہے کیونکہ جو لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی لوگ پیسے کے لیے دنیا میں ایسا کوئی بھی کام جو کر گزریں ان لوگوں کو سن کر یہ تعجب ہوگا کہ انگریزی کے اس لفظ کا مطلب ہے دوبے، چربے تیواری وغیرہ ہندوستانی برہم جو

یہاں کسی کے پاس پھٹکے ہی اچھل پڑتے ہیں لیکن وہاں جا کر رسوئی بناتے ہیں۔ جوٹھے برتن ملتے ہیں تمبا کو بھرتے ہیں اور بابو صاحب کے دفتر جاتے وقت ان کے بوٹ جھاڑ کر صاف کر دیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ بابو کسی بھی ذات کے کیوں نہ ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ دو چار روپے ماہوار زیادہ دینے پر ہی یہ تر دیدی، چیتر دیدی وغیرہ پاکیزہ لوگ براہمن اور شودر...... دونوں کا کام کمبائنڈ کے طور پر کرتے ہیں۔ کم عقل اڑیا اور بنگالی براہمن آج تک بھی یہ کام کرنے پر رضامند نہیں کیے جا سکے۔ کیے جا سکتے تو صرف یہ ہی اس کی وجہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ پیسہ ملتے ہی قدیم اور بوسیدہ اعتقادات کو ترک کر دینے میں ہندوستانی لوگوں، کو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ (مرغی وغیرہ پکانے کے لیے چار آٹھ آنے مہینہ اور زیادہ دینے پڑتے ہیں کیونکہ دام ملنے پر ہر شے پاک ہو جاتی ہے)

لیکن منوہر بابو کے اس کمبائنڈ ہینڈ کو میں کس لیے دھمکی دوں اور وہ میری دھمکی تو سنے گا ہی کیوں؟ یہ میں سمجھ نہ سکا اور یہ ہینڈ بھی منوہر بابو نے حال ہی میں رکھا تھا۔

اتنے دنوں تک وہ خود ہی اپنے کمبائنڈ ہیڈ تھے۔ صرف ڈاکٹری سینٹری، کی خاطر ہی کچھ دنوں کے لئے رکھ لیا تھا۔ منوہر بابو کہنے لگے۔ ''صاحب آپ کیا کوئی معمولی آدمی ہیں شہر بھر کے لوگ آپ کی بات پر مرتے جیتے ہیں شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں اس بات کو نہیں جانتا۔ زیادہ نہیں ایک سطر پہ اگر آپ لاٹ صاحب کو لکھ دیں تو اس کو چودہ سال کی جیل ہو جائے۔ یہ کیا میں نے نہیں سنا؟''

''لگا دیجئے بچوں کو اچھی طرح ڈانٹ!''

بات سن کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔ جن لاٹ صاحب کا نام تک میں نے نہیں سنا تھا ان کو زیادہ نہیں ایک ہی سطر لکھ دینے سے چودہ سال کے جیل کی امید، میری اس عجیب و غریب طاقت کی بات اتنے بڑے مدبر انسان کے منہ سے سن کر میں یہ سوچ ہی نہ سکا کہ کیا کہوں اور کیا کروں؟ تاہم ان کے بار بار کے اصرار اور زبردستی کے مارے جب کوئی اور راستہ ہی نہ رہا تو اس ''کمبائنڈ ہیڈ'' کو ڈانٹ بتانے رسوئی گھر میں گھسا...... دیکھا وہ اندھے کنوئیں کی طرح تاریک ہے۔

وہ اوٹ میں کھڑا ہوا اپنے مالک کی زبانی میری طاقت کا احوال سن چکا تھا اس لیے رونی صورت بنا کر بولا...... 'اس گھر میں دیوتا، ہیں۔ یہاں میں کسی طرح بھی نہیں رہ سکتا۔ طرح طرح کے سائے رات دن اس گھر میں گھوما کرتے ہیں۔ بابو اگر کسی اور مکان میں جا کر رہیں تو میں ان کی نوکری بخوبی کر سکتا ہوں۔ لیکن اس مکان میں تو......''

بھلا ایسے اندھیرے مکان میں 'سائے کا کیا قصور۔ لیکن سایہ ہی نہیں وہاں ایک بہت بری سڑاند بھی جب سے میں آیا تھا آ رہی تھی...... پوچھا...... ''یہ بدبو کیسی ہے رے؟''

'کمبائینڈ ہینڈ' بولا...... ''کوئی چوہا وغیرہ سڑ گیا ہو گا؟''

میں چونک اٹھا...... ''چوہا کیسا رے؟ اس گھر میں چوہے مرتے ہیں کیا؟''

اس نے ہاتھ کو الٹ کر لاعلمی کے ساتھ بتایا کہ روز صبح کم از کم پانچ چھ مرے ہوئے چوہے تو وہ اٹھا کر خود ہی باہر گلی میں پھینک دیا کرتا ہے۔

مٹی کے تیل کی ڈبیا جلا کر تلاش کی گئی مگر اس مردہ چوہے کا پتہ نہ چلا پھر بھی میرا جسم سن سن کرنے لگا اور جی کھول کر اس آدمی کو کسی طرح بھی یہ نیک رائے نہ دے سکا کہ بیمار مالک کو تنہا چھوڑ کر اسے بھاگ جانا مناسب نہیں۔

خوابگاہ میں لوٹ کر دیکھتا ہوں منوہر بابو کھاٹ پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے پاس بٹھا کر اس مکان کی خوبیوں کا تذکرہ سنانے لگے اتنے کم کرایہ میں شہر کے درمیان اتنا اچھا مکان اور کوئی نہیں۔ مالک مکان بھی نیک اور پڑوسی بھی بھائیوں کی طرح۔ نزدیک ہی کے مکان میں جو چار پانچ مدراسی کرسٹان میں چلاتے ہیں وہ جس قدر مہذب اور معزز ہیں اسی قدر حریص اور لالچی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ کچھ صحت ہوتے ہیں اس سالے براہمن کو نکال باہر کریں گے۔ پھر یکا یک بولے...... ''اچھا صاحب آپ خواب کے قائل ہیں؟''

میں نے کہا...... ''نہیں''

وہ بولے...... ''میں بھی نہیں ہوں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ کل رات میں نے خواب دیکھا کہ میں سیڑھی پر سے گر پڑا ہوں اور جاگ کر دیکھا تو وہیں پاؤں کا کولہا سوج آیا ہے۔ سچ جھوٹ کی آزمائش آپ میرا جسم ٹٹول کر لیں۔ تکلیف کی وجہ سے بخار تک ہو گیا ہے۔''

سنتے ہی میرا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کے بعد کولہا بھی دیکھا اور جسم پر ہاتھ رکھ کر بخار بھی۔

منٹ بھر تک پاگلوں کی طرح بیٹھے رہنے کے بعد بالآخر بولا...... ''ڈاکٹر کو اب تک آپ نے کیوں نہیں بلا بھیجا۔ اب جلد کسی کو بھیجئے۔''

وہ بولے ''صاحب! یہ ملک، یہاں ڈاکٹروں کی فیس بھی تو کم نہیں ہے۔ اسے بلوایا نہیں کہ چار چار پانچ روپے فضول ہی چلے جائیں گے۔ اس کے علاوہ دوائی کے دام الگ۔ تقریباً دو روپے کی ڈچ اس طرح اور لگ جائے گی۔''

میں نے کہا...... ''لگنے دیجئے بلانے بھیجئے۔''

''کون جائے گا صاحب! تواری سالا تو جانتا بھی نہیں ہے اور اگر یہ چلا بھی گیا تو کھانا کون پکائے گا؟''

"اچھا میں ہی جاتا ہوں"...... کہہ کر ڈاکٹر بلانے باہر چل دیا۔

ڈاکٹر نے آ کر معائنہ کیا اور پھر مجھے اوٹ میں لے جا کر کہا...... "یہ آپ کے کون ہوتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا...... "کوئی نہیں" اور کس طرح صبح یہاں آ پھنسا یہ بھی تفصیل سے بتا دیا۔

ڈاکٹر نے پوچھا...... "ان کا اور بھی کوئی نزدیکی یہاں ہے؟"

میں نے کہا...... "مجھے معلوم نہیں۔ شاید کوئی ہو۔"

لمحہ بھر خاموش رہ کر ڈاکٹر بولے...... "میں ایک دوائی لکھ کر دیئے جاتا ہوں سر پر برف رکھنے کی بھی ضرورت ہے لیکن سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو پلیگ ہسپتال میں پہنچا دیا جاتے۔ آپ خود بھی اس مکان میں نہ ٹھہریئے اور دیکھئے مجھے فیس دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر چلے گئے۔ بڑی جھجک کے ساتھ میں نے ہسپتال جانے کی تجویز پیش کی۔ سنتے ہی منوہر رونے لگے...... "وہاں تو مریضوں کو زہر دے کو مار ڈالتے ہیں اور وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔" اس طرح بہت کچھ بک گئے۔

دوائی لانے بھیجنے کے لیے تیواری کو کھوجتا ہوں تو دیکھا کہ کمبائینڈ، اپنے لوٹا کمبل لے کر اس دوران میں نامعلوم کہاں کھسک گیا۔ معلوم ہوتا ہے اس نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری بات چیت دروازے کی آڑ سے سن لی تھی۔ ہندوستانی خواہ اور کچھ نہ سمجھیں مگر پلیگ کے لفظ کو خوب سمجھتے ہیں۔

مجبوراً مجھے ہی دوائی لینے کے لیے جانا پڑا۔ برف، آئیس بیگ وغیرہ جو کچھ بھی ضروری تھا سب میں نے ہی خرید کر لا حاضر کر دیا۔ اس کے بعد رہ گیا میں اور وہ...... وہ اور میں ایک دفعہ میں ان کے سر پر آئیس بیگ رکھتا تھا اور ایک بار وہ میرے سر پر، رکھتے تھے۔ اسی طرح تقریباً دو بج گئے تو انہوں نے بے ہوش ہو کر کھاٹ پکڑ لی۔ گاہے گاہے ہوش میں آ کر بھی کچھ کہتے تھے۔ شام کے قریب دم بھر کے لیے ہوش میں آ کر میری طرف دیکھ کر بولے...... "شری کانت بابو! اب میں نہ بچوں گا۔"

میں چپ ہو رہا۔ اس کے بعد بوقت بسیار کمر سے انہوں نے چابی کھولی اور اسے میرے ہاتھ دے کر کہا...... "میرے ٹرنک میں تین سوگنیاں ہیں۔ میری بیوی کو بھیج دینا۔ پتہ میرے بکس میں لکھا رکھا ہے اور تلاش کرنے سے مل جائے گا۔"

مجھے اگر کوئی بھروسہ تھا تو صرف قریب کے 'سیس' کا۔ وہاں والوں کی آہٹ اور دھیما لہجہ میں سن سکتا تھا۔ شام کے بعد ایک دفعہ کچھ غیر معمولی طور پر اٹھا دھری اور شور و غل سنائی دیا۔ کچھ دیر بعد ہی معلوم ہوا کہ وہ لوگ دروازے میں تالا لٹک رہا ہے۔ میں نے سمجھا کہ وہ لوگ ہوا خوری کے لیے باہر چلے گئے ہوں گے کچھ دیر میں لوٹ آئیں گے لیکن پھر بھی نامعلوم کیوں میرا دل اور بھی خراب ہو گیا۔

ادھر وہ مریض انسان رفتہ رفتہ جو حرکات کرنے لگا ان کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تنہا بیٹھ کر ان سے لطف اندوز ہونا مشکل تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے مگر نہ تو قریب کے کمرہ کھلنے کی آہٹ ہی ہوئی اور نہ کوئی آواز سنائی پڑی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد باہر آ جاتا تھا۔ تالا اسی طرح لٹک رہا تھا۔ یکا یک نظر پڑی کہ لکڑی کی دیوار کے سوراخ سے ایک تیز روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ بے قرار ہو کر اسی سوراخ کی راہ دیکھا تو میرے جسم کا خون برف کی مانند منجمد ہو اٹھا۔ سامنے کی کھاٹ پر دو جوان آدمی پاس ہی پاس تکیئے پر سر رکھے سو رہے ہیں اور ان کے سرہانے بغل میں موم بتیوں کی ایک قطار جل جل کر تقریباً ختم ہو رہی ہے۔ مجھے تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ رومن کیتھولک لوگ مردے کے سرہانے روشنی جلا دیتے ہیں اس لیے ان مضبوط جسم جوانوں کی اس بے وقت نیند کی جو وجہ تھی وہ سب آن واحد میں ہی میری سمجھ میں آ گئی اور میں سمجھ گیا کہ اب ان کی نیند ہزار چلانے پر بھی نہ ٹوٹے گی۔

ادھر اس کمرے میں بھی ہمارے منوہر بابو تقریباً دو گھنٹے اور چھٹپٹانے کے بعد سو گئے...... چلو جان بچی۔

حیرت کی بات یہ کہ جنہوں نے اس دن مجھے اتنی نصیحت کی تھی کہ بغیر جان پہچان کے کسی بھی آدمی کی بیماری کی اطلاع پا کر اس محلے میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے۔ انہیں کے مردے اور گنیوں کے بکس کی رکھوالی کے لیے مجھے مقرر تو کر دیا لیکن بقایا رات میری جس طرح کٹی اسے ضبط تحریر میں لانا بھی ناممکن ہے اور کہنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ تاہم قارئین اس بات پر شک نہ کریں گے کہ وہ رات موٹے الفاظ میں 'بھلی' طرح نہیں کٹی۔

دوسرے دن ڈیتھ سرٹیفکیٹ، لینے پولیس بلانے، اتار دینے اگنیوں کا انتظام کرنے اور مردے کو رخصت کرنے میں تین بج گئے۔ خیر منوہر تو ٹھیلا گاڑی پر سوار ہو کر شاید سورگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ رہا میں سو میں اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ آیا۔ گذشتہ دن تو ایکادشی ہی تھی آج بھی شام ہو گئی۔ ڈیرے پر واپس لوٹتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ دائیں کان کی جڑ میں سوجن آ گئی ہے اور درد ہو رہا ہے۔ کیا معلوم کہ تمام رات ہاتھ سے چھیڑ چھاڑ کر میں نے خود ہی درد پیدا کر لیا ہے یا سچ مچ ہی گنیوں کا حساب دینے مجھے سورگ جانا پڑے گا۔ یکا یک کچھ بھی نہ سمجھ سکا لیکن یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بعد از اس جو ہونی الحال تو جب تک ہوش و حواس درست ہیں اپنا انتظام سب خود ہی کرنا ہوگا کیونکہ منوہر کی طرح آئیس بیگ لے کر اٹھانا اور رکھنا نہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی اچھا۔ فیصلہ کرتے مجھے دیر نہ لگی۔ کیونکہ پل بھر میں ہی دیکھ لیا کہ اتنی بڑی بری مرض کا بار اگر میں کسی روشن ضمیر مہاتما پر ڈالنے جاؤں گا تو یقیناً بڑا عظیم گناہ ہو گا۔ کسی نیک انسان کو پریشان کا نا فرض بھی نہیں ہے۔ مذہب بھی اجازت نہیں دیتا اس لیے اس کی ضرورت نہیں بلکہ اس رنگون شہر کے ایک کونے میں ابھیا نام کی جو ایک گنہگار اور پتت عورت رہتی ہے ایک

دن جس کو نفرت سے چھوڑ آیا ہوں اسی کے کندھے پر اپنی مرض کا گندہ بوجھ نفرت کے ساتھ ڈال دینا چاہیے۔ مرنا ہو تو وہیں مروں شاید اس سے کوئی ثواب مل جائے۔ یہی سوچ کر میں نے نوکر کو گاڑی لانے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆

اس دن جب موت کا پروانہ ہاتھ میں لے کر میں ابھیا کے دروازے پر جا کھڑا ہوا تو مجھے مرنے کی نسبت مرنے کی شام نے ہی زیادہ خوف دکھایا۔ ابھیا کا چہرہ فق سفید ہو گیا لیکن اس کے سفید ہونٹوں سے صرف یہی الفاظ پھوٹ کر باہر نکلے تمہاری ذمہ داری میں نہ اٹھاؤں گی تو اور کون اٹھائے گا؟ اس جگہ مجھ سے بڑھ کر تمہاری اور کسے غرض ہے؟"

آنکھوں میں پانی بھر آیا پھر بھی میں نے کہا...... "میں تو بس چل دیا۔ راہ تکلیف تو مجھے اٹھانی ہی ہو گی اس سے بچانے کی طاقت کسی میں بھی نہیں۔ مگر جاتے وقت تمہاتی اس نئی گھریلو زندگی میں اتنی بڑی مصیبت ڈالنے کو اب کسی طرح بھی دل نہیں چاہتا۔ ابھیا ابھی گاڑی کھڑی ہے ہوش وحواس بھی درست ہیں اب بھی بخوبی پلیگ ہسپتال میں جا سکتا ہوں تم ایک آن کے لیے جی کڑا کر کے کہہ دو، اچھا جاؤ،" ابھیا نے کوئی جواب دیئے بغیر ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے بچھونے میں لے جا کر سلا دیا۔ اب اس نے اپنے آنسو پونچھے اور میری فراخ پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا...... "اگر تم سے جاؤ، کہہ سکتی تو نئے سرے سے یہ گھر گرہستی قائم نہ کرتی۔ آج سے میری نئی گرہستی سچ گرہستی ہوئی۔"

بہت ممکن ہے کہ وہ پلیگ نہیں تھی اس لیے موت ذرا سا مذاق کر کے چلی گئی دس دن میں میں اٹھ کھڑا ہوا مگر ابھیا نے پھر مجھے ہوٹل کے ڈیرے میں لوٹنے نہ دیا۔

دفتر جاؤں یا اور کچھ دن رخصت لے کر آرام کروں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دن دفتر کا چپڑاسی ایک خط دے گیا۔ کھول کر دیکھا تو پیاری کا خط تھا۔ برما آنے کے بعد یہی اس کا پہلا خط ملا جواب نہ آنے پر بھی میں اسے کبھی کبھی خط لکھ دیا کرتا تھا۔ آتے وقت یہی وعدہ اس نے مجھ سے لے لیا تھا۔ خط کے آغاز میں ہی طعنہ دے کر اس نے مجھے لکھا تھا کہ میرے مرنے کی اطلاع تو تم کو ضرور ملے گی اور زندہ رہتے میری ایسی کوئی اطلاع نہیں ہو سکتی۔ جس کو سنے بغیر تمہارا کام نہ چلے لیکن میرے لیے تو یہ ممکن نہیں میری جان تو ہمیشہ پردیس میں ہی پڑی بھٹکتی رہتی ہے اور اس بات میں اتنی زیادہ صداقت موجود ہے کہ تم بھی اس پر یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے خط نہ ملنے پر بھی گاہے گاہے تم کو خط لکھ کر یہ بتانا ہی پڑتا ہے کہ تم وہاں اچھی طرح ہو۔

"میں اس ماہ کے اندر ہی بنکو کی شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ تم اپنی رائے لکھنا۔ تمہاری اس

بات کو میں نامنظور نہیں کرتی کہ بال بچوں کی پرورش کی طاقت ہونے سے پہلے شادی ہونا مناسب نہیں بنکو میں ابھی وہ قابلیت پیدا نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود بھی میں اس کے لیے تمہاری رائے کس لیے چاہتی ہوں اور اس کا اندازہ جب تک تم مجھے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لو گے سمجھ نہیں سکتے جیسے بھی ہو سکے یہاں آ جاؤ۔ تمہیں میرے سر کی قسم۔"

خط کے آخری حصہ میں ابھیا کی بات تھی۔ ابھیا نے جب واپس لوٹ کر کہا تھا کہ جس کو میں چاہتی ہوں محبت کرتی ہوں اس کی گرہستی بسانے کے لیے میں ایک حیوان کو چھوڑ کر چلی آئی ہوں اور اسی مضمون کے متعلق اس نے رسم و رواج پر جو زوردار بحث کی تھی اس سے میں اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ میں نے بہت سی باتیں پیاری کو لکھ ڈالی تھیں۔ آج ان باتوں کا جواب اس نے دیا تھا۔

"تمہاری زبان سے اگر وہ میرا نام سن چکی ہوں تو تمہیں تاکید ہے کہ ایک مرتبہ ان سے ملنا اور کہنا کہ راج لکشمی تمہیں لاکھوں پرنام کرتی ہے اور لکھا تھا کہ عمر میں وہ مجھ سے چھوٹی ہیں یا بڑی میں نہیں جانتی۔ جاننا ضروری بھی نہیں ہے وہ محض اپنی نورانیت کی وجہ سے ہی مجھ عام عورت کے لیے قابل احترام ہیں۔ آج مجھے اپنے گورودیو کے شری مکھ کی بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ میرے کاشی کے مکان میں دلکشا (بیت) کی مکمل تیاریاں ہو چکی تھیں۔ گورودیو اپنی جگہ پر بیٹھ کر خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ میں آڑ میں کھڑی بہت دیر تک ان کے مسرور چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ یکا یک خوف کے مارے میرے سینے میں ہل چل مچ گئی۔ ان کے پاؤں کے پاس اوندھے منہ گر کر میں نے روتے ہوئے کہا بابا میں منتر نہ لوں گی، وہ حیران ہو کر میرے سر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر بولے...... "کیوں بیٹی، کیوں نہ لے گی؟"

میں نے کہا...... "گنہگار ہوں۔"

انہوں نے درمیان میں ہی روک کر کہا...... "ایسا ہے تو پھر منتر لینے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے بیٹی۔"

روتے روتے میں نے کہا...... "شرم وحیا کے مارے میں نے اپنا حقیقی تعارف نہیں کرایا ہے اگر ایسا کرتی تو آپ اس مکان کی چھوکھٹ کے اندر آنا بھی پسند نہ کرتے۔"

گورودیو مسکرا کر بولے...... "نہیں تو بھی میں آتا اور دیکشا دیتا۔ پیاری کے مکان میں خواہ نہ آتا لیکن اپنی راج لکشمی بیٹی کے مکان میں کیوں نہ آؤں گا بیٹی؟"

میں چونک کر خاموش ہو گئی کچھ دیر چپ رہ کر بولی...... "لیکن میری ماں کے گورو نے تو کہا تھا کہ مجھے دیکشا دینے سے پتت ہونا پڑے گا...... کیا یہ بات سچ نہ تھی؟"

گورودیو ہنسے بولے......"سچ تھی اس لیے تو وہ نہ دے سکے بیٹی لیکن جس کو ڈر نہیں ہے وہ کیوں نہ دے گا؟"

میں نے کہا......ڈر کیوں نہیں ہے؟"

وہ پھر ہنس کر بولے......"ایک ہی مکان میں مرض کے جراثیم ایک انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں وہ ہی جراثیم دوسرے انسان کو چھو تک نہیں سکتے۔ بتا سکتی ہو کیوں؟

میں نے جواب دیا......"شاید چھوتے تو ہیں لیکن جو لوگ طاقتور ہیں وہ بچ جاتے ہیں اور جو کمزور ہوتے ہیں وہ مر جاتے ہیں۔"

گورودیو نے میرے سر پر پھر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا......"اس بات کو کسی دن بھی مت بھولنا بیٹی۔ جو جرم ایک انسان کو مٹی میں ملا دیتا ہے اسی جرم میں سے دوسرا آدمی صاف پار ہو جاتا ہے۔ اس لیے تمام قوانین سب کو ایک ہی زنجیر میں جکڑ نہیں سکتے۔"

جھجک کے ساتھ میں نے آہستہ سے پوچھا......"جو بے انصاف ہے جو غیر قانونی ہے وہ طاقتور اور کمزور دونوں کے لیے کیا یکساں نہیں ہے؟ اگر نہیں تو کیا یہ ظلم نہیں؟"

گورودیو بولے......"نہیں بیٹی بظاہر دیکھنے سے اس کا انجام یکساں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں کمزور اور طاقتور کی تمیز مٹ جاتی۔ جو زہر پانچ سال کے بچے کے لیے قاتل ہے وہی زہر اگر اکتیس سال کے مرد کو ہلاک نہ کر سکے تو الزام کسے دو گی بیٹی؟ اور اگر میری بات کو آج تم اچھی طرح نہ سمجھ سکو تو کم از کم اتنا ضرور یاد رکھنا کہ جن لوگوں کے اندر آگ جل رہی ہے اور جن میں محض راکھ ہی اکٹھی ہو کر پڑی ہوئی ہے ان کے افعال کا وزن ایک ہی بات سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کیا جائے تو غلطی ہو گی۔"

شری کانت بھیا! تمہارا خط پڑھ کر مجھے اپنے گورودیو کی وہی اندر کی آگ والی بات یاد آ گئی۔ ابھیا کو دیک سے دیکھا تو نہیں ہے پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر جو آگ جل رہی ہے اس کے علوں کا اندازہ تمہارے خط سے بخوبی ہو رہا ہے۔ ان کے افعال کا فیصلہ ذرا غور و خوض سے کرنا مجھ جیسی ام عورت کے ترازو پر ان کے گناہ و ثواب کا وزن کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔"

خط ابھیا کے ہاتھ میں دے کر کہا......"راج لکشمی نے تمہیں ہزاروں پرنام لکھے ہیں......یہ لو"

ابھیا جو کچھ لکھا تھا اسے دو تین مرتبہ پڑھ کر اور کسی طرح خط کو میرے بچھونے پر ڈال کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ دنیا کی نگاہوں میں اس کی نسائیت آج مورد الزام اور ذلیل ہو رہی ہے لیکن اس پر ہزاروں کوس دور ایک اجنبی عورت نے عزت اور احترام کے پھولوں کی بارش کی ہے۔ اس بے پایاں مسرت کو ایک مرد کی نگاہوں سے بچا کر وہ جھٹ پٹ آڑ میں لے گئی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ابھیا اچھی طرح منہ آنکھیں دھو کر لوٹ آئی اور بولی......"شری کانت بھیا۔"

میں نے روک کر کہا......"ارے یہ کیا! بھیا کب سے ہو گیا؟"

"آج سے ہی"

"نہیں نہیں بھیا، نہیں۔ تم سب لوگ مل کر سب طرف سے میرا راستہ بند نہ کر دینا۔"

ابھیا نے ہنس کر کہا......"معلوم ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں کوئی مطلب گانٹھ رہے ہو کیوں؟"

"کیوں، کیا میں انسان نہیں ہوں؟"

ابھیا بولی......"بے ڈھب انسان نظر آتے ہو۔ بے چارے روہنی بابو نے بیماری کے دوران میں آسرا دیا۔ اب تندرست ہو کر معلوم ہوتا ہے یہی انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن مجھ سے غلطی ہوئی اس وقت بیماری کا ایک تار دے دیتی تو آج انہیں دیکھ لیتی۔"

میں نے گردن ہلا کر کہا......تعجب نہیں کہ وہ آ جاتیں۔"

ابھیا دم بھر خاموش رہ کر بولی......"تم ایک آدھ مہینے کی رخصت لے کر ایک بار چلے جاؤ شری کانت بھیا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے تمہاری انہیں بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

نا معلوم کس طرح خود میں بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ میری اسے بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" دوسرے ہی دن میں نے دفتر میں اطلاع دے کر ایک مہینے کی مزید رخصت لے لی اور آئندہ جہاز سے سفر کرنے کا ارادہ کر کے ٹکٹ خریدنے کے لیے آدمی بھیج دیا۔

جاتے وقت ابھیا نے نمسکار کر کے کہا......"شری کانت بھیا! ایک وعدہ کرو"

"کیا وعدہ کروں بہن؟"

"انسان دنیا کی تمام باتوں کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں رکاوٹ پیش آئے تو ایک خط لکھ کر میرا مشورہ لے لینا، منظور ہے بولو؟"

میں منظور و قبول کر کے جہاز پر جانے کے لیے گاڑی پر جا بیٹھا۔ ابھیا نے گاڑی کے دروازے کے نزدیک کھڑے ہو کر ایک بار پھر پرنام کیا بولی......"روہنی بابو کے ذریعہ میں نے کل ہی وہاں تار دلوا دیا تھا لیکن دوران سفر میں اپنی صحت کا خیال رکھنا شری کانت بھیا، اس کے علاوہ میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتی۔"

اچھا، کہہ کر میں نے منہ اٹھا کر دیکھا کہ ابھیا کی آنکھوں کی دونوں پتلیاں پانی میں تیر رہی ہیں۔

کلکتے کے ساحل پر جہاز جا کر رکا دیکھا جیٹی پر بنکو کھڑا ہے وہ سیڑھی کے ذریعہ جھٹ پٹ اوپر چڑھ آیا اور زمین پر سر ٹیک کر پرنام کر کے بولا۔۔۔۔۔''ماں راستے پر گاڑی میں راہ دیکھ رہی ہیں آپ نیچے جایئے میں سامان وغیرہ لے کر پیچھے آتا ہوں۔''

باہر آتے ہی اور بھی ایک آدمی جھک کر پاؤں چھو کر کھڑا ہو گیا میں نے کہا۔۔۔۔۔''ارے رتن! کہو اچھے تو ہو؟''

رتن کچھ ہنس کر بولا۔۔۔۔۔''آپ کی دعا سے، آیئے، یہ کہہ کر اس نے راستہ دکھاتے ہوئے گاڑی کے قریب لا کر دروازہ کھول دیا۔ راج لکشمی نے کہا''آیئے۔۔۔۔۔اور رتن تم لوگ ایک اور گاڑی کر کے پیچھے سے آ جانا، دو بج رہے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے نہایا کھایا بھی نہیں۔ ہم لوگ ڈیرے پر چلتے ہیں۔ گاڑی بان سے گاڑی ہانکنے کو کہہ دے۔''

میں گاڑی پر بیٹھ گیا۔ رتن نے بھی اچھا، کہہ کر گاڑی کا دروازہ بند کر دیا اور گاڑی بان کو ہانکنے کے لیے اشارہ کر دیا۔ راج لکشمی نے جھک کر قدموں کی خاک لی اور کہا۔۔۔۔۔''جہاز میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں''

''طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی کیا؟''

''طبیعت خراب تو ضرور ہو گئی تھی لیکن بہت نہیں۔ تم بھی تو تندرست نظر نہیں آتیں۔ گھر سے کب آئیں؟''

پرسوں، ابھیا کے ذریعہ تمہارے آنے کی اطلاع پاتے ہی ہم لوگ گھر سے چل دیئے آنا تو تھا ہی اس لیے دو دن پہلے ہی چلے آئے۔ کچھ معلوم ہے یہاں تمہیں کتنا کام کرنا ہے؟''

راج لکشمی ہنس دی۔ اس ہنسی کو دیکھ کر آج خیال آیا کہ نا معلوم کتنے دنوں سے یہ ہنسی نہیں دیکھی تھی اور اس خیال کے ساتھ ساتھ ہی ایک تڑپا دینے والی آرزو کو بھی دل ہی دل میں دفن کر لیا اس کو

عالم الغیب بھگوان کے سوا کسی نے نہ جانا مگر ایک گہری آہ کو اس سے بھی چھپا نہ سکا۔ اس لیے حیران ہو کر دم بھر تک میری طرف تاکتے رہ کر پھر ہنس کر پوچھا۔۔۔۔۔''کیسی نظر آتی ہوں میں۔۔۔۔۔بیمار؟''

یکا یک اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ بیمار؟ ہاں کچھ بیمار سی ہی معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ خیال آیا گویا وہ کتنے ہی ممالک پیدل چل کر طویل مسافت طے کر کے اسی وقت لوٹ کر آئی ہے۔ ایسی مرجھائی سی ایسی تھکی سی۔ اپنا بوجھ اٹھانے کی بھی اس میں طاقت نہیں۔ اس وقت وہ ضرور بے فکر اور بے خوف ہو کر آنکھیں موند کر سونے کے لیے ذرا سی جگہ کی تلاش میں ہے مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔۔۔۔۔''کیوں بولتے کیوں نہیں؟''

میں نے کہا۔۔۔۔۔''مت کہلواؤ''

راج لکشمی بچوں کی مانند زور سے سر ہلا کر بولی۔۔۔۔۔''نہیں کہنا ہی پڑے گا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ میں دیکھنے میں بالکل ہی بدصورت ہو گئی ہوں کیا یہ سچ ہے؟''

میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔۔۔۔۔''ہاں سچ ہے''

راج لکشمی ہنس پڑی بولی۔۔۔۔۔''تم انسان کو اتنا حیران کر دیتے ہو کہ بس اچھا اس میں برا کیا ہے۔ اچھا ہی تو ہے۔ حسن کو لے کر اب میں کیا کروں گی؟ تمہارے ساتھ میرا خوبصورتی یا بدصورتی۔۔۔۔۔اچھی بری نظر آنے کا تو کوئی تعلق نہیں ہے پھر میں خواہ مخواہ اس بات کی تشویش میں کیوں مرتی پھروں؟''

میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔''یہ تو ٹھیک ہے کہ اس تشویش میں مرتے پھرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اول تو لوگ یہ بات تم سے کہتے ہی نہیں اس کے علاوہ اگر وہ کہیں بھی تو تم یقین کرنے والی نہیں دل ہی دل میں سمجھتی ہو کہ۔۔۔۔۔''

راج لکشمی غصے سے بولی اٹھی۔۔۔۔۔''تم کیا غیب کا علم جانتے ہو جو سب کے دل کا حال تمہیں معلوم ہے۔ میں کبھی یہ بات نہیں سوچتی تم خود ہی سچ سچ کہو۔ جب وہاں شکار کرنے گئے تھے تو تم نے جیسی دیکھا تھا اب بھی کیا میں ویسی ہی ہوں؟ تب سے تو کتنی ہی بدصورت ہو گئی ہوں۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔''نہیں بلکہ اس وقت سے تو اچھی نظر آ رہی ہو۔''

راج لکشمی نے فوراً ہی کھڑکی سے باہر منہ پھیر کر اپنا ہنستا ہوا چہرہ شاید میری فریفتہ نگاہوں کی طرف ہٹا لیا اور کوئی جواب نہ دے کر خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد ہنسی مذاق کے سب آثار اپنے چہرے سے دور کر کے اس نے اپنے چہرہ پھر اس طرف پھیر لیا اور پوچھا۔۔۔۔۔''تمہیں کیا بخار آ گیا تھا اس ملک کی آب و ہوا کیا موافق نہیں آئی؟''

میں نے کہا۔۔۔۔۔''نہ آئے تو چارہ ہی کیا ہے؟ جس طرح بھی ہو موافق کر لینی پڑتی ہے۔''

میں دل ہی دل میں یقینی طور سے جانتا تھا کہ راج لکشمی اس بات کا کیا جواب دے گی کیونکہ جس ملک کی آب و ہوا آج تک اپنی نہیں ہو سکی کسی مستقبل بعید میں بھی اس کو اپنے موافق بنا لینے کی امید کے بھروسے وہ میرے واپس لوٹ جانے پر رضا مند نہ ہو گی بلکہ زبردست مخالفت کر کے رخنہ انداز ہو گی......

یہی میرا خیال تھا لیکن ایسا نہ ہوا وہ دم بھر خاموش رہ کر ملائم لہجہ میں بولی...... ''یہ تو سچ ہے اس کے علاوہ اور بھی تو بہت سے بنگالی رہتے ہیں۔ انہیں جب موافق ہے تو تمہارے ہی لیے کیوں ناموافق ہو گی؟ کیا کہتے ہو؟''

میری صحت کے متعلق اس کی اس لاپرواہی سے مجھے صدمہ ہوا۔ اس لیے صرف ایک اشارے بھر سے 'ہاں' کہہ کر چپ ہو گیا۔۔ ایک بات میں بار بار سوچتا تھا کہ اپنی پلیگ کی کہانی کس طرح راج لکشمی کے گوش گزار کروں۔ دور دراز پردیس میں جس وقت میرے دن زندگی اور موت کے سنگم میں گزر رہے تھے اس وقت کی ہزاروں مصیبتوں کا تذکرہ سنتے سنتے اس میں کیسا طوفان آئے گا دونوں آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کر کے پانی کی ایک دھار بہہ نکلے گی۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس کو کتنے رنگوں سے بھر کر میں تصور کی آنکھوں سے آئے دن دیکھتا رہا ہوں۔ ان وقت اس تصور نے مجھے سب سے زیادہ شرمندہ کیا سوچا...... ''چھی چھی۔ خوش قسمتی ہے کہ کوئی کسی کے دل کی بات نہیں جانتا ورنہ...... جانے دو اس بات کو دل ہی دل میں کہا......اور خواہ جو بھی کروں اپنی اس مرنے جینے کی کہانی سے نہ کہوں گا۔

بہو بزار کے ڈیرے پر آ پہنچا۔ راج لکشمی نے ہاتھ سے دکھا کر کہا...... ''یہ زینہ ہے، تمہارا کمرہ تیسری منزل پر ہے۔ جا کر ذرا سو رہو میں جاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے رسوئی گھر کی طرف چل دی کمرے میں گھستے ہی دیکھا کہ کمرہ میرے لیے ہی آراستہ کیا گیا ہے۔ پیاری پٹنے کے مکان سے میری کتابیں اور میرا حقہ تک لانا نہیں بھولی ہے۔ غروب آفتاب کی ایک بیش قیمت تصویر مجھے بہت پسند تھی۔ وہاں اس نے اپنے کمرے سے اتروا کر میری خوابگاہ میں لٹکوا دیا تھا اس تصویر تک کو وہ کلکتے اپنے ساتھ لائی ہے اور عین اسی جگہ اس نے اسے دیوار پر لٹکا دیا ہے۔ میرے لکھنے پڑھنے کا ساز و سامان میرے کپڑے میری سرخ مخمل کی چپٹیاں ٹھیک اسی طرح محنت سے سجا کر رکھی ہوئی ہیں۔ وہاں ایک آرام کرسی میں ہمیشہ ہی استعمال میں لاتا تھا۔ اسے ساتھ لانا شاید ممکن نہیں ہوا اسی لیے اسی طرح کی ایک نئی کرسی کھڑکی کے نزدیک رکھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ جا کر میں اسی پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ معلوم ہوا گویا بھاٹے کی ندی میں جوار کے پانی کی آواز منبع کے نزدیک پھر سنائی دے رہی ہے۔

نہا کھا کر تھکاوٹ کی وجہ سے دن دوپہر کو ہی سو گیا۔ نیند ٹوٹتے ہی دیکھا مغرب کی طرف کھڑکی سے شام کی دھوپ میرے پاؤں کے قریب آ کر پڑ رہی ہے اور پیاری ایک ہاتھ کے بل میرے منہ پر جھکی ہوئی دوسرے ہاتھ سے آنچل کے کنارے سے سر، کندھوں اور چھاتی کا پسینہ پونچھ رہی ہے...... بولی...... ''پسینے سے تکیے اور بچھونے بھیگ گئے ہیں۔ پچھم کی طرف سے کھلا ہونے کی وجہ سے یہ کمرہ بڑا گرم ہے کل دوسری منزل پر اپنی بغل کے کمرے میں تمہارے لیے بستر کر دوں گی۔'' یہ کہہ کر میری چھاتی کے بالکل قریب بیٹھ کر پنکھا اٹھا کر ہوا کرنے لگی۔ رتن نے کمرے میں آ کر پوچھا......

''ماں، بابو کے لیے چائے لے آؤں۔''

''ہاں لے آ اور بنکو اگر کمرے میں ہو تو اسے ذرا بھیج دینا'' میں نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر سے چپٹیوں کی آواز سنائی پڑی۔ پیاری نے آواز دے کر کہا...... کون، بنکو؟ ذرا ادھر تو آ۔''

اس کے پاؤں کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس نے نہایت ہی جھجکتے جھجکتے کمرے میں قدم رکھا ہے۔ پیاری اسی طرح پنکھا جھلتے جھلتے بولی...... ''ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جا۔ کیا کیا لانا ہے۔ اس کی ایک فہرست بنا کر دربان کے ساتھ ذرا بازار جا بیٹا۔ گھر میں کچھ نہیں ہے۔''

میں نے دیکھا یہ ایک بالکل نیا واقعہ ہے۔ بیماری کی بات الگ لیکن اس کو چھوڑ کر اس نے پیشتر کسی دن میرے بچھونے کے اتنے قریب بیٹھ کر اس نے ہوا تک نہ کی تھی۔ لیکن یہ بھی نہ ہو تو میں ایک دن اسے ممکن تسلیم کر سکتا مگر یہ جو اسے ذرا سی بھی پریشانی نہیں ہوئی سب نوکر چاکروں کے...... حتیٰ کہ بنکو کی موجودگی میں بھی فخر کے ساتھ اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ اس کے اس بے مثل حسن نے مجھے فریفتہ کر ڈالا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب پٹنے کے مکان سے مجھے صرف اس لیے رخصت لینی پڑی تھی کہ مبادا بنکو ہی کچھ اور خیال نہ کرنے لگے۔ اس دن کے ساتھ آج کے سلوک کی کتنی تفاوت ہے۔

اشیا کی فہرست بنا کر بنکو چلا گیا۔ رتن بھی تمبا کو بھر کر نیچے چلا گیا۔ پیاری کچھ دیر میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی پھر یکایک بولی...... ''میں تم سے ایک بات دریافت کرتی ہوں...... اچھا رونی بابو اور ابھیا دونوں میں سے کس کی محبت زیادہ ہے بتا سکتے ہو؟''

میں نے ہنس کر کہا...... ''جو تم پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی ہے اسی ابھیا کو یقیناً زیادہ محبت ہے۔''

راج لکشمی بھی ہنس پڑی بولی...... ''یہ تم کو کس طرح معلوم ہوا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو چکی ہے۔''

میں نے خواب دیا...... ''خواہ معلوم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن کیا یہ سچ نہیں بتاؤ!''

راج لکشمی لمحہ بھر تک چپ رہی پھر بولی...... ''خواہ کچھ بھی ہو لیکن زیادہ محبت تو رونی بابو ہی کرتے ہیں دراصل وہ اتنی محبت کرتے تھے اسی لیے اتنی بڑی مصیبت انہوں نے اپنے سر پر اٹھالی ورنہ یہ ان کا کوئی ضروری فرض نہ تھا...... اس کے مقابلہ میں ابھیا کو زیادہ ایثار کرنا نہیں پڑا۔''

اس کے سوالات کو سن کر میں سچ مچ ہی حیران رہ گیا۔ میں نے جواب دیا...... ''بلکہ میں تو اس کے عین برعکس دیکھتا ہوں اور اس حساب سے جو ایثار زیادہ تکلیف دہ اور آرام سے پرے ہے وہ ابھیا کو ہی کرنا پڑا تم روز روشن کی طرح اس حقیقت کو کیوں بھول جاتی ہو کہ رونی بابو خواہ جو بھی کریں سماج کی نگاہ میں آخر وہ مرد ہیں۔''

راج لکشمی نے سر ہلا کر کہا...... ''میں کچھ بھی نہیں بھولتی۔ انہیں دھتکار کر آسانی بچ نکلنے کے لیے جس موقعہ کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو وہ حد درجہ ذلیل اور نامعقول انسانوں کے لیے ہے رونی بابو جیسے انسان کے لیے نہیں شوق پورا ہو گیا یا کچھ لطف باقی نہ رہا تو چھوڑ چھاڑ کر اور پھینک کر بھاگ سکتے ہیں اور گھر واپس جا کرانے گنے شریف انسانوں کی طرح اپنا سفر زندگی جاری رکھ سکتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا تم بھی ایسا کر سکتے ہو؟ پس جو نہیں کر سکتا اس کے بوجھ کے وزن کا اندازہ تو کرو۔ اس کے لیے اپنی بدنام زندگی گھر کے کسی تاریک گوشے میں بسر کر لینے کی بھی سہولت نہیں رہتی اسے تو دنیا میں جدوجہد کرنے کے لیے میدان میں اترنا ہو گا۔ حقارت اور بدنامی کا بوجھ تنہا ہی برداشت کرنا پڑے گا۔ اپنی واحد محبت کی حقدار محبوبہ کو 'اپنی آئندہ اولاد کی ماں کو سماج کے طعن تشنیع سے بچا کر رکھنا ہو گا۔ تم اسے کیا معمولی تکلیف سمجھتے ہو؟ اور سب سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ جو بلا روک ٹوک اس بوجھ کو اتار کر پھینک سکتا ہے اسے کسی تباہ کن لالچ کے زیر اثر اپنے آپ کو رات دن بچا کر چلنے کے لئے رہنا پڑتا ہے۔ دکھ کی میزان میں اس ایثار کے ساتھ ہموزن بنائے رکھنے کے لیے جس محبت کی ضرورت ہے اسے اگر مرد اپنے اندر سے ظاہر نہ کر سکے تو کسی بھی عورت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔''

اس بات کو اس پہلو سے اس طرح پہلے کبھی سوچ کر نہیں دیکھا تھا۔ رونی کی وہ سادہ مزاج اور خاموشی پسند طبیعت اور اس کے بعد ابھیا جب اپنے شوہر کے گھر چلی گئی تو اس کے چہرے پر حزن و ملال کو چپ چاپ برداشت کرنے کا جذبہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہی جوں کا توں میرے دل میں کھنچ گیا لیکن میں نے کہا...... ''خط میں تو تم نے صرف ابھیا کے لیے ہی خراج تحسین بھیجا تھا۔''

راج لکشمی بولی...... ''ان کا جو حق ہے وہ آج بھی انہیں دیتی ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ جو گناہ یا جرم بھی تھا اس کو انہوں نے اپنے اندرونی نور سے جلا کر ایک دم پاکیزہ اور صاف کر دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج وہ بالکل عام عورتوں کی طرح ہیچ اور حقیر ہو جاتیں۔''

''حقیر کیوں؟''

راج لکشمی نے کہا...... ''خوب، شوہر کے چھوڑ دینے کے گناہ کی بھی کوئی انتہا ہے اس گناہ کو جلا کر خاک کر ڈالنے کے لیے اگر آگ موجود نہ ہوتی تو آج وہ۔''

میں نے کہا...... ''آگ کی بات جانے دو...... لیکن اس کا شوہر کس طرح تباہ ہوا اس بات کو تو ایک دفعہ سوچ دیکھو۔''

راج لکشمی بولی...... ''مرد ہمیشہ ہی سے متلون مزاج رہے ہیں ہمیشہ سے ہی ظلم روا رکھتے آئے ہیں لیکن اس لیے تو عورتوں کے حق میں بھاگ کھڑے ہونے کی دلیل کام نہیں دے سکتی۔ عورتوں کو تو برداشت کرنا ہی ہوگا ورنہ دنیا نہیں چل سکتی۔''

بات سن کر میرے خیالات میں گڑبڑ مچ گئی۔ دل ہی دل میں کہا کہ یہ عورتوں کی غلامی کا وہی قدیم اعتقاد ہے۔ قدرے غصہ آمیز لہجہ میں پوچھا...... ''تو پھر ابھی تک تم آگ آگ، کیا بک رہی تھیں؟''

راج لکشمی نے ہنس کر کہا...... ''کیا بک رہی تھی سنو گے؟ آج ہی دو گھنٹے پیشتر پٹنہ کے پتہ پر لکھا ہوا آپ کا خط ملا تھا۔ آگ کیا ہے؟ جانتے ہو؟ اس دن پلیگ'' کہہ کر جب تم ان کی نئی نئی گرہستی کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے تو جس شے نے تمہیں بلا خوف و خطر بغیر کسی غور و خوض کے اندر بلا لیا اور اسی کو کہتی ہوں ان کی آگ اس وقت انہیں اپنے آرام کی فکر نہ تھی۔ جو نور انسان کو فرض سمجھا کر صراط مستقیم کی طرف دھکیلتا ہے پریشانی کے عالم میں پیچھے ہٹنے نہیں دیتا۔ اب تک میں اسی کو آگ آگ کہہ رہی تھی۔ آگ کا ایک نام سب کچھ ہضم کرنے والی بھی ہے۔ یہ کیا تم نہیں جانتے وہ سکھ اور دکھ دونوں کو کھینچ لیتی ہے۔ اسے کسی طرح کا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ جانتے ہو انہوں نے ایک اور بات کیا لکھی ہے...... وہ رونی بابو کو کامیاب بنانا چاہتی ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ محض اپنی زندگی کو کامیاب بنانے سے ہی دوسرے کی زندگی کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ اور ناکامی سے صرف اکیلی ایک ہی زندگی تباہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ اور بھی کئی زندگیوں کو تلخ بنایا جاتا ہے۔ بالکل سچ ہے؟'' اتنا کہہ کر وہ یکا یک ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد ہم دونوں ہی کافی دیر تک خاموش رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا اس لیے وہ میرے سر کے روکھے بالوں کو اپنی انگلیوں سے فضول ہی ادھر ادھر منتشر کرنے لگی۔ اس کا یہ برتاؤ بھی بالکل نیا تھا۔ دفعتہً بولی...... ''وہ خوب تعلیم یافتہ ہیں نا؟ ورنہ اتنی قابل نہ ہوتیں۔''

میں نے جواب دیا...... ''ہاں فی الحقیقت وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔''

راج لکشمی بولی...... ''لیکن ایک بات انہوں نے مجھ سے پوشیدہ رکھی ہے ماں بننے کے لالچ کو وہ اپنے خط میں بار بار دبا گئی ہیں۔''

میں نے کہا...... ''کیا انہیں یہ لالچ ہے؟ کہاں؟ میں نے تو نہیں سنا؟''

راج لکشمی بول اٹھی۔'' جاؤ...... یہ لالچ بھلا کس عورت کو نہیں ہے؟ لیکن اسی لیے اس کا ذکر مردوں سے کرتے پھرنا چاہئے؟ تم بھی خوب ہو؟''

میں نے کہا...... ''تو پھر تمہیں بھی ہے، کیوں؟''

'' جاؤ'' کہہ کر وہ یکبارگی شرم و حیا سے سرخ ہو گئی اور دوسرے ہی لمحہ اپنے سرخ چہرہ کو چھپانے کے لیے بستر پر جھک گئی۔ اسی وقت غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاؤں نے مغرب کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانکا اور آن واحد میں اس کے بادلوں کی مانند کالے سیاہ بادلوں پر منتشر ہو گئیں اور کانوں کے ہیرے دونوں لٹکنوں میں کئی رنگوں میں جھل مل جھل مل کرتے ہوئے کھیلنے لگے۔ لمحہ بھر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اور سیدھے بیٹھ کر اس نے کہا...... ''کیوں، کیا میرے لڑکے بچے نہیں ہیں جو مجھے اس بات کا لالچ ہوگا؟ لڑکیوں کی شادی تو میں کر چکی ہوں۔ لڑکے کو بیاہنے آئی ہوں۔ ایک دو دوہتے پوتے ہو جائیں گے ان کے ساتھ آرام چین سے رہوں گی مجھے کمی کسی بات کی ہے؟''

میں خاموش ہو رہا۔ اس بات پر مزید بحث کرنے کی خواہش نہ ہوئی۔ رات کو راج لکشمی نے کہا...... ''بنکو کی شادی میں تو اب بھی بارہ دن کی دیر ہے چلو ایک بار کاشی ہو آئیں۔ تمہیں اپنے گورو کو دکھالاؤں؟''

میں نے ہنس کر کہا...... ''میں کیا کوئی نمائشی شے ہوں؟''

راج لکشمی نے کہا...... ''یہ سوچنے کا بار جو لوگ دیکھتے ہیں ان پر ہے تم پر نہیں۔''

میں نے کہا...... ''یوں ہی سہی لیکن اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا اور تمہارے گورو دیو کو بھی کیا فائدہ ہوگا؟''

راج لکشمی نے سنجیدہ ہو کر کہا...... ''فائدہ تم لوگوں کا نہیں ہے، لیکن مجھے ہے نہ ہو تو محض میرے لئے ہی چلے چلو۔''

اس لیے میں رضامند ہو گیا۔

پھر بہت دیر تک کوئی اچھی ساعت نہ تھی اس لیے اس وقت گویا چاروں طرف سے شادیوں کا ایک طوفان اٹھ پڑا۔ ہر وقت بینڈ، کارنٹ اور بیگ پائپ کی بانسری انسان کو پاگل بنا رہی تھی۔ ہم لوگوں کے سٹیشن جاتے وقت بھی اس طرح کی کچھ پاگل سی جھڑی فضا میں لگ گئی۔ جوش کے کچھ کم ہونے پر راج

لکشمی نے اچانک پوچھا...... ''اچھا تمہاری رائے پر اگر سب لوگ چلنا شروع کر دیں تو پھر غریبوں کی شادی نہ ہو سکے اور گھر گرہستی بھی نہ بنے۔ پھر دنیا کا سلسلہ کس طرح چلے گا؟''

اس کی غیر معمولی سنجیدگی دیکھ کر میں ہنس پڑا بولا...... دنیا کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے تمہیں کسی قسم کی تشویش کرنے کی ذرا سی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہماری طرح چلنے والے انسانوں کی تعداد دنیا میں کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کم از کم اپنے اس ملک میں تو نہیں ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔''

راج لکشمی نے کہا...... ''ان کی تعداد جس قدر کم ہو اتنا ہی اچھا ہے محض بڑے آدمی ہی انسان ہیں؟ اور غریب بے چارے دنیا میں کہیں سے بہہ کر چلے آئے ہیں۔ بال بچوں کو لے کر گھر گرہستی چلانے کا ارمان تو سب کے دل میں ہوتا ہے۔''

میں نے کہا...... ''تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ان کے دل میں ارمان ہوتا ہے اسی لئے ان کہ شہ ملنی چاہئے۔''

راج لکشمی نے کہا...... ''کیوں نہیں مجھے یہ سمجھا دو۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا...... ''سبھی غریبوں کے متعلق میرا ایک سا نظریہ نہیں۔ میرا یہ نظریہ صرف غریب اور شریف آدمیوں کے متعلق ہے اور میرا یقین ہے کہ تم اس کی وجہ بھی جانتی ہو؟''

راج لکشمی پر اصرار لہجہ میں بول اٹھی...... ''تمہارا یہ نظریہ غلط ہے۔''

مجھ پر بھی ایک ضد سوار ہو گئی میں نے کہا...... ہزار غلط ہونے پر بھی کم از کم تمہاری زبان سے تو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ بنکو کے باپ نے صرف بہتر روپے کے لالچ میں تم دونوں بہنوں کی شادی کی تھی۔ وہ دن ابھی اتنا پرانا نہیں ہوا کہ تم بھول جاؤ۔ خیر سمجھو کہ اس کا پیشہ ہی یہ تھا لیکن اگر وہ تم کو اپنے گھر لے جاتا۔ تمہارے دو چار بال بچے ہوتے تو ایک بار سوچ دیکھو کہ تمہاری کیا حالت ہوتی؟''

راج لکشمی کی آنکھوں میں جھگڑے کا جذبہ گھنا ہوا تھا بولی...... '' بھگوان جنہیں اس دنیا میں بھیجتے ہیں ان کی غور و پرداخت بھی کرتے ہیں تم تو پرماتما کی ہستی سے منکر ہو اس لیے یقین نہیں کرتے۔''

میں نے بھی جواب دیا...... ''میں پرماتما کی ہستی سے منکر ہوں یا جو کچھ بھی ہوں لیکن کیا پرماتما کی ہستی کے قائل لوگو بھگوان کی ضرورت صرف اس لیے ہے؟...... ان سب بچوں کو آدمی بنانے کے لیے؟''

راج لکشمی غصے سے بولی...... ''بے شک ہی وہ نہ بنائیں لیکن میں تمہاری طرح ڈرپوک نہیں ہوں۔ میں در بدر بھیک مانگ کر بھی انہیں انسان بناتی۔ اور ایک نامور قاصہ بننے کی نسبت یہ میرے حق

میں بہت اچھا ہوتا۔"

میں نے پھر کوئی اعتراض نہ کیا۔ بحث بالکل ہی ذاتیات پر آ کر تلخی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس لیے میں کھڑکی کے باہر راستے کی طرف دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ ہماری گاڑی سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر چھوڑ کر دور نکل گئی۔

سنیچر کا دن تھا۔ دو بجے کے بعد بیشتر دفتروں کے کلرک چھٹی پا کر ڈھائی کی ٹرین پکڑنے کے لیے تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ عموماً ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کا سامان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں ایک دو بڑی مچھلیاں، کسی کے رومال میں بکرے کا گوشت کسی کے ہاتھ میں گاؤں میں نہ ملنے والی سبز ترکاریاں اور پھل، سات دنوں بعد گھر پہنچ کر بے تاب بال بچوں کے چہروں پر مسرت کی ذرا سی ہنسی دیکھنے کے لیے تقریباً تقریباً سب اپنی توفیق کے مطابق کم وبیش مٹھائی چادر کے چلو میں باندھ کر بھاگے جا رہے تھے۔ ہر ایک کے چہروں خوشی اور ٹرین پکڑنے کا اضطراب اسطرح ظاہر ہو رہا تھا کہ راج لکشمی نے میرا ہاتھ کھینچ کر نہایت بے تابانہ لہجہ میں پوچھا...... "ہاں جی، یہ سب لوگ اس طرح سٹیشن کی طرف کیوں بھاگ جا رہے ہیں؟ آج کیا؟"

میں نے گھرک کر کہا...... "آج سنیچر ہے اور یہ سب دفتروں کے کلرک ہیں۔ اتوار کی چھٹی میں گھر جا رہے ہیں۔"

راج لکشمی نے گردن ہلا کر کہا...... "ہاں، یہی معلوم ہوتا ہے اور دیکھو ہر ایک کھانے کی کوئی نہ کوئی شے لیے جا رہا ہے۔ دیہات میں تو یہ سب ملتا نہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے بال بچوں کے ہاتھ میں دینے کے لیے خریدے لیے جاتے ہیں، کیوں نا؟"

میں نے کہا...... "ہاں"

اس کا تخیل، تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس لئے اس نے اسی لحہ کہا...... "ان کے لڑکے لڑکیوں میں آج کتنی خوشی ہوگی۔ شور وغل مچائیں گے گلے میں لپٹ کر باپ کی گود میں چڑھنے کی کوشش کریں گے۔ ماں کو اطلاع دینے کے لیے رسوئی گھر دوڑے جائیں گے...... گھر گھر میں گویا آج ایک جشن ہوگا۔ کیوں نا؟ کہتے کہتے اس کا چہرہ روشن ہو اٹھا۔

میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا...... "عین ممکن ہے۔"

راج لکشمی نے گاڑی کی کھڑکی میں اور بھی کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہ کر یکا یک ایک طویل آہ بھری اور کہا...... "ہاں جی! ان کی تنخواہ کتنی ہوگی؟"

میں نے کہا...... "کلرکوں کی تنخواہ اور کتنی ہوتی ہے۔ یہی بیس پچیس تیس روپے۔

راج لکشمی نے کہا...... "لیکن ان کے گھر ماں ہوگی، بھائی ہوں گے، لڑکے بچے ہوں گے۔"

میں نے اس میں اتنا اور اضافہ کیا...... دو ایک بیوہ بہنیں ہوں گی بیاہ شادی کریا کرم، وضعداری اور شرافت ہوگی۔ کلکتے کی رہائش اور خوراک کا خرچ ہوگا۔ مسلسل بیماریوں کا خرچ ہوگا۔ بنگالی کلرک کی زندگی کا مکمل انحصار صرف ان ہی بیس روپوں پر ہوتا ہے۔"

راج لکشمی کی تو سانس ہی اٹکنے لگی وہ بے قرار ہو کر بول اٹھی...... "تم نہیں جانتے لیکن یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کے گھر زمین جائیداد بھی ہوگی۔"

اس کی شکل وصورت دیکھ کر اسے اور زیادہ مایوس کرتے ہوئے مجھے ایک کوفت سی ہوئی تاہم مجھے کہنا ہی پڑا۔ میں ان لوگوں کے گھر بار کا حال بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں اور میں بلا خوف وخطر کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے نوے فیصدی لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نوکری چلی جائے تو یا تو انہیں بھیک مانگنے پر مجبور ہونا پڑے گا یا پھر سب گھر والوں کے ساتھ فاقہ کرنا ہوگا۔ ان لوگوں کے لڑکے لڑکیوں کی کہانی سنو گی؟"

راج لکشمی اچانک دونوں ہاتھ اٹھا کر چلا اٹھی...... "نہیں نہیں، سنوں گی۔ میں سننا نہیں چاہتی۔"

یہ بات میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اس نے بمشکل تمام اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رکھا ہے۔ اس لیے میں نے اور زیادہ نہ کہہ کر پھر راستے کی طرف منہ موڑ لیا۔ بہت دیر تک اس کی کچھ آہٹ نہ ملی۔ اتنی دیر تک شاید اپنے آپ سے جرح کر کے اور آخر کار اپنی بے تابی سے مغلوب ہو کر اس نے میرے کوٹ کا کنارہ پکڑ کر کھینچا اور پلٹ کر دیکھتے ہی درد آمیز لہجہ میں کہا...... "اچھا تو کہو ان کے لڑکے لڑکیوں کی کہانی، لیکن تمہارے پاؤں پڑتی ہوں جھوٹ موٹ مبالغہ آمیزی سے کام نہ لینا۔ دو ہائی ہے تمہاری۔"

اس کی منت سماجت کا رویہ دیکھ کر مجھے ہنسی تو آئی لیکن میں ہنسا نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ سنجیدگی سے کہا...... "مبالغہ آمیزی سے کام لینا تو دور رہا میں تمہارے دریافت کرنے پر بھی اس قصے کو کبھی نہ دوہراتا اگر تم نے ابھی کچھ لمحے پیشتر اپنے متعلق بھیک مانگ کر بچوں کو انسان بنانے کا دعویٰ نہ کیا ہوتا۔ بھگوان جنہیں اس دنیا میں بھیجتے ہیں ان کا معقول انتظام بھی کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے اسے نامنظور کروں تو شاید پرماتما کی ہستی سے منکر کہہ کر پھر بھلا برا کہو گی لیکن اولاد کی ذمہ داری اور جوابدہی باپ پر کتنی ہے ان دونوں کے متعلق تم خود فیصلہ کرلو۔ میں جو کچھ جانتا ہوں صرف وہی کہوں گا کیوں ہے نا ٹھیک؟"

یہ دیکھ کر وہ چپ چاپ میری طرف عقیدت سے دیکھ رہی ہے میں نے کہنا شروع کیا۔۔۔

"بچے کی پیدائش پر کچھ دن تک زندہ رکھنے کا بار میری رائے میں اس کی ماں پر ضرور ہوتا ہے۔ بھگوان پر مجھے اٹل اعتقاد ہے ان کی رحمت کا بھی قائل ہوں لیکن اس کے باوجود بھی ماں کی بجائے اس بار کو خود اپنے اوپر لینے کا طریقہ ان کے پاس ہے یا نہیں۔۔۔۔۔"

راج لکشمی ناراض ہو کر ہنس پڑی اور بولی۔۔۔۔۔ "دیکھو چالاکی رہنے دو۔۔۔۔۔ یہ بات بھی میں جانتی ہوں۔"

"جانتی ہو؟ پھر تو جانے دو۔ ایک مشکل تو آسان ہو گئی۔ لیکن تیس روپے ماہوار کے گھر کی ماں کے دودھ کا چشمہ اتنی جلدی خشک کیوں ہو جاتا ہے۔ یہ جاننے کی خواہش ہو تو کسی تیس روپے ماہوار کے گھر کی زچہ کے کھانے کے وقت حاضر رہنا ضروری ہوگا مگر تم سے جب یہ ممکن نہیں تو اس معاملہ میں میری ہی بات تسلیم کر لو۔"

راج لکشمی اداس چہرے سے میری طرف تاکتی رہی۔

میں نے کہا۔۔۔۔۔ "دیہات میں گائے کے دودھ کی نہایت ہی قلت ہے۔ اس بات کو بھی تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا۔"

راج لکشمی نے فوراً ہی کہا۔۔۔۔۔ یہ تو میں خود بھی جانتی ہوں گھر میں گائے ہو تو خیر ورنہ آج کل سر پٹک کر مر جانے پر بھی کسی گاؤں میں ایک بوند دودھ ملنا مشکل ہے۔ مویشی نہیں ہیں دودھ کہاں سے آئے؟"

میں نے کہا۔۔۔۔۔ "بہتر، چلو اور بھی ایک بات کا حل ہو گیا۔ تو پھر بچوں کی قسمت میں رہ گیا خالص ہندوستانی کنوؤں اور تالابوں کا پانی اور بدیشی ڈبوں میں خالص بارے (جو) کا چورا۔ بدنصیبوں کی قسمت میں اکثر ان کی قدرتی غذا۔۔۔۔۔ کم و بیش ماں کا دودھ بھی مہیا ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی ان تمام گھروں میں بہت دن قائم رہنے کا دستور نہیں کیونکہ چار ایک مہینے کے اندر ہی اور ایک نیا اجنبی اپنی آمد کا نوٹس دے کر اپنے بھائی کے دودھ کا حق یک قلم بند کر دیتا ہے یہ شاید تم۔۔۔۔۔"

راج لکشمی حیا کے مارے سرخ ہو کر بول اٹھی۔۔۔۔۔ "ہاں ہاں، جانتی ہوں، جانتی ہوں، تشریح کر کے مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس کے بعد کی بات کہو۔"

میں نے کہا۔۔۔۔۔ "اس کے بعد سودیشی ملیریاں اور پیٹ کا درد بچے کا دھر دباتا ہے اس وقت باپ کا فرض ہوتا ہے ولایتی کونین اور بارے کا چورا مہیا کرنا اور ماں کے سر پر پڑتا ہے جیسا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں دوبارہ زچہ خانہ میں داخل ہونے کے درمیانی وقت کی فرصت میں ان دوائیوں کو خالص دیسی پانی میں گھول کر پلانے کا کام۔ اس کے بعد مناسب وقت پر زچہ خانہ کا جھگڑا ختم ہونے پر نوخیز بچے کو گود میں لے کر باہر آنا اور پہلے بچے کے لیے کچھ دن تک رونا۔"

راج لکشمی نیلی پڑ کر بولی۔۔۔۔۔ "رونا کیوں؟"

میں نے کہا' ارے یہ تو ماں کی فطرت ہے اور اس فطرت کا مظاہرہ ایک کلرک کے گھر میں بھی اس وقت ہوتا ہے جب بھگوان ماں اور باپ دونوں کو ان کی ذمہ داریوں سے نجات دلا کر پہلے بچے کو اپنے قدموں میں بلا لیتے ہیں۔"

"ہائے رے۔"

اتنی دیر تک باہر کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ دفعتہً نظر گھما کر دیکھا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کا پانی تیر رہا ہے۔ مجھے صدمہ ہوا۔ سوچا اس بے چاری کو فضول ہی دکھ دینے سے کیا حاصل؟ بیشتر امیروں کی مانند کائنات کے اس عظیم دکھ کی بات اگر اس کے لیے بھی نامعلوم ہی رہتی تو کیا نقصان تھا؟ "ہیبت ناک مفلسی اور غربت سے پامال بنگال کے نادار ملازمت پیشہ گھرانے محض اناج کی قلت سے ہی ملیریا ہیضہ وغیرہ کے بہانے آئے دن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات دیگر بہت سے امیر لوگوں کی طرح یہ بھی جانتی اس سے کون سا بڑا نقصان ہو جاتا۔

عین اسی وقت راج لکشمی آنکھیں پونچھتے ہوئے دردناک لہجہ میں بول اٹھی۔۔۔۔۔ "خواہ وہ کلرک ہوں لیکن وہ تم سے کئی درجہ اچھے ہیں تم تو پتھر ہو تمہیں خود کوئی تکلیف نہیں ہے اس لیے ان لوگوں کے دکھ درد کی کہانی اس طرح لطف لے لے کر بیان کر رہے ہو۔ میرا تو دل پھٹا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کہ وہ آنچل سے بار بار آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں نے کوئی مخالفت نہ کی کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا بلکہ نرمی کے ساتھ کہا۔۔۔۔۔ "ان لوگوں کی مسرت کا حصہ بھی تو میری قسمت میں نہیں ہے۔ گھر پہنچنے کے لیے ان کا اضطراب اور خوشی بھی تو میرے لیے ایک خواب کی طرح ہے۔"

راج لکشمی کا چہرہ ہنسی اور آنسو دونوں کے ساتھ بیک وقت تمتما اٹھا وہ بولی۔۔۔۔۔ "میں بھی تو یہی کہتی ہوں۔ آج پتا آ رہے ہیں۔ اس لیے تمام بال بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ انہیں تکلیف کس بات کی ہے۔ ان لوگوں کی تنخواہ شاید کم ہو کیونکہ خاص بابوگیری بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی کیا پچیس تیس ہی روپیہ، اتنا کم؟ کبھی نہیں کم از کم سو ڈیڑھ سو روپے تو ہوں گے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔۔۔۔۔ "ممکن ہے میں شاید ٹھیک نہیں جانتا۔"

جرأت پا کر راج لکشمی کا اانچ بڑھ گیا۔۔۔۔۔ نہایت ادنیٰ کلرک کے لیے بھی ڈیڑھ سو روپیہ اسے مناسب معلوم نہ ہوا بولی۔۔۔۔۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ صرف اسی ماہوار تنخواہ پر ہی ان کا تمام دار و مدار ہے؟ اوپر

سے بھی کتنا ہی کما لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "اوپر سے؟ پیالہ؟"

اب اس نے کچھ نہ کہا...... وہ منہ بھاری کر کے راستے کی طرف بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد باہر کی طرف دیکھتے ہوئے ہی کہا...... "تمہیں جتنا ہی دیکھتی ہوں میرا دل تمہاری طرف سے اتنا ہی دور ہٹتا جاتا ہے تم جانتے ہو کہ تمہیں چھوڑ کر میری اور کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اس لئے تم مجھے اس قدر چھیدتے ہو!"

اتنے دنوں بعد، آج شاید پہلے ہی پہل میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر گویا کچھ کہنا بھی چاہا۔ اتنے میں ہی گاڑی سٹیشن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ایک علیحدہ ڈبہ ریزرو کرالیا گیا تھا پھر بھی بنکو احتیاطاً کچھ سامان لے کر دوپہر سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ کوچ بکس پر رتن کو دیکھتے ہی وہ دوڑ آیا۔ میں ہاتھ چھوڑ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ جو بات منہ پر آ گئی تھی وہ چپ چاپ اندر جا کر چھپ گئی۔

ڈھائی بجے کی لوکل ٹرین چھوٹنے ہی کو تھی۔ ہماری ٹرین اس کے بعد جاتی تھی۔ اس وقت ایک اوھیڑ عمر کا نادار اور شریف انسان ایک ہاتھ میں قسم قسم کی سبز ترکاریوں کی پوٹلی اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈی پر بیٹھا ہوا ایک مٹی کا پرندہ لئے صرف پلیٹ فارم پر نظریں جما کر اور سب طرف سے لاپرواہ ہو کر دوڑتا ہوا راج لکشمی پر آ گرا۔ مٹی کا کھلونا نیچے گر کر چور چور ہو گیا۔ وہ ہائے ہائے کر کے شاید اسے اکٹھا کر رہا تھا کہ پانڈے جی نے للکار کر ایک چھلانک میں اس کی گردن دھر دبائی اور بنکو چھڑی اٹھا کر اندھے وغیرہ کہہ کر مارنے کو تیار ہو گیا۔ میں کچھ دور محو سا کھڑا تھا گھبرا کر وہاں آیا وہ بے چارہ خوف اور ندامت کے مارے بار بار کہنے لگا...... "دیکھ نہیں سکا ماں مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی......"

میں نے فوراً اس کو چھڑا دیا اور کہا...... "جو ہونا تھا ہو گیا، آپ جلدی جایئے آپ کی گاڑی چھوٹ رہی ہے۔"

اس بے چارے نے پھر بھی اپنے کھلونے کے ٹکڑے ٹکڑے اکٹھا کرنے کے لیے کچھ دیر پس و پیش کیا اور آخر کار دوڑ لگا دی مگر زیادہ دور جانا نہ پڑا گاڑی چل دی تو لوٹ کر پھر اس نے ایک دفعہ معافی مانگی۔ اور وہ ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرنے میں لگ گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے ذرا ہنس کر کہا...... "اس سے اب کیا ہوگا؟

اس نے کہا...... "کچھ نہیں صاحب! لڑکی بیمار ہے، گذشتہ سوموار گھر سے آتے وقت اس نے کہہ دیا میرے لیے، ایک کھلونا خرید لانا، خریدنے گیا تو بچو نے غرض سمجھ کر دام بتائے دو آنے، ایک پیسہ بھی کم نہیں۔ خیر وہی سہی۔ رام رام کر کے کسی طرح پورے آٹھ پیسے پھینک کر لے آیا لیکن دیکھیے شومئی

تقدیر کو ایسے موقعہ پر پھوٹ گیا۔ بیمار بچی کے ہاتھ میں بھی نہ دے سکا۔ بیٹا رو کر کہے گی، بابا لائے نہیں، کچھ بھی ہو ٹکڑے ہی لے جاؤں دکھا کر کہوں گا۔ بٹی اس مہینے کی تنخواہ ملنے پر پہلے تیرا کھلونا خریدوں گا پھر کوئی اور کام کروں گا۔"

اتنا کہہ کر تمام ٹکڑے اکٹھے کر کے اور چادر کے پلے میں باندھ کر کہنے لگا "آپ کی بیوی کو شاید بہت چوٹ لگ گئی ہے میں نے دیکھا نہیں...... نقصان کا نقصان ہوا اور گاڑی بھی نہ ملی۔ مل جاتی تو بیماری بچی کو آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ کر دیکھ لیتا۔"

کہتے کہتے وہ پلیٹ فارم کی طرف چل دیا۔ بنکو پانڈے جی کو لے کر کسی کام سے کہیں اور چلا گیا تھا میں نے یک بیک پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا۔ راج لکشمی کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی کی مانند آنسو بہہ رہے ہیں۔ بے قرار ہو کر قریب جا کر پوچھا...... "زیادہ چوٹ آ گئی ہے کیا؟ کہاں لگی ہے؟"

راج لکشمی نے آنچل سے آنکھیں پونچھ کر کہا...... "ہاں بہت چوٹ لگی ہے۔ لیکن لگی ہے ایک ایسی جگہ کہ تم جیسے پتھر نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں۔"

☆☆☆

شریمان بنکو کو مجبور ہو کر ہمارے لیے ایک علیحدہ ڈبہ کیوں مخصوص کرانا پڑا۔ اس سے جب اس بات کی پوچھ تاچھ کر رہا تھا تو راج لکشمی کان لگا کر سن رہی تھی۔ اس وقت اس کے ذرا علیحدہ ہوتے ہی راج لکشمی نے بالکل ہی گلے پڑ کر مجھے سنا دیا کہ اپنے لیے فضول خرچ کرنا وہ جتنا ہی ناپسند کرتی ہے اس کی تقدیر سے اتنا ہی عذاب نازل ہوتا ہے۔ وہ بولی "اگر لوگوں کی تسلی سیکنڈ کلاس پر فرسٹ کلاس میں جانے سے ہی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن میرے لیے تو عورتوں کا ڈبہ تھا۔ ریلوے کمپنی کو اتنے زیادہ روپے بیکار ہی کیوں دیئے جائیں؟"

بنکو کی کیفیت کے ساتھ اس کی ماں کی اس فضول خرچی کی مخالفت کا میں کوئی خاص تعلق نہ دیکھ سکا لیکن ایسی باتیں عورتوں سے کہنے میں فضول جھگڑا ہوتا ہے اس لیے میں چپ چاپ صرف سنتا رہا کچھ بولا نہیں۔

پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر وہی صاحب ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دریافت کیا...... "آپ کہاں جائیں گے؟"

وہ بولے...... "بردوان"

کچھ آگے جاتے ہی راج لکشمی نے مجھ سے آہستہ سے کہا...... "پھر تو اپنے ہی ڈبے میں چل

سکتے ہیں نا؟ کرایہ تو دینا نہ ہوگا۔ انہیں بلا کیوں نہیں لیتے ؟''

میں نے کہا...... ''ٹکٹ تو لازمی طور پر خرید لیا گیا ہے۔ کرائے کے پیسے نہیں بچیں گے۔''

راج لکشمی بولی...... ''بے شک خرید لیا ہو۔ بھیڑ کی تکلیف سے تو بچ جائیں گے۔'' میں نے کہا...... ''انہیں عادت ہے۔ یہ بھیڑ کی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے۔'' راج لکشمی نے ضد کر کے کہا...... ''نہیں نہیں تم ان سے کہو۔ ہم تینوں بات چیت کرتے ہوئے جائیں گے۔ اتنا سفر مزے سے کٹ جائے گا۔''

میں نے سمجھ لیا کہ اس وقت اسے اپنی غلطی محسوس ہو رہی ہے۔ بنکو اور اپنے نوکر چاکروں کی نظر میں میرے ساتھ اکیلی علیحدہ ڈبے میں سفر کرنے کی کسک کو وہ کسی طرح کچھ ہلکا کر لینا چاہتی ہے۔ تاہم میں نے اس کو اور بھی زیادہ آنکھوں میں انگلی ڈال کر دکھانے کے ارادہ سے لاپرواہی کے ساتھ کہا...... ''ضرورت کیا ہے ایک غیر ضروری آدمی کو ڈبے میں بلانے کی؟ تم میرے ساتھ جتنی چاہو اتنی زیادہ باتیں کر لینا۔ وقت خوب مزے سے کٹ جائے گا۔''

راج لکشمی نے مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز پھینک کر کہا ''یہ میں جانتی ہوں مجھے تنگ کرنے کا اتنا بڑا موقعہ کیا تم چھوڑ سکتے ہو؟''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو رہی لیکن ٹرین کے سٹیشن پر آتے ہی میں نے جا کر کہا...... ''آپ کیوں نہ ہمارے ہی ڈبہ میں بیٹھ جائیں۔ ہم دو کو چھوڑ کر اس میں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ بھیڑ کی تکلیف سے بچ جائیں گے۔''

کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہیں رضامند کرنے میں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ اصرار کرنے کی دیر تھی کہ وہ اپنی پوٹلی لے کر ہمارے ڈبے میں آ بیٹھے۔

ٹرین ابھی دو چار سٹیشن ہی پار ہوئی تھی کہ راج لکشمی نے ان کے ساتھ خوب اچھی طرح بات چیت کرنا شروع کر دیا اور کچھ اور سٹیشنوں کو پار کرتے کرتے تو ان کے گھر کی خبریں، محلے کی خبریں حتیٰ کہ قریب جوار کے گاؤں تک کی خبریں کرید کرید کو معلوم کر لیں۔

راج لکشمی کے گورو دیو اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کاشی میں رہتے تھے۔ ان کے لیے وہ کلکتہ سے بے شمار چیزیں لئے جا رہی تھی۔ بردوان کے نزدیک آتے ہی ٹرنک کھول کر اس نے اس میں سے چن کر ایک سبز رنگ کی ریشمی ساڑھی باہر نکالی اور کہا...... ''سرالا کو اس کے کھلونے کے بدلے میں یہ ساڑھی دے دینا۔''

وہ صاحب پہلے تو حیران ہو گئے پھر شرم آمیز لہجہ میں جلدی جلدی بولے۔ ''نہیں نہیں بیٹی۔

سرالا کو میں اب کی دفعہ کھلونا خرید دوں گا۔ آپ ساڑھی رہنے دیں اس کے علاوہ یہ تو بہت بیش قیمت کپڑا ہے بیٹی۔''

راج لکشمی نے کپڑے کو ان کے پاس رکھتے ہوئے کہا ''بیش قیمت کی بات نہیں اور قیمت کچھ بھی ہو اس کو اس کے ہاتھ میں دے کر کہیئے گا کہ تمہاری موسی نے اچھے ہونے پر پہننے کے لیے دیا ہے۔''

اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ آدھ گھنٹے کی بات چیت میں ہی ایک اجنبی انسان کی بیمار لڑکی کو ایک بیش قیمت شے کا تحفہ دینا انہوں نے شاید اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کہا دعا کیجئے کہ وہ اچھی ہو جائے لیکن غریب کے گھر اتنے قیمتی کپڑے کو وہ کیا کرے گی بیٹی؟ آپ اسے اٹھا کر رکھ لیجئے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے میری طرف بھی ایک دفعہ دیکھا۔ میں نے کہا...... ''جب اس کی موسی پہننے کے لیے دے رہی ہے تو آپ کو لے جانا ہی مناسب ہے۔'' پھر ہنس کر کہا...... ''سرالا کا نصیب اچھا ہے۔ ہم لوگوں کی بھی کوئی موسی وغیرہ ہوتی تو بڑی سہولت رہتی۔ اب کی بار صاحب آپ دیکھیں گے کہ آپ کی لڑکی جھٹ پٹ اچھی ہو جائے گی۔''

اس وقت اس انسان کے تمام چہرے پر احسان مندی کے آثار ہویدا تھے۔ اور مزید انکار کیے بغیر اس نے کپڑے کو لے لیا۔ اب دونوں میں پھر بات چیت ہونے لگی۔ خانہ داری کی باتیں۔ سوسائٹی کی باتیں، سکھ دکھ کی باتیں اور نامعلوم کیا کیا۔ میں صرف کھڑکی کے باہر تاکتا ہوا خاموش ہو کر بیٹھا رہا اور جو سوال اپنے آپ سے بہت بار پوچھ چکا تھا وہی اس چھوٹے سے واقعہ کے سلسلہ میں ایک بار پھر میرے دل میں اٹھ کھڑا ہوا کہ اس سفر کی منزل کہاں ہے؟

ایک دس بارہ روپے کی قیمت کا کپڑا دان کر دینا راج لکشمی کے لیے مشکل بات نہیں تھی اس کے نوکر چاکر شاید اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے لیکن میری تشویش دوسری ہی قسم کی تھی میں جانتا تھا کہ دان کے لحاظ سے یہ شے اس کے لیے کچھ نہیں لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس کے دل کا بہاؤ جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے آپ کو ختم کر دینے کے لیے نہایت تیز رفتار سے دوڑ جا رہا ہے اس کا خاتمہ کہاں ہوگا اور کس طرح؟

تمام عورتوں کے دل میں، عورت موجود رہتی ہے یا نہیں اس بات کو دعوی سے کہنا نہایت مشکل بات ہے مگر نسائیت کا معراج ماں میں ہے۔ اور یہ بات شاید خوب زور شور سے نشر کی جا سکتی ہے راج لکشمی کو میں نے پہچان لیا تھا۔ میں نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ اس کے اندر کی پیاری بائی، اپنے شباب کی پرفریب رنگینیوں اور دلآویز کیفیتوں کے ساتھ ہی لمحہ لمحہ مر رہی ہے۔ آج اس نام کا ذکر تک

بھی وہ گویا شرم وحیا کے مارے مٹی میں مل جاتی ہے۔ میرے لیے معمہ تو یہی تھا۔

دنیا کی تمام وکمال لذت سے لطف اندوز ہونے کی وہ تڑپ اب راج لکشمی میں نہ تھی۔ آج وہ مطمئن اور پرسکون ہے۔۔ اس کی خواہشات اسی کے درمیان اس طرح غوطہ زن ہوگئی ہیں کہ بظاہر دیکھنے پر یکایک یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔

اسی ایک شے نے اس معمولی واقعہ سے متاثر ہوکر مجھے ایک بار پھر یاد دلادیا کہ آج اس کے شباب کی بے پناہ گہرائیوں کی سطح سے جو مادری جذبہ یک بیک بیدار ہوا تھا بے حال ہی میں جاگے ہوئے کمبھ کرن کی مانند اس کی لاانتہا بھوک کے لیے خوراک کہاں سے ملے گی؟ اس کی اپنی اولاد ہونے پر جوبات آسان اور قدرتی ہوسکتی تھی اس کے عدم وجود میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوا تھا ہے۔

☆☆☆

اس دن پٹنے میں اس کے جس مادر جذبہ کو دیکھ کر میں شفیتہ اور فریفتہ ہوا تھا آج اسی شکل و صورت کا تصور کرکے درد واضطراب کے ساتھ میں یہی سوچنے لگا کہ اتنی بڑی آگ کو پھونک مار کر بجھایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے آج غیر کے لڑکے کو بیٹا تصور کرنے کی کھیل کود میں راج لکشمی کے دل کی پیاس کسی طرح بھی مٹ نہیں رہی ہے۔ آج محض اکیلا بنکو ہی اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ آج دنیا میں جتنے بھی لڑکے ہیں ان سب کا سکھ دکھ بھی اس کے دل پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

بردوان میں وہ صاحب اتر گئے۔ راج لکشمی خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے کھڑکی کی طرف سے نظر ہٹا کر پوچھا..... ''یہ رونا کس کے لئے ہوا؟ سرلا کے لئے یا اس کی ماں کے لئے؟''

راج لکشمی نے منہ اٹھا کر کہا..... ''معلوم ہوتا ہے تم اتنی دیر تک ہم لوگوں کی بات چیت سن رہے تھے۔''

میں نے کہا..... ''یوں ہی بلاارادہ خود کوئی بات نہ کرنے کے باوجود بھی بہت سی باتیں آدمی کے کانوں آگھستی ہیں۔ دنیا میں کم لوگوں کے لئے یہ سزا تجویز کررکھی ہے۔ اس سے بچنے کا کوئی چارہ نہیں لیکن آنکھوں کا پانی کس کے لئے بہا یہ تو آپ نے بتایا نہیں؟''

راج لکشمی نے کہا..... ''میری آنکھوں کا پانی کس کے لئے بہتا ہے یہ جاننے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے جواب دیا..... ''فائدہ کی امید نہیں رکھتا صرف نقصان سے بچ کر ہی چلا جائے تو کافی ہے۔ سرلا اور اس کی ماں کے لئے جتنی بھی خواہش ہو آنسو بہاؤ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کے باپ کے لئے آنسو بہانے کو میں پسند نہیں کرتا۔''

راج لکشمی صرف ایک ''ہوں'' کہہ کر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔

سوچا تھا کہ یہ دل لگی رائیگاں نہیں جائے گی۔ ان کے روندھے ہوئے جھرنوں کا منہ کھول دے گی لیکن یہ نہ ہوا یہ کہ اب تک وہ اس طرف دیکھ رہی تھی دل لگی سن کر اس طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

میں بہت دیر سے خاموش تھا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لئے میرے اندر ایک کشمکش جاری تھی اس لئے مزید خاموش نہ رہ سکا اور کہا..... ''بردوان سے کھانے پینے کو کچھ خرید لیا ہوتا۔''

راج لکشمی نے کوئی جواب نہ دیا وہ بدستور چپ رہی۔

میں نے کہا..... ''اور کے دکھ ہیں رو رو کر ندی بہادی اور گھر کے دکھ پر کان ہی نہیں دیتیں۔ ولایت سے واپس آئے ہوؤں کی یہ تعلیم کہاں سے سیکھی؟''

راج لکشمی نے اس مرتبہ آہستہ سے کہا..... ''دیکھتی ہوں کہ ولایت سے واپس لوٹے ہوؤں پر تمہاری خاص نظر التفات ہے؟''

''ہاں وہ لوگ احترام کے قابل جو ہیں؟''

''کیوں، انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''ابھی تک تو کچھ نہیں بگاڑا لیکن بعد میں کچھ بگاڑ نہ دیں اس خوف سے پہلے ہی ان کی پرستش کررہا ہوں۔''

راج لکشمی نے لمحہ بھر خاموش رہ کر کہا..... ''یہ تم لوگوں کی سراسر زیادتی ہے۔ تم لوگوں نے انہیں اپنے گروہ سے اپنی ذات سے سماج سے سب طرف سے علیحدہ کررکھا ہے۔ پھر بھی اگر وہ لوگ تمہارے لئے تھوڑا سا بھی کچھ کرتے ہیں تو اس کے لئے بھی تمہیں ان کا ممنون ہونا چاہئے۔''

میں نے کہا..... ''ہم لوگ بہت زیادہ ممنون ہوتے اگر وہ اس مخالفت کی بنا پر مکمل طور پر عیسائی یا مسلمان ہوجاتے۔ ان لوگوں میں جو اپنے آپ کو برہمو کہتے ہیں وہ برہمو سوسائٹی کو تباہ کرتے ہیں جو ہندو کہتے ہیں وہ ہندو سماج کو حیران کرتے ہیں اگر وہ پہلے یہ فیصلہ کرکے کہ وہ خود کون ہیں اوروں کے لئے رونے بیٹھتے تو اس سے خود ان کا بھلا ہوتا اور جن کے لئے روتے ہیں ان کی بھی شاید کچھ بھلائی ہوجاتی۔''

راج لکشمی بولی ..... ''لیکن مجھے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔''

میں نے جواب دیا..... ''معلوم نہیں ہوتا تو کوئی خاص نقصان نہیں لیکن جس کے لئے اس وقت رکا ہوا ہوں وہ دوسری بات ہے۔ اس کا تو کچھ جواب ہی نہیں ملا؟'' اس مرتبہ راج لکشمی نے ہنس کر کہا..... ''اجی اس کے لئے رکنا ہی پڑے گا۔ پہلے تمہاری بھوک تو پک جائے اس کے بعد غور کیا جائے گا۔''

میں نے کہا...... ''پھر غور کیا ہوگا جس کسی سٹیشن پر جو کچھ بھی ملے گا وہی نگلنے کو دے دوں گی۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔''

میرا جواب سن کر وہ کچھ دیر چپ چاپ دیکھتی رہی اور پھر کچھ ہنس کر بولی...... ''کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟ تمہیں یقین ہے؟''

میں نے کہا...... ''گویا اتنا سا بھی یقین تم پر نہیں ہے؟''

تو ٹھیک ہے'' کہہ کر وہ پھر اپنی کھڑکی کے باہر جھانکتی ہوئی چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اگلے سٹیشن پر راج لکشمی نے رتن کو بلا کر کھانے کے لئے جگہ کرا دی اور اس کو حقہ لانے کا حکم دے کر تھالی میں کھانے پینے کا تمام سامان سجا کر سامنے رکھ دیا دیکھا کہ اس سلسلہ میں کہیں ذرا سی بھی غلطی نہیں ہوئی ہے مجھے جو کچھ اچھا لگتا ہے وہ سب چن چن اکٹھا کر کے لایا گیا ہے۔

نیچ پر رتن نے بستر کر دیئے۔ اطمینان کے ساتھ کھانا ختم کر کے حقے کی نے منہ میں ڈال کر آرام سے آنکھیں موندنے کی تیاری کر رہا تھا کہ راج لکشمی بولی...... ''کھانے کی چیزیں اٹھا لے جا رتن اس میں سے جو اچھا لگے کھا لینا۔ ارے تیرے ڈبے میں اگر اور بھی کوئی کھائے تو دے دینا۔''

لیکن رتن کو نہایت شرمسار اور پریشان دیکھ کر میں نے کچھ تعجب کے ساتھ پوچھا ''تم نے تو کچھ نہیں کھایا؟''

راج لکشمی بولی...... ''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ جا نا رتن کھڑا کیوں ہے؟ گاڑی چل دے گی جو؟''

رتن شرم کے مارے گڑ گیا۔ ''مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی بابو، مسلمان قلی سے کھانا چھو گیا ہے۔ کتنا ہی کہتا ہوں سٹیشن سے کچھ خرید لانے دو لیکن کسی طرح مانتی ہی نہیں۔''

اتنا کہہ کر اس نے میرے منہ پر اپنی بے صبر نگاہ ڈالی گویا میری رضامندی کا خواہشمند ہو۔

لیکن میرے کچھ کہنے سے پیشتر ہی راج لکشمی نے اسے دھمکا کر کہا...... ''تو جائے گا نہیں کھڑا کھڑا بحث کرے گا۔''

رتن پھر کچھ نہ بولا اور کھانے کے برتن ہاتھ میں لے کر باہر چلا گیا۔ گاڑی چلتے ہی وہ میرے سرہانے آ بیٹھی اور سر کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں چلاتے ہوئے بولی...... ''اچھا دیکھو......''

درمیان میں ہی ٹوک کر بولا...... دیکھوں گا پھر کبھی لیکن۔''

اس نے بھی مجھے اسی آن ٹوک کر کہا...... ''تمہیں لیکن، سے شروع کر کے لیکچر دینے کی ضرورت نہیں میں سمجھ گئی ہوں۔ میں مسلمان سے نفرت نہیں کرتی اور یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کے چھو لینے

سے کھانا خراب ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہ دیتی۔''

''لیکن تم نے خود کیوں نہیں کھایا؟''

''عورتوں کو نہیں کھانا چاہئے۔''

''کیوں؟''

''کیوں اور کیا؟ عورتوں کو کھانے کی ممانعت ہے۔''

''لیکن مردوں کے لئے ممانعت نہیں ہے؟''

راج لکشمی نے میرا سر ہلا کر کہا...... ''نہیں، مردوں کے لئے یہ آئین قانون نہیں وہ جو چاہیں کھائیں جس طرح بھی آرام سے رہیں اور ہم لوگ اخلاق کی پابندیوں میں قید رہیں بس یہی بہت ہے۔ ہم تو سینکڑوں مصیبتیں برداشت کر سکتی ہیں لیکن تم لوگ بھی ایسا کر سکتے ہو؟ یہی دیکھو کہ سر شام ہی بھوک کی شدت سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا دیکھنے لگے تھے۔''

میں نے کہا...... ''ممکن ہے لیکن اگر ہم مصیبتیں برداشت نہیں کر سکتے تو یہ ہمارے لئے فخر کی بات نہیں۔''

راج لکشمی نے سر ہلا کر کہا...... ''نہیں ایسا نہیں۔ تم ہماری طرح غلام نسل سے نہیں ہو کہ مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے پھرو۔ شرم کی بات تو ہمارے لئے ہے اگر ہم تکلیف برداشت نہ کر سکیں۔''

میں نے کہا...... ''انصاف کا یہ سبق تمہیں کس نے سکھایا؟ کاشی کے گورو جی نے؟''

راج لکشمی میرے منہ کے نہایت نزدیک جھک کر چپ رہی پھر مسکرا کر بولی۔ مجھے جو بھی تعلیم ملی ہے وہ سب تمہارے ہی نزدیک...... تم سے بڑھ کر میرا اور کوئی گورو نہیں۔''

میں نے کہا...... ''تو پھر تم نے گورو سے بالکل الٹ بات سیکھ رکھی ہے۔ میں نے کسی دن تمہیں کہا کہ تم غلام نسل کی ہو۔ بلکہ میں تو یہی بات ہمیشہ سے مانتا ہوں کہ تم غلام نہیں ہو تم کسی طرح بھی ہم لوگوں کی نسبت جو پھر بھی حقیر نہیں ہو۔''

راج لکشمی کی آنکھیں چھلچھلا آئیں بولی...... ''یہ میں جانتی ہوں اور جانتی ہوں، اس لئے تو یہ بات تم سے سیکھی ہوں۔ تمہاری طرح ہی اگر تمام مرد یہ بات سوچ سکتے تو پھر روئے زمین کی تمام عورتوں کی زبان سے یہی سن پڑتی۔ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا یہ بحث بھی کبھی پیدا نہ ہوتی۔''

''یعنی اس حقیقت کو بلا روک ٹوک سب تسلیم کر لیتے؟''

راج لکشمی بولی...... ''ہاں''

تب میں نے ہنس کر کہا...... ''خوش قسمتی سے دنیا بھر کی عورتیں تمہارے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

یہی خیریت ہے لیکن اپنی نسل کو اتنا حقیر سمجھتے ہوئے تمہیں ندامت محسوس نہیں ہوتی۔‘‘

میرے اس طنز پر راج لکشمی نے کچھ خیال کیا یا نہیں اس میں شک ہے۔ وہ بہت ہی اطمینان سے بولی……’’اس میں ندامت محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

میں نے کہا……’’ہاں یہ ٹھیک ہے ہم لوگ مالک ہیں اور تم نوکرانیاں، یہ اعتقاد اس ملک کی عورتوں کے دل میں یوں گھر کر چکا ہے کہ اس کا ہلکا پن بھی تمہاری نظر میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی گناہ کے بوجھ سے دنیا کے تمام ممالک کی عورتوں کی نسبت تم آج سچ مچ ہی چھوٹی ہو گئی ہو۔‘‘

راج لکشمی یکایک سخت ہو کر بیٹھ گئی اور دونوں آنکھوں کو روشن کر کے بولی’’تمہیں اس لئے نہیں۔ تمہارے ملک کی عورتیں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے چھوٹی نہیں ہو گئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تم ہی لوگوں نے انہیں چھوٹا سمجھ کر چھوٹا بنا دیا ہے۔ اور تم خود بھی چھوٹے ہو گئے ہو۔‘‘

یہ بات اچانک مجھے کچھ نئی معلوم ہوئی اس میں جو ایک گہرا راز مضمر تھا وہ رفتہ رفتہ صاف ہونے لگا۔ فی الحقیقت اس میں بہت بڑی حقیقت پنہاں ہے جو آج تک میری نگاہوں سے اوجھل تھی۔

راج لکشمی بولی……’’تم نے تو اس شریف انسان کے متعلق بھی مذاق کیا تھا لیکن اس کی بات سن کر میری آنکھیں کتنی کھل گئی ہیں یہ تم نہیں جانتے۔‘‘

’’نہیں جانتا‘‘ یہ تسلیم کرتے ہی وہ کہنے لگی……’’نہیں جانتے اس کی وجہ ہے کسی بھی شے کو جاننے کے لئے جب تک انسان کے دل کے اندر سے ایک قسم کی بے تابی نہیں اٹھتی اس کی نگاہ دھندلی ہو رہتی ہے۔ ایک مدت سے تمہاری زبان سن کر سوچا کرتی تھی کہ سچ مچ ہی اگر ہمارے ملک کے لوگوں کی مصیبتوں کی انتہا نہیں۔ سچ مچ ہی اگر ہمارا سماج اتنا اندھا ہے تو اس میں انسان زندہ ہی کس طرح ہے اور اسے تسلیم کر کے چلتا ہی کیوں ہے؟‘‘

میں چپ چاپ سن رہا ہوں یہ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی……’’اور تم بھی کیوں سمجھو گے؟ کبھی ان لوگوں کے درمیان نہیں رہے کبھی ان لوگوں کے سکھ دکھ سے دو چار ہونے کا موقعہ نہیں ملا اس لئے باہر ہی باہر کی سوسائٹی کیساتھ ان کا مقابلہ کر کے سمجھتے ہو کہ ان لوگوں کی مصیبتوں کی شاید کوئی انتہا نہیں۔ دولت مند زمیندار پلاؤ کھایا کرتا ہے وہ اپنی کسی غریب آسامی کو بھات کھاتے دیکھ کر سوچتا ہے کہ اس کی مصیبت کی انتہا نہیں جس طرح وہ بھولتا ہے اسی طرح تم بھی بھولتے ہو۔‘‘

میں نے کہا کہ تمہاری بحث اگرچہ بے قاعدہ اور بے سلسلہ چل رہی ہے تاہم میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اس بات کو کس طرح جانا کہ مجھے ملک کے متعلق اس سے زیادہ علم نہیں ہے؟‘‘

راج لکشمی نے کہا……’’ہو ہی کیسے سکتا ہے؟ دنیا میں تم سے بڑھ کر خود غرض ملنا مشکل ہے۔ جو صرف

اپنے ہی آرام کے لئے بھاگتا پھرتا ہے وہ گھر کی خبر جانے گا ہی کہاں سے؟ تم جیسے لوگ ہی سماج کی بہت زیادہ برائی کرتے پھرتے ہیں جو سماج سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس کی طرف سے ہمیشہ لا پرواہ رہتے ہیں۔ تم لوگ نہ تو اچھی طرح غیر سماج کو ہی جانتے ہو اور نہ اچھی طرح اپنے سماج ہی کو۔‘‘

میں نے کہا……’’اس کے بعد؟‘‘

راج لکشمی بولی……’’اس کے بعد باہر رہ کر ظاہرہ مجلسی نظام کو دیکھ کر تم لوگ سوچ میں مرے جاتے ہو کہ ہماری عورتیں مکان میں قید رہ کر دن رات کام کیا کرتی ہیں اس لئے ان کی مانند مصیبت زدہ، ان کی طرح مظلوم، ان جیسی حقیر شاید اور کسی ملک کی عورتیں نہیں ہیں لیکن کچھ دن محض ہماری فکر چھوڑ کر دیکھو۔ اپنے آپ کو کچھ اونچا اٹھانے کی کوشش کرو۔ اگر فی الواقعہ کہیں کچھ برائی ہو گی تو وہ اسی حالت میں نظر آئے گی۔ اس سے پیشتر نہیں۔‘‘

’’اس کے بعد؟‘‘

راج لکشمی نے غصے سے کہا……’’میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو لیکن میں مذاق کی بات نہیں کر رہی۔ گھر کی مالکن سب لوگوں سے خراب کھاتی پیتی ہے۔ کبھی کبھی تو نوکروں سے برا کھانا اسے ملتا ہے۔ اکثر نوکروں سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے مگر اس تکلیف سے بے تاب ہو کر روتے مت پھرو۔ ہم لوگوں کو نوکرانی کی طرح ہی بنے رہنے دو غیر ممالک کی طرح رانی بناڈالنے کی کوشش مت کرو……میں یہی بات تم سے کہتی ہوں۔‘‘

میں نے کہا……’’اگرچہ تم علم مباحثہ کو غرق کر دینے کی تجویز کر رہی ہو مگر پھر بھی یہ تسلیم کرتا ہوں کہ باقاعدہ بحث کرنے کی راہ مجھے بھی نہیں مل رہی۔‘‘

اس نے کہا……’’اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔‘‘

میں نے جواب دیا……’’ہو بھی تو وہ طاقت مجھ میں نہیں۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔ تمہاری بات ایک طرح سے سمجھ رہا ہوں۔‘‘

راج لکشمی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی……’’ہمارے ملک میں خواہ کسی وجہ سے ہو چھوٹے بڑے اونچ نیچ سب لوگوں میں روپے کا لالچ بہت ہی بڑھ گیا ہے۔ کوئی بھی تھوڑے میں قناعت کرنا نہیں جانتا، چاہتا بھی نہیں۔ اور اس خرابی نے ہمیں کتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ مجھے ہو چکا ہے۔‘‘

’’بات سچ ہے لیکن تمہیں یہ اندازہ ہوا کس طرح؟‘‘

راج لکشمی بولی……’’روپے کی لالچ سے ہی تو میری یہ حالت ہوئی ہے لیکن زمانہ سلف میں شاید اتنا لالچ نہ تھا۔‘‘

میں نے کہا ''اس کے متعلق مجھے پوری پوری واقفیت نہیں۔''

وہ کہنے لگی...... ''اتنا لالچ کبھی نہ تھا۔ اس وقت ماں روپے کے لالچ سے اپنی بیٹی کو اس راہ پر کبھی نہ دھکیلتی اس وقت مذہب کا ڈر تھا۔ آج تو مجھے روپوؤں کی کمی نہیں ہے لیکن میری طرح ستم رسیدہ بھی اور کوئی نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ راہ کا بھکاری بھی مجھ سے زیادہ سکھی ہے۔''

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا...... ''کیا سچ مچ ہی تمہیں اتنی تکلیف ہے۔''

راج لکشمی ایک ساعت چپ رہ کر اور ایک بار آنچل سے آنکھیں اور منہ پونچھ کر بولی...... ''میری بات میرے بھگوان ہی جانتے ہیں۔''

اس کے بعد دونوں ہی گم سم ہو رہے۔ گاڑی کی رفتار کم ہو کر وہ ایک چھوٹے سے سٹیشن پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر چلنا شروع کیا میں نے کہا...... ''کیا کرنے سے تمہاری باقی ماندہ زندگی آرام سے گزر سکتی ہے بتا سکتی ہو؟''

راج لکشمی نے جواب دیا...... ''میں نے اپنا راستہ طے کر رکھا ہے میری تمام دولت اگر کسی طرح چلی جائے کچھ نہ رہے بالکل بے بس ہو جاؤں، تو......''

اب ہم پھر بالکل گم سم ہو رہے اس کی بات اتنی صاف تھی کہ ہر ایک سمجھ سکتا تھا۔ مجھے بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ کچھ دیر چپ رہ کر پوچھا...... ''یہ خیال تمہارے دل میں کب سے آیا؟''

راج لکشمی نے جواب دیا...... ''جس دن ابھیا کی بات سنی اسی دن سے۔''

میں نے کہا...... ''لیکن ان لوگوں کا سفر زندگی تو درمیان میں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ مستقبل میں کتنی تکالیف درپیش آ سکتی ہیں یہ تو تم جانتی نہیں۔''

وہ سر ہلا کر بولی...... ''نہیں، جانتی نہیں یہ سچ ہے لیکن وہ کتنی ہی مصیبتیں برداشت کریں میری طرح دکھی کبھی نہ ہوں گے۔ یہ میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں۔''

اور بھی کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے پوچھا...... ''لکشمی تمہارے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں لیکن اپنی عزت کو قربان کس طرح کروں؟''

راج لکشمی بولی...... ''میں تو تم سے کچھ قربان کرنے کو نہیں کہتی۔ عزت ہی تو انسان کا اصلی جوہر ہے۔ اسے اگر قربان نہیں کر سکتے تو قربانی اور ایثار کا نام ہی زبان پر کیوں لاتے ہو؟ میں نے آپ سے کبھی کسی قسم کی قربانی کا مطالبہ نہیں کیا لیکن کیا کر سکتا ہوں۔ عزت چلے جانے کے بعد انسان کی زندگی ایک مستقل عذاب بن جاتی ہے۔ صرف اسی ایک عزت کے علاوہ میں سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔''

راج لکشمی نے دفعتہً ہاتھ کھینچ لیا اور کہا...... ''میرے لئے تمہیں کچھ بھی قربان کرنا نہ پڑے گا

مگر تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ محض تم لوگوں کی ہی عزت ہوتی ہے۔ ہماری کوئی عزت نہیں ہے ہم لوگوں کے لئے اسے قربان کر دینا کیا اتنا آسان ہے؟ تاہم تم لوگوں کے لئے ہی سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے مٹی کے ایک ڈھیلے کی طرح اس کو پھینک دیا ہے۔

شاید تم اس کو نہیں جانتے لیکن میں جانتی ہوں۔''

میرے کچھ بولنے کی کوشش کرتے ہی اس نے روک کر کہا...... ''رہنے دو اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کو ایک مدت سے میں نے جو سمجھ رکھا تھا وہ غلط تھا۔ تم سو جاؤ اب اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کہوں گی تم بھی نہ کہنا۔''...... اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی بنچ پر جا بیٹھی۔

دوسرے دن عین وقت پر کاشی آ پہنچا اور میں پیاری کے مکان پر ہی ٹھہرا اوپر کے دو کمروں کے علاوہ تمام کا تمام مکان مختلف عمر کی بیوہ عورتوں سے بھرا تھا۔

پیاری بولی...... ''یہ سب میری کرایہ دار ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ منہ پھیر کر کچھ ہنس دی۔

میں نے کہا...... ''ہنسی کیوں؟ شاید کرایہ ادا نہیں ہوتا۔''

پیاری بولی...... ''نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ اور دینا پڑتا ہے۔''

''اس کا مطلب؟''

پیاری اس دفعہ ہنس پڑی اور بولی...... ''اس کا مطلب ہے عاقبت کی امید پر مجھ کو ہی انہیں کھانا کپڑا دے کر زندہ رکھنا زندہ رہیں گی تبھی تو دیں گی۔ اتنی معمولی بات بھی کیا سمجھ نہیں سکتے؟''

میں نے بھی ہنس کر جواب دیا...... ''سمجھتا تو نہیں لیکن اس طرح مستقبل کی امید پر کتنے لوگوں کو تمہیں چپ چاپ کھانا کپڑا بہم پہنچانا پڑتا ہوگا؟ میں صرف یہی سوچ رہا ہوں۔''

''ان کے علاوہ وہ دو ایک میری رشتہ دار بھی ہیں۔''

''وہ بھی ہیں کیا؟ لیکن تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ رشتہ دار ہیں؟''

پیاری قدرے خوش ہنسی ہنس کر بولی...... ''ان کے ساتھ آ کر اس کاشی میں ہی تو میری 'موت' ہوئی تھی شاید تمہیں یہ یاد نہیں رہا پھر اس وقت جنہوں نے میری نجات کی تھی ان لوگوں کا احسان زندگی بھر کیا بھول سکتی ہوں؟''

میں چپ ہو رہا۔ پیاری کہنے لگی...... ''ان لوگوں کا دل بڑا رحیم ہوتا ہے اسی لئے پاس رہ کر ان پر ذرا کڑی نظر رکھتی ہوں تاکہ انہیں اور زیادہ احسان کرنے کا موقعہ نہ ملے۔''

اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی یکایک میرے منہ سے نکل گیا...... ''تمہارے دل کے اندر کیا ہے؟ کئی بار اسے چیر کر دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے راج لکشمی؟''

"مرنے پر دیکھ لینا۔ اچھا کمرے میں جا کر ذرا سو جاؤ۔ کھانا تیار ہونے پر اٹھا دوں گی۔" اتنا کہہ کر اور ہاتھ کے اشارہ سے کمرہ دکھا کر وہ زینے سے نیچے اتر گئی۔

میں اسی جگہ کچھ دیر کھڑا رہا یہ بات نہیں کہ آج میں نے اس کے دل کا کوئی نیا تعارف حاصل کیا تھا لیکن خود میرے اپنے دل میں یہ عام اور معمولی کہانی ایک نئے دور کی تخلیق کر گئی۔

رات کو پیاری بولی......"میں تمہیں تکلیف دے کر فضول اتنی دور لے آئی۔ گورو دیو تیرتھ یاترا کرنے کے لئے نکل گئے ہیں۔ ان سے بھی تمہیں ملا نہ سکی۔"

میں نے کہا......"اس کے لئے مجھے کچھ بھی افسوس نہیں ہے اب تو کلکتہ لوٹنا ہوگا؟"

پیاری نے گردن ہلا کر کہاں...... "ہاں"

میں نے کہا......"کیا میرا ساتھ چلنا ضروری ہے؟ ضروری نہ ہو تو میں ذرا اور *پچھم کی طرف گھوم آنا چاہتا ہوں۔"

پیاری نے جواب دیا......"بنکو کی شادی میں تو اب بھی کچھ دنوں کی دیر ہے چلو نا میں بھی پریاگ چل کر اشنان کر آؤں۔"

میں کچھ مشکل میں پڑ گیا۔ میرے دور کے ایک چچا وہاں نوکری کرتے تھے سوچا تھا کہ ان کے پاس ہی ٹھہروں گا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی دوست احباب وہاں رہتے ہیں۔ پیاری نے فوراً میرے دل کا جذبہ بھانپ کر کہا......"میں ساتھ رہوں گی تو شاید کوئی دیکھ لے گا یہی نا؟"

بدحواس ہو کر کہا......"دراصل کلنک چیز ہی ایسی ہے کہ لوگ جھوٹے کلنک کا بھی خوف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

پیاری نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا......"یہ ٹھیک ہے گزشتہ سال آرہ میں تو تمہیں ایک طرح گود میں لئے ہی لئے میرے دن رات کٹے تھے۔ خوش قسمتی سے اس طرف کسی نے تمہیں نہ دیکھا۔ اس جگہ شاید تمہاری جان پہچان کا کوئی دوست رشتہ دار نہ تھا۔"

میں نے نہایت ہی شرمسار ہو کر کہا......"مجھ پر طعنہ زنی کرنا فضول ہے انسانیت کے لحاظ سے میں تمہاری نسبت بہت ہی حقیر ہوں اور اس بات کو میں نامنظور نہیں کرتا۔"

پیاری تیز لہجہ میں بول اٹھی......"طعن، تمہیں طعنہ زنی کر سکوں یہی سوچ کر شاید میں وہاں گئی تھی کیوں؟ غور کرو جفا کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے تجاوز نہ کرنا۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر بولی......"بجا، کلنک ہی تو ہے لیکن تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو اس کلنک کو سر آنکھوں پر لے کر لوگوں کو بلا بلا کر دکھاتی پھرتی لیکن ایسی بات کبھی زبان پر نہ لاتی۔"

میں نے کہا......"تم نے میری زندگی ضرور بچائی ہے لیکن میں نہایت ہی حقیر انسان ہوں۔ راج لکشمی تمہارے ساتھ میرا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔"

راج لکشمی مضطرب لہجہ میں بولی......"زندگی بچائی ہے تو اپنی ہی غرض سے بچائی ہے۔ تمہاری غرض سے نہیں۔ اس کے لئے تمہیں ذرا سا بھی ممنون ہونے کی ضرورت نہیں لیکن میں تمہیں حقیر طبیعت کا انسان خیال نہیں کر سکتی۔ ایسا ہوتا تو آفت کٹتی۔ گلے میں پھانسی لگا کر جھگڑا ختم کر دیتی۔" اتنا کہہ کر وہ میرے جواب کی راہ دیکھے بغیر ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔

دوسرے دن صبح راج لکشمی چائے دے کر چپ چاپ چلی جا رہی تھی کہ میں نے بلا کر کہا......"گفتگو بند ہے کیا؟"

وہ پلٹ کر کھڑی ہو گئی بولی......"نہیں تو، کچھ کہو گے؟"

میں نے کہا......"چلو ایک بار پریاگ گھوم آئیں؟"

"ٹھیک تو ہے جایئے۔"

"تم بھی چلو۔"

"تمہارا اصرار ہے؟"

"نہیں چاہتیں؟"

"ضرورت ہوگی تو خود مانگ لوں گی۔" اس وقت نہیں اتنا کہہ کر وہ اپنے کام سے چلی گئی۔

میرے منہ سے صرف ایک طویل آہ نکلی......لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت میں نے ہنس کر کہا......"اچھا لکشمی مجھ سے بول چال بند کر کے کیا تم سے رہا جائے گا جو اس ناممکن کو ممکن کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟"

راج لکشمی نے مطمئن اور سنجیدہ لہجہ میں کہا......"سامنا ہونے پر کسی سے نہیں رہا جاتا۔ مجھ سے بھی نہیں رہا جائے گا اس کے علاوہ میری یہ خواہش بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا خواہش ہے؟"

راج لکشمی بولی......"میں کل سے ہی سوچ رہی ہوں اس کھینچا تانی کو ختم کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تم نے بھی ایک طرح سے صاف صاف واضح کر دیا ہے اور میں بھی ایک طرح سے سمجھ گئی ہوں غلطی میری ہی ہے میں اس کو تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن۔"

اچانک اسے رکتے دیکھ کر میں نے پوچھا......"لیکن، کیا؟"

راج لکشمی بولی......"لیکن کچھ بھی نہیں۔ میں جو ایک بے شرم سائل کی طرح التجا کرتی ہوئی

تمہارے پیچھے پیچھے گھومتی پھرتی ہوں ......" اتنا کہہ کر اس نے یکا یک اپنے چہرے کو نفرت سے سکوڑ لیا اور کہا...... "لڑکا کیا سوچتا ہوگا۔ نوکر چاکر دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ رام رام، گویا میں نے اس کو مذاق کا مضمون بنا ڈالا ہو۔"

کچھ دیر ٹھہر کر وہ کہنے لگی ...... "بڑھاپے میں یہ سب کیا مجھے اچھا لگتا ہے؟ تم الٰہ آباد جانا چاہتے ہو۔ شوق سے جاؤ۔ پھر بھی اگر ممکن ہو تو بر ما روانہ ہونے سے پہلے ایک دفعہ ملاقات کر جانا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

ساتھ ہی ساتھ میری بھوک بھی غائب ہوگئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر آج پہلے ہی پہل مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب دلجوئی کا معاملہ نہیں ہے سچ مچ اس نے کچھ نہ کچھ سوچ کر فیصلہ کر رکھا ہے۔ شام کے وقت آج ایک ہندوستانی خادمہ ناشتہ وغیرہ کا سامان لے کر آئی تو اس سے کچھ تعجب کے ساتھ پیاری کا حال دریافت کیا۔ جواب سن کر میں نے اور بھی زیادہ حیرت کے ساتھ جانا کہ پیاری گھر پر نہیں ہے۔ وہ ساز سنگھار کر کے فٹن پر گئی ہے۔ فٹن کہاں سے آئی۔ اسے ساز سنگھار کر کے جانے کی کیا ضرورت پڑی۔ کچھ بھی نہ سمجھا تو خود اس کی وہ بات یاد آ گئی کہ وہ کاشی میں ہی ایک دن مری تھی۔

یہ سچ ہے کہ کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اس خبر سے دل پھیکا سا ہو گیا۔

شام ہوئی گھر گھر میں دیئے جلے لیکن راج لکشمی نہ لوٹی۔

کندھے پر چادر ڈال کر ذرا گھوم آنے کے لئے باہر نکل پڑا۔ راستے راستے چکر کاٹتا ہوا بہت کچھ دیکھتا سنتا رات کے دس بجے کے بعد مکان پر لوٹا تو سنا کہ پیاری ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی۔ معاملہ کیا ہے؟ کچھ خوف سا معلوم ہونے لگا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ رتن کو بلا کر پریشانی دور کرنے کے لئے کچھ پوچھوں یا نہ پوچھوں کہ ایک بھاری جوڑی کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ کھڑکی میں سے جھانکا تو دیکھتا ہوں ایک بڑی بھاری فٹن مکان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی ہے۔

پیاری اتر کر آئی۔ چاند کی روشنی میں اس کے جسم کے جڑاؤ زیور جھملا اٹھے جو دو شریف آدمی فٹن میں بیٹھے تھے دھیمی آواز سے معلوم ہوا کہ پیاری کو مخاطب کر کے کچھ کہہ رہے تھے جس کو میں سن نہ سکا۔ وہ بنگالی ہیں یا بہاری یہ بھی جان نہ سکا۔ چابک کھا کر گھوڑے چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

راج لکشمی میری خبر لینے کے لئے اسی ساز سنگھار کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اچھل کر اس کی طرف داہنا ہاتھ پسار کر ڈرامائی لہجہ میں بولا ...... "اری دھوکہ باز روہنی! تو گووندلال کو نہیں پہچانتی۔ آہا آج اگر میرے پاس ایک پستول ہوتا یا ایک تلوار ہوتی۔"

راج لکشمی خشک لہجہ میں بولی ...... "تو کیا کرتے؟ ...... خون؟"

ہنس کر بولا ...... "نہیں پیاری مجھے اتنا بڑا نوابی شوق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بیسویں صدی میں ایسا سنگدل راکشش کون ہے جو دنیا کی اتنی بڑی مسرت کی دکان کو پتھر سے بند کر دے؟ بلکہ دعا دیتا ہوں کہ کل کے رتن، تم طویل العمر ہو۔ تمہارا حسین وجمیل چہرہ فاتح عالم ہو۔ تمہارا لب ولہجہ کوئل کو شرمائے۔ تمہارے ان قدموں کا رقص روشنی وغیرہ کا غرور مٹی میں ملا دے ...... اور میں دور کھڑا کھڑا تمہاری فتح کے نعروں سے آسمان کو گونجا دوں۔"

پیاری بولی ...... "ان سب باتوں کا مطلب؟"

میں نے کہا ...... "من آنمن کہ من دانم۔ اسے جانے دو۔ میں اسی ایک بجے کی گاڑی سے رخصت ہوتا ہوں۔ ابھی تو الٰہ آباد جاؤں گا بعد از جاؤں گا بنگالیوں کے تیرتھ چاکرستان یعنی برما کو۔ اگر وقت اور مہلت ملی تو مل کر جاؤں گا۔"

"میں کہاں گئی تھی یہ سننا بھی ضروری نہیں سمجھتے؟"

"نہیں بالکل نہیں"

"یہ بہانا پا کر کیا تم ایک دم چلے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا ...... "اس گنہگار منہ سے اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتا اس گورکھ دھندے سے اگر پار ہو سکوں تو ......"

پیاری کچھ دیر چپ چاپ کھڑی رہی اور بولی ...... "تم کیا مجھ پر جو جی چاہے وہی ظلم کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا ...... "جو جی چاہے؟ بالکل نہیں بلکہ نادانستہ بھی اگر کبھی کچھ ظلم کیا گیا ہو تو اس کے

لئے معافی چاہتا ہوں۔"

اس کا مطلب، آج رات کو ہی تم چلے جاؤ گے؟"

"ہاں"

"کیا بلا قصور ہی مجھے سزا دینے کا تمہیں حق حاصل ہے؟"

"نہیں رتی بھر بھی نہیں لیکن میرے جانے کو ہی تم سزا دینا سمجھتی ہو تو وہ حق مجھے ضرور حاصل ہے۔"

پیاری نے فوراً کوئی جواب نہ دیا میرے منہ کی طرف چند لمحے چپ چاپ دیکھتے رہ کر کہا......

"میں کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی؟ نہیں سنو گے؟"

"نہیں میری رائے لے کر تو تم وہاں گئی نہیں تھیں جو واپس آ کر اس کا حال سناؤ گی۔ اس کے علاوہ ان باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ خواہش۔"

پیاری زخم خوردہ ناگن کی طرح یکا یک پھنکار اٹھی...... "میری بھی سنانے کی خواہش نہیں ہے۔ میں کسی کی زر خرید لونڈی نہیں ہوں کہ کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں۔ اس کی اجازت لیتی پھروں۔ جاتے ہو جاؤ۔" یوں کہہ کر اپنے حسن اور غمزوں کا ایک طوفان اٹھا کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر ہو گئی۔

نوکر گاڑی بلانے گیا۔ کوئی گھنٹہ بعد صدر دروازے پر ایک گاڑی کے کھڑے ہونے کی آواز سن کر بیگ ہاتھ میں لے کر جا ہی رہا تھا کہ پیاری آ کر پیچھے کھڑی ہو گئی بولی...... "اسے کیا تم بچوں کا کھیل ہی سمجھتے ہو؟ اکیلی چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو نوکر چاکر کیا خیال کریں گے۔ تم کیا ان لوگوں کے سامنے بھی مجھے منہ دکھانے کے قابل نہ رہنے دو گے؟"

مڑ کر کھڑے ہو کر کہا...... "اپنے نوکروں کے ساتھ خود نبٹتی رہنا۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"نہ ہو نہ سہی لیکن لوٹ کر میں بنکو کو ہی کیا جواب دوں گی؟"

"یہی جواب دے دینا کہ وہ پچھم کی طرف گھومنے چلے گئے ہیں۔"

"اس پر کیا کوئی اعتبار کرے گا؟"

"جس پر اعتبار کیا جا سکے ایسی ہی کوئی بات بنا کر کہہ دینا۔"

پیاری دم بھر خاموش رہ کر بولی...... "اگر کوئی بے انصافی ہی کر بیٹھی ہوں تو کیا وہ معاف نہیں ہو سکتی۔ تم معاف نہ کرو گے تو اور کون کرے گا؟"

میں بولا...... "پیاری یہ تو ایک زر خرید لونڈی کی سی بات ہوئی۔ تمہاری زبان سے تو یہ زیب نہیں دیتی۔"

اس طنز کا پیاری یکا یک کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو اٹھا۔ چپ چاپ کھڑی

رہی۔ یہ صاف معلوم ہو گیا کہ وہ انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھال رہی ہے۔ باہر سے گاڑی بان نے چلا کر تاخیر کی وجہ پوچھی میرے چپ چاپ بیگ ہاتھ میں لیتے ہی پیاری دھم سے میرے پاؤں کے قریب بیٹھ گئی اور بھاری لہجہ میں بولی...... "میں سچ مچ کا قصور کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی اگر تم سزا دینا چاہتے ہو تو اپنے ہاتھ سے دو لیکن گھر بھر کے لوگوں کے سامنے میرا سر نیچا نہ کرو۔ اگر آج تم اس طرح چلے جاؤ گے تو میں اب کسی کے سامنے اپنا سر اونچا کر کے کھڑی نہ ہو سکوں گی۔"

ہاتھ کا بیگ نیچے رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا...... "اچھا آج ہمارے تمہارے درمیان آخری فیصلہ ہو جائے۔ تمہارا آج کا سلوک میں نے معاف کر دیا۔ لیکن میں نے خوب سوچ کر دیکھ لیا ہے کہ ہم دونوں کا ملنا جلنا اب ممکن نہیں۔"

پیاری نے اپنا افسردہ چہرہ میرے منہ کی طرف اٹھا کر ڈرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں؟"

میں نے کہا...... "تلخ حقیقت کو برداشت کر سکو گی؟"

لیکن کسی انسان کی روحانی آزار برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتے دیکھ کر آزار پہنچانے کا کام نہیں ہو جاتا۔ مجھے بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھ کر سوچنا پڑا پھر بھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج کسی بھی طرح اپنا ارادہ نہیں بدلوں گا اور اسی لئے بالآخر میں نے آہستہ سے کہا...... "لکشمی تمہارا آج کا برتاؤ معاف کرنا خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو میں نے معاف کر دیا۔ لیکن تم خود اس لالچ کو کسی طرح بھی چھوڑ نہ سکو گی۔ تمہارے پاس بہت سا دھن دولت ہے۔ بہت زیادہ حسن اور اعلیٰ پایہ کا فن ہے۔ کافی لوگوں پر تمہارا اثر اور رسوخ ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر لالچ کی شے اور کیا ہو سکتی ہے؟ تم مجھے پیار کر سکتی ہو۔ مجھ سے عقیدت بھی کر سکتی ہو۔ میرے لئے کئی تکالیف بھی برداشت کر سکتی ہو لیکن اس لالچ کو کسی طرح بھی کاٹ نہیں سکو گی؟"

راج لکشمی نے شیریں گلے سے کہا...... "یعنی اس طرح کا سلوک میں درمیان میں گاہے بگاہے کیا کروں گی۔"

جواب میں میں صرف خاموش رہا۔ وہ خود بھی کچھ دیر چپ رہ کر بولی...... "اس کے بعد؟"

"اس کے بعد تاش کے مکان کی طرح ایک دن سب گر جائے گا۔ اس دن کی بربادی سے تو یہ بہتر ہے کہ آج ہی مجھے ہمیشہ کے لئے رہائی دے دو۔ میری یہی التجا ہے۔"

پیاری بہت دیر تک منہ نیچا کئے چپ چاپ بیٹھی رہی اس کے بعد جب اس نے منہ اٹھایا تو دیکھا اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ اسے آنچل سے پونچھ کر پوچھا۔

"کیا میں نے کبھی تمہیں حقیر کام کرنے کے لئے مجبور کیا ہے؟"

بہتے ہوئے ان آنسوؤں نے میرے ضبط پر ایک کاری چوٹ کی۔ لیکن میں نے اس کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ اطمینان سے مستحکم لہجہ میں کہا...... نہیں کسی دن نہیں۔ تم خود حقیر نہیں ہو کوئی حقیر کام خود بھی نہیں کر سکتیں اور دوسرے کو بھی کرنے نہیں دے سکتیں۔''

پھر کچھ ٹھہر کر کہا...... ''مگر دنیا تو منا پنڈت کی پاٹھ شالا کی اس راج لکشمی کو پہچانے گی نہیں۔ وہ تو پہچانے گی صرف پٹنے کی مشہور و معروف پیاری بائی کو۔ اس وقت دنیا کی نظروں میں کتنا چھوٹا اور حقیر ہو جاؤں گا کیا تم اس کا تصور کر سکتی ہو؟ بتاؤ تم اس کو کس طرح روکو گی؟''

راج لکشمی نے ایک طویل آہ بھر کر کہا...... ''لیکن اسے تو فی الحقیقت چھوٹا ہونا نہیں کہتے۔''

میں نے کہا...... ''بھگوان کی نظر میں نہ ہو لیکن دنیا کی نظروں کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لکشمی۔''

راج لکشمی نے کہا...... ''ایک طرح سے تو یہ بات سچ ہے لیکن ان کی نظر تو ہمیشہ نظر نہیں آتی اور پھر جو نظر دنیا میں دس انسانوں کے اندر سے دیکھتی ہے وہ بھی تو بھگوان کی نظر ہے۔''

''راج لکشمی اس بات سے انکار کرنا بھی تو ظلم ہے۔''

''اسی ڈر سے تم مجھے زندگی بھر کے لئے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟''

میں نے کہا...... ''پھر ملوں گا تم کہیں بھی کیوں نہ ہو۔ برما جانے سے پیشتر میں ایک دفعہ اور بھی تم سے مل جاؤں گا۔''

راج لکشمی تیزی کے ساتھ سر ہلا کر گریہ آمیز لہجہ میں کہہ اٹھی ...... ''جاتے ہو تو جاؤ لیکن مجھے خواہ کچھ بھی کیوں نہ سمجھو مجھ سے بڑھ کر تمہارا اپنا کوئی نہیں ہے۔ مجھ کو چھوڑ کر چلے جانا دس آدمیوں کی نگاہوں میں دھرم ہے اس بات کو میں کسی بھی حالت میں تسلیم نہ کروں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرہ چھوڑ کر چلی گئی۔

گھڑی نکال کر دیکھا اب بھی وقت تھا۔ اب بھی شاید ایک بجے کی گاڑی مل جائے چپ چاپ بیگ اٹھا کر آہستہ سے اتر کر میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ لالچ کے انعام سے گاڑی نے پوری رفتار کے ساتھ دوڑ کر اسٹیشن پہنچا دیا۔ لیکن اسی لمحہ گاری نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آدھ گھنٹہ بعد ہی ایک ٹرین کلکتے کی طرف جائے گی۔ سوچا چلو یہی اچھا ہے۔ بہت دنوں سے گاؤں کی شکل نہیں دیکھی...... اس سنسان جنگل میں ہی جا کر باقی کے کچھ دن کاٹ دوں۔

اس لئے مغرب کی بجائے مشرق کا ٹکٹ خرید کر آدھ گھنٹے بعد ایک مخالف سمت کو جانے والی دھوئیں کی گاری میں بیٹھ کر کاشی سے چل دیا۔

❁......❁

بہت دنوں بعد پھر ایک دن شام کے وقت گاؤں میں داخل ہوا میرا مکان اس وقت حقیقی رشتہ داروں اور ان کے رشتہ داروں سے بھرا تھا۔ بڑے مزے سے تمام گھر کو گھیرا کر انہوں نے اپنی گھر گرہستی پھیلا رکھی تھی۔ کہیں سوئی رکھنے کے لئے بھی جگہ نہ تھی۔

میرے یکایک آ جانے سے اور وہاں کچھ دن قیام کرنے کے ارادے کو سن کر خوشی کے مارے ان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا کہنے لگے...... آہا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس بار شادی کر کے دنیا دار بن جاؤ شری کانت! ہم لوگ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔''

میں نے کہا...... ''اسی لئے تو آیا ہوں۔ اس وقت کم از کم میری ماں کا کمرہ خالی کر دو میں اپنے پاؤں پسار کر ذرا لیٹ رہوں۔''

میرے پتا کی موسیری بہن کچھ دنوں سے اپنے شوہر اور اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں رہ رہی تھی آ کر بولی...... ''ٹھیک تو کہتے ہو۔''

میں نے کہا...... ''اچھا اچھا نہ ہو تو میں باہر کے کمرے میں ہی پڑ رہوں گا۔''

جا کر دیکھا ایک کونے میں سرخی اور ایک کونے میں چونے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس کے بھی مالک بولے...... ''ٹھیک تو ہے دیکھتا ہوں کہ یہ سب چیزیں تو ذرا دیکھ سن کر ہٹانی پڑیں گی لیکن کمرہ تو چھوٹا نہیں ہے۔ تب تک نہ ہو تو اس کنارے ایک تخت پوش بچھا کر...... کیا کہتے ہو شری کانت!''

میں نے کہا...... ''اچھا، رات بھر کے لئے نہ ہو تو یہی سہی۔''

در حقیقت میں اتنا تھک گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جہاں بھی ہو ذرا سی جگہ سونے کے لئے مل جائے تو جان میں جان آ جائے۔ برما کی اس بیماری کے بعد اب تک جسم مکمل طور پر صحت یاب اور طاقتور نہیں ہو سکا تھا۔ اندر ہی اندر ایک طرح کی کمزوری محسوس ہوتی تھی اس لئے شام کے بعد جب سر درد کرنے لگا تو کوئی خاص تعجب نہ ہوا۔

نئی بنی ہوئی بہن نے آ کر کہا...... ''ارے یہ تو ذرا گرمی سی چڑھ گئی ہے۔ بھات کھا کر سونے سے ہی چلی جائے گی۔''

یہی ہوگا۔ وہی ہوا۔ بزرگوں کا حکم مان کر گرمی دور کرنے کے لئے بھات کھا کر لیٹ گیا لیکن صبح نیند ٹوٹی خوب اچھی طرح بخار لئے ہوئے۔

دیدی نے جسم پر ہاتھ رکھ کر کہا...... ''کچھ نہیں یہ تو ملیریا ہے اس بخار میں کھانا کھایا جاسکتا ہے۔''

اب ہاں میں ہاں نہ ملا سکا بولا...... ''نہیں جیجی میں اب تک تمہارے ملیریا راجا کی رعایا نہیں بنا ہوں۔ ان کی دوہائی دے کر ظلم کیا جانا شاید میں برداشت نہ کر سکوں۔ آج میرا افاقہ ہے۔ تمام رات گزری، دوسرا دن گزرا اس کے بعد دن بھی کٹ گیا۔ لیکن بخار نے پیچھا نہ چھوڑا بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ بڑھتے دیکھ کر دل میں پریشان ہو اٹھا۔ گووند ڈاکٹر دونوں وقت دیکھنے آئے نبض پکڑ کر زبان دیکھ کر پیٹ ٹٹول کر خوش ذائقہ دوائیاں تجویز کر کے صرف لاگت کے دام لینے لگے لیکن ایک ایک دن کر کے پورا ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ میرے پتا کے ماما...... میرے بابا آ کر بولے...... ''اسی لئے تو بھیا میں کہتا ہوں کہ وہاں خبر بھیج دو۔ تمہاری بوا کو آ جانے دو۔ بخار تو گویا......''

بات پوری نہ ہونے پر بھی میں سمجھ گیا کہ بابا کچھ مشکل میں پڑ گئے ہیں اسی طرح اور بھی چار پانچ دن گزر گئے لیکن بخار کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس دن صبح گووند ڈاکٹر نے آ کر حسب معمول دوائی دے کر تین دن کے بقایا ''لاگت کے دام، مانگے بستر میں لیٹے لیٹے کسی طرح ہاتھ بڑھا کر اپنا بیگ کھولا دیکھا تو منی بیگ غائب ہے۔ نہایت ہی متفکر ہو کر میں اٹھ بیٹھا۔ بیگ الٹا کر ہر ایک شے الگ الگ کر کے تلاش کی۔ لیکن جو نہیں تھا وہ نہ ملا۔''

گووند ڈاکٹر معاملہ تاڑ کر اور فکرمند ہو کر بار بار سوال کرنے لگے...... ''کچھ کھو گیا ہے کیا؟''

میں نے کہا...... ''نہیں کچھ بھی نہیں گیا۔''

لیکن جب ان کی دوائی کی قیمت میں ادا نہ کر سکا تو وہ سمجھ گئے حیران ہو کر کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا...... ''تھے کتنے؟''

''کچھ تھوڑے سے''

''چابی کو ذرا احتیاط سے رکھنا چاہئے بھیا! خیر کوئی مضائقہ نہیں تم غیر نہیں ہو۔ فکر نہ کرنا۔ اچھے ہو جاؤ گے اس کے بعد جب سہولت ہو بھیج دینا۔ علاج میں کوئی کمی نہ ہوگی۔'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر غیر ہوتے ہوئے بھی یگانوں سے بڑھ کر تشفی دے کر چلے گئے ان سے کہہ دیا کہ...... ''یہ بات کوئی سن نہ پائے۔''

ڈاکٹر صاحب بولے...... ''اچھا اچھا دیکھا جائے گا۔''

دیہات میں یقین پر روپے قرض دینے کا رواج نہیں ہے۔ روپیہ ہی کیوں ایک چونی بھی خالی ہاتھ قرض مانگ لینے پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آدمی خالص مذاق کر رہا ہے کیونکہ اس بات کا دیہاتی لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دنیا میں اتنا کم عقل بھی کوئی ہے جو خالی ہاتھ قرض طلب کرتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ کوشش ہی نہ کی۔ پہلے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس کی اطلاع راج لکشمی کو نہیں دوں گا۔ ذرا تندرست ہو جاؤں تو جو ہو سکے گا کروں گا۔ دل میں یہی ارادہ تھا کہ بھیا کو خط لکھ کر روپے منگوالوں گا لیکن اس کے لئے موقعہ نہ ملا۔ اچانک علاج معالجہ اور تیمار داری کا سر بھی دھیما پڑتے ہی میں سمجھ گیا کہ میری مصیبت کی بات گھر میں پوشیدہ نہیں رہی۔

حالات کا ایک مختصر ساذکر کر کے راج لکشمی کو خط تو ضرور لکھا لیکن اس سے میں اپنے آپ کو حقیر و ذلیل ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا اور اسے بھیج نہ سکا۔ پھاڑ کر پھینک دیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا لیکن اس کے بعد کے دن نے کسی طرح بھی کٹنا نہ چاہا۔ اس دن کسی طرف سے کوئی راستہ نہ دیکھ کر بالآخر جان پر کھیل کر ہی کچھ روپوؤں کے لیے راج لکشمی کو خط لکھ کر پٹنہ اور کلکتہ کے پتوں پر بھیج دیا۔

وہ روپے بھیجے گی۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا تاہم اس دن صبح سے ہی ایک قسم کے تشویش آمیز شبے سے ڈاکیے کی آمد کے انتظار میں سامنے کی کھلی کھڑکی کی راہ اور پر نظر جمائے خود پڑا رہا۔

وقت نکل گیا۔ آج اب اس کی امید نہ رہی۔ یہ سوچ کر کروٹ بدلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس وقت دور ایک گاڑی کی آواز سے حیران ہو کر تکیے پر بار ڈال کر اٹھ بیٹھا۔ گاڑی آ کر عین سامنے ہی کھڑی ہو گئی دیکھتا ہوں کہ جوان کی بغل میں رتن بیٹھا ہے۔ اس کے نیچے اتر کر گاڑی کے دروازہ کھولتے ہی جو نظر آیا اس کو سچ سمجھ کر یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

دن کے وقت بہ نفس نفیس گاؤں کے راستہ پر راج لکشمی آ کر کھڑی ہو سکتی ہے۔ یہ میرے تصور سے بھی بعید تر تھا۔

راج لکشمی نے ایک بار صرف میرے منہ کی طرف دیکھا۔ گاڑی بان بولا...... ''ماں! کیا گھوڑا کھول دوں؟ دیر لگے گی؟''

''ذرا ٹھہرو'' کہہ کر وہ آہستہ آہستہ میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ پرنام کر کے، قدموں کی خاک پیشانی پر لگا کر اور ہاتھ سے پیشانی اور سینے کا بخار دیکھ کر کہا...... ''اس وقت تو اب بخار نہیں ہے۔ شام سات بجے کی گاڑی سے جانا ہو سکے گا؟ گھوڑے کھول دینے کو کہہ دوں؟''

میں دم بخود اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا بولا ...... ''دو دن سے بخار آنا تو بند ہے لیکن کیا مجھے آج ہی لے جانا چاہتی ہو؟''

راج لکشمی بولی ...... ''نہ ہو تو آج رہنے دو۔ رات چلنے کی ضرورت نہیں۔ سردی لگ سکتی ہے۔ کل صبح ہی چلیں گے۔''

اتنی دیر میں گویا ہوش میں آ گیا بولا ...... ''اس گاؤں میں اس محلے کے درمیان تم آئیں کس حوصلہ پر؟ کیا تم یہ سوچتی ہو کہ یہاں تمہیں کوئی بھی پہچان نہ سکے گا؟''

راج لکشمی نے بلاتردد کہا ...... ''پہچان لیں یہیں تو میں پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی اور یہیں لوگ مجھے پہچان نہ سکیں گے؟ جو دیکھے گا وہی پہچان لے گا۔''

''تو''

''کیا کروں بتاؤ؟ میری تقدیر ورنہ تم یہاں آ کر بیمار کیوں پڑتے۔''

''آئیں کیوں؟ روپے منگائے تھے۔ روپے بھیج دینے سے ہی کام چل جاتا۔''

''یہ کیا کبھی ممکن ہے؟ ایسی بیماری کی خبر سن کر کیا صرف روپے بھیج کر ہی خاموش رہ سکتی ہوں؟''

میں نے کہا ...... ''تمہیں تو شاید اطمینان نصیب ہو گیا لیکن مجھے تو پریشان کر دیا۔ ابھی جب سب لوگ یہاں آئیں گے تو تم اپنا منہ کس طرح دکھاؤ گی اور میں ہی کیا جواب دوں گا؟''

راج لکشمی نے جواب میں صرف ایک بار اور اپنی پیشانی کو چھو کر کہا ...... ''جواب اور کیا دو گے؟ میری تقدیر!''

اس کی لاپرواہی اور بے فکری سے متاثر ہو کر بولا ...... ''تقدیر تو ٹھیک ہے لیکن لاج اور شرم کیا ایک بار ہی چاٹ گئی ہو؟ یہاں منہ دکھاتے بھی تمہیں ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔''

راج لکشمی نے ویسے ہی اداس لہجہ میں جواب دیا ...... ''میری لاج شرم جو کچھ ہے وہ اس وقت صرف تم ہی ہو۔''

اس کے بعد اب میں اور کہوں ہی کیا ...... سنوں بھی کیا۔ آنکھیں موند کر چپ چاپ لیٹ رہا۔

کچھ دیر بعد پوچھا ...... ''بنکو کی شادی بخیریت ہو گئی؟''

راج لکشمی بولی ...... ''ہاں''

''اب کہاں سے آ رہی ہو؟ کلکتے سے؟''

''نہیں پٹنہ سے۔ وہیں تمہارا خط ملا تھا۔''

''مجھے کہاں لے جاؤ گی ...... پٹنے؟''

راج لکشمی نے کچھ سوچ کر کہا ...... ''ایک بار تو وہاں تمہیں جانا ہی پڑے گا پہلے کلکتے چلے چلیں ...... وہاں تمہیں دکھا لوں اس کے بعد تندرست ہونے پر ......''

راج لکشمی بولی ...... ''وصیت کی تو وہیں رجسٹری کرانی پڑے گی لکھا پڑھی ایک طرح سے سب مکمل کر آئی ہوں۔ لیکن تمہارے حکم کے بغیر تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا؟''

نہایت حیرت کے ساتھ پوچھا ''کس بات کی وصیت؟ کس کے نام؟''

راج لکشمی بولی ...... ''مکان تو دونوں بنکو کو دیئے ہیں۔ صرف کاشی کا مکان گرو دیو کو دینے کا ارادہ ہے اور کمپنی کے کاغذات، زیورات وغیرہ کا حصہ بخرا ابھی اپنی عقل کے مطابق کر آئی ہوں۔ اب صرف تمہارے حکم کی ......''

میری حیرت کی حد نہ رہی بولا ...... ''اس حالت میں تمہارا خود کا کیا رہا؟ بنکو اگر تمہارا بار اٹھانا نہ چاہے؟ اب اس کی اپنی خانہ داری ہو گئی ہے اس لئے آخر کار وہ بھی تمہیں کھانے کو نہ دے تو؟''

''کیا میں یہ چاہتی ہوں؟ ...... اپنا سب کچھ دے کر کیا اس کے ہاتھ کا دیا کھاؤں گی؟ تم بھی خوب ہو؟''

اب اور صبر نہ رہا اٹھ کر اور خفا ہو کر بولا ...... ''ہریشچندر کی طرح یہ بری صلاح تمہیں کس نے دی؟ روؤ گی کیا؟ بڑھاپے میں کس کے گلے کا ہار بننے جاؤ گی؟''

راج لکشمی بولی ...... ''تمہیں خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم لیٹ جاؤ جس نے مجھے یہ عقل دی ہے وہی مجھے کھانے کو دے گا۔ میں ہزار بوڑھی ہو جاؤں گی وہ مجھے کبھی بوجھ نہ سمجھے گا۔ تم فضول سردردی مت کرو ...... آرام سے لیٹے رہو۔''

میں آرام سے لیٹ رہا۔ مقابل کی کھلی کھڑکی سے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے رنگین آسمان عجیب و غریب سا نظر آیا کسی محو خواب کی طرح اسی کی طرف دیکھتے دیکھتے ایسا محسوس ہوا گویا ایک بے مثال حسن اور کیف کے چشمہ میں تمام دنیا بہی جا رہی ہے۔ تمام دنیا کے رنج والام دکھ درد، بغض اور حسد اب مٹ چکے ہیں۔

اس خاموشی میں محو دونوں نے کتنا وقت گزار دیا سمجھتا ہوں کہ اس کا کسی نے حساب نہیں رکھا۔ دفعتہ دروازے کے باہر انسانی لب و لہجہ سن کر ہم دونوں بھی چونک پڑے اور راج لکشمی کے کھاٹ سے اٹھنے کے پہلے

ہی ڈاکٹر صاحب مسرور بابا کے ساتھ اندر داخل ہوئے لیکن اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ رک کر کھڑے ہو گئے۔ بابا دوپہر کے وقت جب دن کی نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس وقت یہ خبر ان کے کانوں میں ضرور پڑی تھی کہ کوئی عزیز کلکتے سے گاڑی لے کر میرے پاس آیا ہے لیکن وہ کوئی عورت ہو سکتی ہے یہ شاید کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے شاید ابھی تک گھر کی مستورات بھی باہر نہیں آئی تھیں۔

بابا جی نہایت تیز فہم تھے۔ انہوں کے کچھ دیر راج لکشمی کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا...... "یہ لڑکی کون ہے شری کانت! کچھ پہچانی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بھی ان کی تائید میں کہہ اٹھے...... چھوٹے کاکا، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہیں کہیں دیکھا ہے۔"...... میں نے ترچھی نظر سے دیکھا۔ راج لکشمی کا تمام چہرہ مردے کی مانند فق ہو گیا۔ اسی لمحہ کوئی میرے دل کے اندر سے بول اٹھا شری کانت! اس مجسم ایثار عورت نے محض تمہارے لئے ہی یہ رضا و رغبت یہ مصیبت اپنے سر پر اٹھا رکھی ہے۔ یکبارگی میرے تمام جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے دل ہی دل میں کہا مجھے سچائی سے غرض نہیں میں آج حق و باطل کی تمیز بالائے طاق رکھ کر اسے سر آنکھوں پر لوں گا ور دوسرے ہی لمحہ اس کے ہاتھوں کو ذرا دبا کر کہہ بیٹھا...... "تم اپنے شوہر کی خدمت کرنے آئی ہو تمہیں شرم کس بات کی ہے۔ راج لکشمی! یہ بابا اور ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کو پرنام کرو۔" چشم زدن میں دونوں آنکھیں چار ہوئیں اس کے بعد اس نے اٹھ کر زمین پر سر ٹیک کر دونوں کو پرنام کیا۔

❁......❁